مشرقی پاکستان....!
اچھا کیا جو فراموش کردیا!

دسمبر 2014ء

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

نورِ مبین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اور اگر اللہ لوگوں کی برائی میں جلدی کرتا جس طرح وہ طلب خیر میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی (عمر کی) میعاد پوری ہو چکی ہوتی۔ سو جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں انہیں ہم چھوڑے رکھتے ہیں کہ اپنی سرکشی میں بہکتے رہیں (۱۱) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا اور بیٹھا اور کھڑا (ہر حال میں) ہمیں پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس تکلیف کو اُس سے دور کر دیتے ہیں تو (بے لحاظ ہو جاتا اور) اس طرح گزر جاتا ہے کہ گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہ تھا۔ اسی طرح حد سے نکل جانے والوں کو اُن کے اعمال آراستہ کر کے دکھائے گئے ہیں (۱۲)

(سورۃ یونس)

جلد: 44 | دسمبر 2014ء | شمارہ: 04

بانی
عنایت اللہؒ
شاہد بن عنایت اللہ

مدیر اعلیٰ: صالحہ شاہد
مدیر: عارف محمود
منتظم: سعد شاہد

قانونی مشیر
وقاص شاہد ایڈووکیٹ

شعبہ تعلقات عامہ
میاں محمد ابراہیم طاہر

سرکولیشن منیجر: فضل رزاق، عرفان جاوید
شعبہ اشتہارات: خرم اقبال، محمد اشفاق مومن

کمپوزنگ
پرائم کمپیوٹرز - لاہور

مجلس مشاورت
ابدال بیلا
عظمت فاروق
میم الف
ڈاکٹر شبیر حسین
ڈاکٹر نصیر اے شیخ
ڈاکٹر نغمہ علی
ڈاکٹر رانا محمد اقبال

قیمت -/80 روپے

مدیر: عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461
سرکولیشن منیجر: فضل رزاق 0343-4300564
عرفان جاوید 0322-4847677

ہیڈ آفس
26- پٹیالہ گراؤنڈ لنگ میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجیے:
monthlyhikayat44@gmail.com
primecomputer.biz@gmail.com

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

اس شمارے میں

اس شمارے میں

Scanned By BooksPK

www.booksPK.net

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

WWW.PAKSOCIETY.COM

عدم استحکام کو استحکام کون دے گا؟

سال 2014ء بھی پاکستانی حکومت، اپوزیشن اور عوام کے ہاتھوں سے ریت کی طرح نکل گیا۔ کہنے کو ایک سال میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں مگر ان بارہ مہینوں میں ہر سال کی طرح سب تانا بانا بنتے بنتے ہی آپس میں الجھ گئے۔ تقریباً آدھا سال ''دھرنے'' جس کو عرف عام میں اگر عیش و عشرت اور محمد شاہ رنگیلے کے دور سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ایک ترقی پذیر ملک کے صاحب اقتدار، اپوزیشن اور عوام کے پاس اتنے فرصت کے لمحات اتنی انفرادی پیسہ بات کچھ ہضم نہیں ہوتی۔ جس بات اور کام کو اسمبلیوں میں بیٹھ کر احسن طریقے سے انجام دیا جا سکتا تھا اس پر اب تک لاکھوں روپیہ خرچ کر کے بھی کچھ حاصل وصول نہیں ہو سکا۔ وقت کی بے قدری اور پیسے کا بے جا استعمال ایک ترقی پذیر اسلامی ملک کو زیب نہیں دیتا۔

دنیا بھر کے سلاطین اور شہنشاہوں میں حضرت سلیمانؑ کو جو شہرت اور مقام حاصل ہے، اس کی مثال نہیں۔ تمام حیوانات اور حشرات الارض کی آواز سننے اور سمجھنے کی قدرت رکھنے والے نبی اور بادشاہ اپنے فضا میں اڑتے ہوئے قالین پر چیونٹیوں کی آواز سن رہے تھے۔ آپ نے سنا، کوئی چیونٹی اپنی ہم قوم چیونٹیوں سے کہہ رہی تھی۔

''اپنے اپنے گھروں میں چھپ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان کا لشکر ہم سب کو کچل ڈالے۔'' آپ کا قالین ایک بڑے میدان میں اتر گیا۔ یہ وادی نمل تھی (چیونٹیوں کی وادی) ساری چیونٹیوں کو حکم ہوا کہ وہ حاضر ہو جائیں۔ سب جمع ہو گئیں تو حضرت سلیمانؑ نے فرمایا:۔

''وہ چیونٹی جس نے سب کو روپوش ہونے کا دیا تھا الگ ہو جائے۔''

ایک چیونٹی آپ کے پاس پہنچ گئی۔ آپ نے اس کا نام اور حیثیت پوچھی تو اس نے اپنا نام شمالا اور حیثیت ملکہ کی بتائی۔

آپ نے استفسار کیا ''میرا قالین تو اوپر رواں دواں تھا۔ تمہیں کچل جانے کا خطرہ کیوں کر لاحق ہوا۔''

چیونٹی نے جواب دیا ''آپ کو دیکھ کر مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں میری قوم کی کوئی چیونٹی آپ کے لشکر کے [illegible] میں مشغول ہو کر اپنی زندگی کی کچھ ساعتیں بے کار ضائع نہ کر دے۔''

ہر سال ''کیا کھویا کیا پایا'' اگر اس جملے پر غور کیا جائے تو قارئین اس سے اتفاق کریں گے کہ ہم نے صرف کھویا ہے۔ اسی دسمبر کے مہینے میں آدھا ملک بھی کھو دیا تھا۔ اور جو بچا ہے اس کی حفاظت اور بقا کے لیے آپس میں متحد ہونے کی بجائے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں۔

اقتدار کی لالچ، کرسی کی جنگ اور ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونا ایسے افعال ہیں جن کا گراف ہر سال اوپر سے اوپر ہی جاتا رہا۔ نفسا نفسی کے راج اور منفی رویوں نے معاشرے کی اجتماعیت کو شدید متاثر کیا۔ عدلیہ [illegible] ہوگئی۔ پٹرولیم کی ناقابل یقین کمی نے اشیاء ضروریہ کی آسمان کو چھوتی قیمتوں کو ٹس سے مس نہیں کیا۔ ایک [illegible] پیٹ پھٹنے کی حد تک بھر چکا ہے جس روز دوسرے کے منہ میں سونے کا لقمہ ڈال دیا وہ بھی انہی جوشیلوں کو روندتا ہوا گزر جائے گا جنہوں نے اس دھرنے کو اپنے قیمتی دن رات دے کر رونق بخشی۔

کیا کوئی جواب دہ ہے کہ یہ ڈرامے، عوام سے مذاق، دھوکے بازی، اور جھوٹے وعدے کب اختتام پذیر ہوں گے؟ عوام کی نمائندگی کا صحیح حق کون ادا کرے گا۔ ملکی عدم استحکام کو کون استحکام دے گا؟ اگر موجودہ بالا حالات کو قابو نہ کیا گیا تو آج حکمران آپس میں دست و گریبان ہیں بعید نہیں کہ عوام بھی اپنے ہاتھ ایک دوسرے پر ڈھیلے کرنے شروع کر دے۔

اب سب کو کسی ق، ل، م، ن، ی، یا پے کی قیادت کی بجائے ایسی تحریک کی ضرورت ہے جو سیاسی پارٹیوں کو اقتدار کے وائرس سے پاک کرے اور نوجوان نسل کی صفوں کو منظم اور متحد کرے۔ انہیں اپنی روایات اور اقدار سے روشناس کرائے تاکہ وہ بھی دنیا میں سر اٹھا کر باوقار طریقے سے چل سکیں۔

صائمہ ناصر بنت عابد زند

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

انتخاب

یہ تاریخ کا تنازعہ ہے

یہ میرا ذاتی معاملہ نہیں، یہ پاک فوج کے وقار کا معاملہ ہے۔

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائر) امیر عبداللہ خان نیازی ----- انتخاب: محمد ساجد گل اعوان

سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ سقوط بغداد اور سقوط غرناطہ کے بعد مسلم تاریخ کا بڑا ہی شرمناک سنگ میل ہے۔ اندلس، بغداد اور متحدہ پاکستان کے آخری شب و روز دیکھیں تو ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ سارے مناظر ایک جیسے ہیں۔ ان تینوں سانحات میں حکمرانوں کی عیش کوشی اور ان کے اخلاق و کردار کی کمزوریاں مشترکہ نظر آتی ہیں۔ انہی کمزوریوں سے اسلام کے ازلی دشمنوں نے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کے عسکری تفاخر کو خاک میں ملا دیا۔

اس شرمناک المیے سے کوئی سبق سیکھنے کی بجائے اس وقت کے حکمرانوں نے اپنے کالے کرتوتوں کی سیاہی فوج کے منہ پر مل دی حالانکہ یہ سو فیصد سیاسی شکست تھی۔ 1975ء میں محترم عنایت اللہ مرحوم نے ''اپنی شکست کی کہانی کچھ آنکھوں دیکھی کچھ غیروں کی زبانی''۔ کے عنوان سے سقوط مشرقی پاکستان کا تجزیہ پیش کیا اور آخر میں مارشل لاء حکام کو اس سانحے کی انکوائری کا مشورہ دیا۔ یہ مضامین پڑھ کر لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ نیازی نے ''حکایت'' کو ایک مضمون بھیجا اور عنایت اللہ صاحب کے مؤقف کی تائید کی۔ ہم یہ مضمون قند مکرر کے طور پر شائع کر رہے ہیں تاکہ اپنی لغزشوں کا احتساب ہو۔ اب دشمن بلوچستان میں وہی کھیل کھیلنے کی کوششوں میں ہے۔ حکمرانوں سے گزارش ہے کہ خدارا!! اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور وطن عزیز میں وہ حالات پیدا نہ ہونے دیں جن کی وجہ سے قوم کو شکست کی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ (مدیر)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

”حکایت“ میں آپ نے سقوط ڈھاکہ کی انکوائری کا مطالبہ کیا ہے اس کے ساتھ ہی آپ نے مارشل لاء حکام کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ اگر سقوط ڈھاکہ کی انکوائری کا کوئی ارادہ نہیں تو اس موضوع پر آئے دن جو کتابیں چھاپی جارہی ہیں ان پر بھی پابندی عائد کردی جائے کیونکہ ان سے قوم غلط فہمیوں میں مبتلا ہو رہی ہے اور آگے چل کر یہی ہماری تاریخ بن جائے گی۔ میں بھی یہی مشورہ دینا چاہتا ہوں مگر سقوط ڈھاکہ کے بعد ملک اور قوم کی گردن ایسے سیاستدان کے ہاتھ میں آ گئی جو قومی وقار کو ذاتی اقتدار پر ترجیح دیتا تھا۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ فوج کا تھا کہ یہی ایک قوت ہے جو قومی وقار کی خاطر اُسے ذاتی اقتدار سے محروم کرسکتی ہے۔ لہٰذا اُس نے پہلی مہم فوج کو قوم کی نظروں میں گرانے کے لئے چلائی۔ اُس کے لئے اس مہم کی کامیابی آسان تھی کیونکہ ملک توڑا جاچکا تھا اور اس کے نتیجے میں آدھی فوج دشمن کی قید میں بھجوادی گئی تھی۔ اس اقتدار پرست حکمران کے لئے یہ نادر موقع تھا کہ اپنی اُس فوج پر جس نے ہر میدان میں شجاعت اور فنی قابلیت کی نئی روایت قائم کی تھی۔ ایسے ایسے الزام عائد کرے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ پاک فوج نے یوں بھی کیا ہوگا۔

اس حکمران نے ان انسانی کمپیوٹروں میں اپنے مفادات اور عزائم کے مطابق معلومات اور مواد ڈالا۔ انہوں نے اُس کی منشا کے مطابق مضامین اور کتابیں لکھ ڈالیں تو اس حکمران کے حاشیہ برداروں نے انہیں حوالے اور سند کے طور پر استعمال کران شروع کردیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ صرف مجھے نہیں بلکہ پوری فوج کو قوم کو نظروں میں ذلیل اور رسوا کردیا جائے۔ ہمارے ازلی دشمن کے ففتھ کالم کے لئے یہ سنہری موقع تھا۔ اُس نے حکمران ٹولے کی مہم کو اپنے ایجنٹوں کے ذریعے آسان کر دیا اور پاکستان کی دفاعی مشینری کو اپنی مرضی کے مطابق کمزور کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔

اُس وقت کے حکمران ٹولے کو دو سہولتیں حاصل تھیں۔ ایک یہ کہ قوم سراپا سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ ہر کسی کی زبان پر یہی ایک سوال تھا کہ اس شکست کے اسباب کیا ہیں اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اور دوسری یہ کہ قوم کی غالب اکثریت کوری سلیٹ کی طرح اَن پڑھ ہے اور جو لوگ تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں وہ حقیقت پسند کم اور جذبات پرست زیادہ ہیں۔ اس فریب خوردہ مخلوق کو جہاں سے کوئی آواز سنائی دی اس نے سچ مان لی مگر جان نہ سکی کہ یہ ایک طرف کی آواز ہے اور دوسری طرف کی آواز جام کردی گئی ہے۔ پاکستان کے اقتدار پرست حکمرانوں کو ہمیشہ یہ سہولت حاصل رہی ہے (جو پاکستان کی بدنصیبی ہے) کہ یہاں قلم فروشوں کی کمی نہیں۔ حاکم وقت کے ذاتی عزائم مقاصد اور مفادات کی خاطر قومی وقار اور حقائق پر الفاظ کا سیاہ پردہ ڈالنا اور جھوٹ کو سچ کر دکھانا ان قلم فروشوں کے لئے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ پچھلی حکومت نے بھی اس گروہ کی خدمات حاصل کرلیں۔ انہیں عہدوں اور نقدی کی صورت میں انعام واکرام سے نوازا اور سچ پر دروغ کے پردے پڑنے لگے۔

اب چونکہ ملک کی باگ ڈور اُس فوج کے ہاتھ میں ہے جسے ذلیل ورسوا کیا گیا تھا، اس لئے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ انکوائری ہوگی جس میں صرف یہ چھان بین نہیں ہوگی کہ 1971ء کی شکست کی ذمہ دار فوج تھی یا نہیں بلکہ یہ تحقیقات بھی کی جائے گی کہ اُس وقت کی سیاست اور سیاستدان فوج کی دونوں محاذوں کی کارکردگی پر کس طرح اثر انداز ہوئے۔ میرے جرنیل بھائی اچھی طرح جانتے ہیں کہ فوج برسر اقتدار سیاستدانوں کا ہتھیار کہلاتی ہے جسے اُس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب دشمن کے ساتھ یا اپنے ملک کے غدار ٹولے کے ساتھ جو خانہ جنگی کے لئے زمین ہموار کر رہا ہو، پُرامن مذاکرات

ناکام ہو جاتے ہیں۔ فوج کو آخری حربے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اپنی حکومت جو ہر پہلو سے سیاسی ہوتی ہے، جنگ کے کسی بھی مرحلے میں محسوس کرے کہ فوجی حربہ نیام میں واپس آ جانا چاہئے تو فائر بندی کردی جاتی ہے۔

گزشتہ تیس برسوں کے حالات اور احوال وکوائف پر نظر رکھنے والے بے خبر نہیں کہ ہم نے جتنی بھی جنگیں لڑیں وہ ہماری سیاست بازی کی نذر ہوگئیں۔ ہمارا کوئی حکمران بیرونی دباؤ سے گھبرا کر گھٹنے ٹیک گیا اور کسی نے اپنے اقتدار کو خطرے میں محسوس کیا اور کوئی پاک فوج زندہ باد کے نعرے سے گھبرا گیا کہ یہ تو ایک اور طاقت ابھر رہی ہے۔ میں ہر ایک جنگ کا تجزیہ نہیں کروں گا۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ فوجی حکومت ان حقائق اور اسباب کو سامنے لائے کہ اُس وقت کے سیاسدانوں نے فوجی ہتھیار کو کیوں استعمال کیا اور اس کے استعمال میں کیا کیا غلطیاں کیں۔ اس انکوائری میں اُن سیاسی لیڈروں کو بھی بے نقاب کیا جائے جو ادھر سے درپردہ مشرقی پاکستان جاتے رہے اور مجیب کو شہ دے کر اُس کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ پاک افواج کو ذلیل ورسوا کرنے کا ناپاک مقصد ذہن میں رکھ کر میرے خلاف، میرے سینئر افسروں اور میری کمانڈ کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا اور میری آواز جام کردی گئی۔ آپ اس کے گواہ ہیں۔ آپ نے 1975ء کے آغاز میں سقوط مشرقی پاکستان کا تفصیلی تجزیہ شائع کیا تھا جس میں آپ نے حقائق سے اور دشمن کے جرنیلوں کے بیانات کے حوالوں سے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ فوجی شکست نہیں تھی اور وہاں ہماری جو مٹھی بھر فوج تھی وہ ستمبر 1965ء کی نسبت زیادہ دلیری سے لڑی۔ آپ نے دشمن کے جرنیلوں کے حوالے سے لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان میں پاک فوج معرکے Battles نہیں ہاری بلکہ پاکستان نے دیگر وجوہات کی بناء پر جنگ ہاردی۔

میں نے آپ کے یہ مضامین پڑھے تھے اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ”حکایت“ کے یہ شمارے اپنی مسلح افواج کے لئے ممنوع قرار دے دیئے گئے ہیں حالانکہ آپ نے ان میں قوم کو یہ بتایا تھا کہ مشرقی پاکستان میں پاک فوج کی تعداد دشمن کے مقابلے میں کتنی کم تھی اور اپنی فوج کے پاس اسلحہ اور ساز وسامان کی کتنی کمی تھی اور دیگر تمام احوال وکوائف کس طرح ہماری فوج کے خلاف تھے۔ اس کے باوجود فوج لڑی اور دشمن سے کہلوالیا کہ پاکستان کی فوج کے پاس نفری اور مکمل سامان ہوتا اور اس کے سامنے یہ دشواریاں نہ ہوتیں تو ہم (بھارتی) یہ کامیابی کبھی حاصل نہ کرسکتے۔ یہی ”حکایت“ کا جرم تھا کہ اس وقت کا حکمران اُس کا خوشامدی ٹولہ فوج کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ سمجھ کر ذلیل کرنے کے درپے تھا مگر آپ نے اصل حقیقت بیان کردی تھی۔ آپ پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا تھا کہ آپ نے میرے کہنے پر میری صفائی اور میرے وقار کے تحفظ کے لئے یہ مضامین لکھے ہیں، حالانکہ ان مضامین کے متعلق مجھے اُس وقت پتہ چلا تھا جب یہ چھپ چکے تھے۔ اگر مجھے پہلے پتہ چل جاتا تو میں آپ کو روک دیتا اور آپ کو خبردار کرتا کہ مشرقی محاذ کی کھری بات کہہ کر اپنے آپ کو مصیبت میں نہ ڈالیں۔

میں نے ”حکایت“ کا حوالہ اس لئے دیا ہے کہ ثابت کیا جاسکے کہ سچ بات کہنے پر کیسی پابندی عائد تھی اور یہی وجہ ہے کہ میں اپنا یہ بیان صرف ”حکایت“ کو بھیج رہا ہوں لیکن میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ مجھے ایک سوال کا جواب دینا ہے۔ جب سے میں بھارتی قید سے واپس آیا ہوں مجھے میرے دوست کہہ رہے ہیں کہ میں سقوط ڈھاکہ کے اصل اسباب پریس کو دے دوں۔ پھر میرے خلاف مضامین اور کتابیں لکھی اور لکھوائی جانے لگیں۔ یہ پڑھ کر بعض ایڈیٹر اور رائٹر میرے پاس آنے

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

لگے۔ انہوں نے بھی یہی سوال پوچھا کہ میں خاموش کیوں ہوں۔ سب نے فرداً فرداً مجھے اکسایا کہ میں بھی ایک کتاب لکھوں لیکن میں خاموش رہا۔

اپنی خاموشی کی ایک وجہ اوپر بیان کر چکا ہوں۔ یہ جو صحافی میرے پاس آتے رہے ان کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ ان میں سے بعض جنگی امور کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اور ان میں ایسے بھی تھے جن کے سامنے صرف کاروبار تھا۔ میری لکھی ہوئی کتاب ہاتھوں ہاتھ بک سکتی تھی اور چھاپنے والوں کو خوب پیسہ دے سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں جو حقائق سنانا چاہتا ہوں اور جو قوم کو سنانے ضروری ہیں وہ یہ لوگ شائع کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ پھر وہ حکمران جیل میں بند ہو گیا جس کی حکمرانی میں فوج کے حق میں بات کرنے والے کو سولی پر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ میں اب بات کر سکتا تھا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جنرل ضیاء الحق نے زبان بندی ختم کر کے گھٹن ختم کر دی ہے۔ اب میں، میرے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کے جواب میں سچی باتیں چھپوا سکتا ہوں مگر میں پھر بھی خاموش ہوں۔ انتخابات کے دوران میں نے چند جگہوں پر تقریریں کی تھیں۔ سننے والے سمجھے کہ میں نے سب کچھ کہہ دیا ہے مگر میں نے جو کچھ کہا وہ اس کا دس فیصد بھی نہیں جو مجھے کہنا ہے۔

اب بھی میں وہ باتیں نہیں کہوں گا جس کی قوم منتظر ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں کیوں خاموش ہوں۔ اس کا جواب ان تھوڑے سے الفاظ میں دے سکتا ہوں کہ میں لیفٹیننٹ جنرل تھا۔ میں اب بھی لیفٹیننٹ جنرل ہوں۔ مجھے قومی وقار ذاتی وقار سے زیادہ عزیز ہے۔ اگر میں اپنے عہدے، اپنی حیثیت اور قومی وقار کو الگ رکھ دوں تو میں طعنے کا جواب طعنے سے اور گالی کا جواب گالی سے دے سکتا ہوں۔ میں اکی پر ڈکی اور نہلے پر دہلا مار سکتا ہوں۔ میرے خلاف جو جھوٹی اور گھناؤنی باتیں لکھی گئیں۔ آج میں ان کے جواب میں ان سے زیادہ گھناؤنی باتیں چھپوا سکتا ہوں۔ میں اُن مصنفوں کی اصلیت کو بھی بے نقاب کر سکتا ہوں جنہوں نے کتابوں اور مضامین میں میری شخصیت پر سیاہی ملنے کی کوشش کی اور کر رہے ہیں۔

انہوں نے مجھے نااہل اور بزدل جرنیل کہا۔ ''جنرل نیازی کی راتیں'' کے عنوان کے تحت مجھے راجہ اندر بنایا۔ مجھے شرابی، کبابی اور عیاش کہا اور اس سے بھی گھٹیا اور فحش باتیں چھاپیں اور چھپوائی گئیں جب کہ بات جنگ، سقوط ڈھاکہ، مغربی پاکستان میں فائر بندی اور ان کے سیاسی اور فوجی پہلوؤں کی ہونی چاہئے تھی۔ اب ایک اور کتاب چھپوائی گئی ہے جس کی پبلسٹی ٹیلیوژن پر بھی کی گئی ہے اور اخباروں میں خبروں کے ذریعے بھی۔ اس کتاب میں بھی گھٹیا اور اخلاقیات سے گری ہوئی باتیں لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب پروپیگنڈے کے اس اصول کے تحت لکھوائی گئی ہے کہ جھوٹ کو دہراتے چلے جاؤ حتیٰ کہ تم خود اس جھوٹ کو سچ ماننے لگو۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو مارشل لاء سے پہلے شروع کیا گیا تھا۔

ان میں زیادہ تر کتابیں انگریزی میں لکھی گئی ہیں اور جس تازہ کتاب کا میں نے ذکر کیا ہے یہ انگلینڈ میں چھپوائی گئی ہے۔ یہ کتابیں اُن تمام ممالک میں پڑھی جا رہی ہیں جہاں انگریزی پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ انگریزی پڑھنے والے لوگ فہم و فراست اور عقل و دانش والے ہوتے ہیں۔ یہ کتابیں پڑھ کر وہ صرف مجھے بُرا بھلا نہیں کہتے بلکہ یہ رائے دیتے ہیں کہ جس قوم کے قلمکار (بلکہ فوجی قلمکار) اتنی بڑی شکست کے بعد ایسی گھٹیا اور اخلاق سوز باتیں لکھ لکھ کر خوش ہو رہے ہیں اس قوم کا کوئی کردار نہیں اور اسے جو شکست ہوئی ہے وہ اسے ہونی ہی چاہئے تھی۔ وہ غیر ممالک جو پہلے ہی پاکستان کے دشمن ہیں اور جنہوں نے سقوط مشرقی پاکستان سے بہت عرصہ پہلے پاکستان کا مشرقی بازو کاٹ دینے کی مہم کا آغاز کر دیا تھا، یہ رائے ضرور دیتے ہوں گے کہ جس ملک کے حکمران اپنے ایک معمولی عہدے کے فوجی افسر کو ایسی کتابیں چھپوانے کی اجازت دے سکتے ہیں وہ ملک کے اس حصے کو بھی نہیں سنبھال سکیں گے۔ جگ ہنسائی کا اپنے ہاتھوں انتظام کرنے والوں کے متعلق اور کہا بھی کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کے ضمن میں میرے ذہن میں کچھ اور باتیں بھی آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ تازہ کتاب انگریزی میں کیوں لکھی گئی۔ اور انگلینڈ میں کیوں چھپوائی گئی؟ کیا یہ اپنی قوم کے لئے نہیں لکھی گئی اور کیا یہ انگریزوں، امریکیوں وغیرہ کے لئے لکھوائی گئی ہے؟ یہیں سے خیال آتا ہے کہ یہ انگریزوں کے اُسی پروگرام کی ایک کڑی تو نہیں جس کے تحت انگریز آج تک مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کر رہے ہیں؟ میرے اس شک کی تفصیل یوں ہے کہ برطانیہ میں بھی ابھی تک ایسی کتابیں اور ناول چھپ رہے ہیں جن میں 1857ء کی جنگ آزادی کے مجاہدین کی تذلیل کی جا رہی ہے۔ سید احمد شہید کو رہزن اور لٹیرا کہا جا رہا ہے۔

ہمارے صوبہ سرحد کے قبائلی علاقے کے پٹھان 14 اگست 1947ء تک انگریزوں کے خلاف لڑتے رہے اور انہوں نے اپنے علاقے کو انگریزی راج سے آزاد رکھا۔ ان کے متعلق انگریزوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ ان سب میں پٹھان حریت پسندوں کو ڈاکو کہا گیا ہے۔ اب سقوط مشرقی پاکستان کے متعلق بھی یہ کتاب انگریزوں کے ہاں چھپوائی گئی ہے جس سے میرا یہ شک پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ اس میں انگریزوں کی خوشنودی کا عمل دخل ضرور ہے۔

ایک اور پہلو توجہ طلب ہے۔ سقوط مشرقی پاکستان معمولی سا واقعہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ مغربی پاکستان کا بھی محاذ منسلک ہے۔ اِدھر راجستھان سیکٹر میں بے شمار رقبہ اور شکر گڑھ کی پوری تحصیل دشمن کو دے دی گئی تھی۔ جوابی حملے کا وقت آیا تو فائر بندی کرا دی گئی۔ دونوں محاذوں پر ناکامی ایک ایسا قومی اور تاریخی حادثہ ہے جس کے اسباب اور پس منظر کے متعلق ہماری حکومت کو وائٹ پیپر (قرطاس ابیض) شائع کرنا چاہئے تھا۔ اس سے پیشتر کسی قلمکار اور کسی پرائیویٹ ادارے کو اس موضوع پر صحیح یا غلط کتاب چھاپنے کی اجازت نہیں ملنی چاہئے تھی مگر ہمارے ہاں یہ دھاندلی ہو رہی ہے کہ جس کے دل میں جو آتا ہے لکھتا چلا جا رہا ہے بلکہ پچھلی حکومت اپنے مطلب کا مواد چھپواتی رہی ہے۔ حد یہ کہ ایک فوجی افسر کتاب لکھتا اور چھپواتا ہے اور باز پُرس نہیں ہوتی کہ اس دھاندلی کا ذمہ دار کون ہے؟

یہ جو کچھ بھی ہے میں اپنے خلاف گالی گلوچ سن کر بھی خاموش ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میری خاموشی میرے خلاف الزامات کو صحیح ثابت کر رہی ہے اور لوگ انہی تحریروں کو سچ سمجھ رہے ہیں جو میرے خلاف چھاپی جا رہی ہیں۔ یہاں میں آپ کو ایک لطیفہ سناؤں گا۔ گزشتہ صدی کی ابتدا تک انگلینڈ میں جیب تراشی اور قتل کے مجرموں کو سرِعام پھانسی دی جاتی تھی۔ پہلے سے اس کا اعلان کیا جاتا۔ تماشائی دور دور سے تماشہ دیکھنے آتے تھے۔ ایک بار ایک مجرم کو پھانسی کے لئے لے جا رہے تھے۔ تماشائی ایک دوسرے کو دھکے دیتے اور آگے ہو کر پھانسی کا تماشہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھانسی پانے والے کو آگے لے جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔

اس مجرم نے بلند آواز سے تماشائیوں سے کہا۔ ''جب تک میں آگے جا کر پھانسی کے تختے پر کھڑا نہیں ہوں گا۔ اُس وقت تک تم وہ تماشہ نہیں دیکھ سکو گے جس کے لئے اتنے بے تاب ہو رہے ہو۔ مجھے وہاں تک پہنچنے کے لئے راستہ دو''۔

جب سے میرے خلاف پروپیگنڈے کا اور سقوط مشرقی پاکستان کے عجیب و غریب تجزیوں کا طوفان اٹھا

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہے مجھے یہ لطیفہ اکثر یاد آتا ہے۔ میں آپ سے یہی کہوں گا کہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کتابیں لکھئے اور لکھوائیے اور ان کی پبلسٹی کیجئے لیکن یہ تماشہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہوگا۔ جب تک مجھے آگے جانے کا راستہ نہیں ملے گا۔ جو میں جانتا ہوں وہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ مجھے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر کے پھندا میری گردن میں ڈال دیں اور مجھے بات کرنے کا موقع دیں۔ اگر صحیح حقائق کے مطابق سقوط کا ذمہ دار میں ہی ہوں تو میرے پاؤں کے نیچے سے تختے ہٹا دیں مگر خدا کے لئے مجھے تماشہ بناتے بناتے پوری قوم اور فوج کو ساری دنیا کے سامنے تماشہ نہ بنائیں۔

اب میری خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنے عہدے، اپنی پوزیشن اور قومی وقار کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں جرنیل تھا اور جرنیل ہوں۔ اوچھی تحریریں، ذاتی حملے اور گند اچھالنا ایک جرنیل کی شان کے خلاف ہے۔ میں انگریزی لکھ سکتا ہوں اور میں اردو بھی لکھ سکتا ہوں مگر میں دشمن سے یہ نہیں کہلوانا چاہتا تھا کہ وہ دیکھو پاکستان میں جوتوں میں دال بٹ رہی ہے۔

میری خاموشی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میرے خلاف جو مضامین اور کتابیں لکھوائی گئی ہیں ان میں سیاسی اور جنگی حقائق کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ میں اگر ان کے جواب میں کتاب لکھ ڈالوں تو مجھے حقائق سامنے لانے پڑیں گے، مگر ان میں متعدد حقائق ایسے ہیں جن کا کتاب میں کسی اخبار یا رسالے میں چھپوانا مناسب نہیں کیونکہ یہ مملکتی اور فوجی راز ہیں، یعنی یہ سٹیٹ یا ملٹری سیکرٹ ہیں۔ یہ ایسے راز ہیں جن کا میں ہر کسی کے ساتھ ذکر نہیں کر سکتا۔ کتابوں میں صرف وہ تجزیے اور تبصرے چھاپے جا سکتے ہیں جو محاذ سے ایک ہزار میل دور گھروں یا دفتروں میں بیٹھ کر لکھے جاتے ہیں، یا کتاب میں دشنام طرازی کی جا سکتی ہے۔ میں یہ دونوں کام نہیں کر سکتا۔ یہ چنڈال چوکڑیوں کے تبصرے میں ہیں بہتر الفاظ میں Drawing Room Review کہہ لیں۔ میں فوجی راز پریس میں بے نقاب نہیں کر سکتا۔ ان کے ذکر کے لئے صرف وہ بند کمرہ موزوں ہوگا جس میں تین چار وہ جرنیل بیٹھے ہوں گے جنہوں نے پاکستان کی چاروں نہیں تو ایک جنگ ضرور لڑی ہو اور اُن کے ساتھ پاکستان کا کوئی سینئر جج ہوگا جو ہماری اسی وقت کی سیاست بازی کو غیر جانبداری سے سمجھتا ہو۔

میں یہ گزارش خاص طور پر کروں گا کہ کتابوں اور رسالوں کے ذریعے ہی قوم کو بتانا ہے کہ اس تاریخی حادثے کا پس منظر کیا تھا تو غیر ملکی مبصروں کی وہ کتابیں جن کا پاکستان میں داخلہ بھٹو نے ممنوع قرار دے دیا تھا ان پر سے بھی پابندی اٹھا لیں تا کہ قوم کو تصویر کا وہ دوسرا رخ بھی نظر آ جائے جو قوم سے چھپانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ایسی ایک کتاب ایک برطانوی وقائع نگار نے انگلینڈ میں لکھی تھی اور بھٹو نے اسے پاکستان کے لئے خاص طور پر ممنوع قرار دیا تھا۔ بھارت کے ایک جرنیل کی لکھی ہوئی ایک کتاب بھی پاکستان میں آنے دیں۔ غیر ممالک کے اُن نامہ نگاروں کی رپورٹوں کے تراشے بھی قوم کو دکھائیں جنہوں نے مشرقی محاذ کی جنگ اپنی آنکھوں دیکھی تھی اور اگر ایسا کرنے کا ارادہ نہ ہو تو پاکستان میں بھی سقوط مشرقی پاکستان کے موضوع پر کتابوں کی اشاعت پر پابندی عائد کر دیں تا کہ ہماری تاریخ بے بنیاد باتوں اور غلط اعداد و شمار سے محفوظ رہے۔

آپ نے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ بھٹو نے حمود الرحمٰن کمیشن کی کاپی کورٹ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں اس پر رائے نہیں دے سکتا کیونکہ یہ کورٹ کا معاملہ ہے۔ البتہ میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ اس کمیشن کی تحقیقات کے مطابق اگر میں مجرم تھا تو میرے خلاف وہ کارروائی کیوں نہ کی گئی جو شکست کے مجرم کے

خلاف کی جانی چاہیے تھی؟ اس کمیشن کے فائل چھپا کر کیوں رکھے گئے؟ اس کی بجائے کتابیں اور مضامین کیوں لکھوائے گئے؟ اور تازہ کتاب ایسے افسر کے نام سے کیوں چھپوائی گئی جس کا کام لڑنا ہے ہی نہیں اور جو جنگ کی ابجد سے بھی واقف نہیں؟

میں نے ابتدا میں کہہ دیا ہے کہ میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں صرف اس سوال کا جواب پیش کر رہا ہوں کہ میں خاموش کیوں ہوں۔ میں نے یہ بھی کہا ہے کہ میں فوجی رازوں کا تذکرہ اخباروں اور رسالوں میں نہیں کر سکتا لیکن بھارت کی اور اپنی جنگی قوت کے اعداد و شمار پیش کر دیتا ہوں یہ اب راز نہیں رہا۔ یہ اعداد و شمار غیر ممالک کے بعض جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں اور پاکستان میں بھی ایک کتاب میں آ چکے ہیں۔ زمین و آسمان کا یہ فرق ملاحظہ فرمایئے:

میرے لئے کمک اور رسد کے تمام راستے بند تھے۔ فوج کے پاس وردی تک ناکافی تھی۔ میڈیکل کور (طبی امداد کے لئے) ناپید تھی۔ میری یونٹوں کے سامنے دشمن، سر پر دشمن کے طیارے اور عقب میں ایک لاکھ کمانڈر اور گوریلا فورس سرگرم تھی۔ بے وقت ظالمانہ اور ناکام ملٹری ایکشن سے (جو میرے وہاں جانے سے پہلے مکمل ہو چکا تھا) وہاں کا بچہ بچہ پاک فوج کا دشمن بن چکا تھا۔ میں تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ یہ اعداد و شمار صرف اس لئے پیش کئے ہیں کہ آپ کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ مشرقی پاکستان میں پاک فوج کو بے سروسامانی اور نفری کی قلت کی حالت میں لڑایا گیا اور ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ یہ اعداد و شمار کتابوں میں دیئے جاتے ہیں مگر بات جب ہتھیار ڈالنے پر آتی ہے تو تمام تر ذمہ داری میرے سر پر ڈال دی جاتی ہے اور اسے برحق ثابت کرنے کے لئے عجیب و غریب تجزیے اور تبصرے پیش کئے جاتے ہیں۔

یہاں میں ایک بھارتی جرنیل، جنرل پیلٹ کی لکھی ہوئی کتاب کا صرف ایک اقتباس بطور نمونہ پیش کرتا ہوں:

''ہماری اس کامیابی میں کچھ اخلاقی عناصر بھی کارفرما تھے جن میں قابل فکر یہ ہے کہ بھارت نے پاکستان آرمی کے خلاف لوٹ مار، آبروریزی، قتل عام اور غیر انسانی تشدد کا پروپیگنڈہ (بے بنیاد) اس قدر بڑھ چڑھ کر کیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں پاکستان آرمی کے سب سے بڑے افسر سے لے کر معمولی سے سپاہی تک کی قدر و منزلت بحیثیت انسان ہر کسی کی نظروں میں ختم ہو گئی تھی۔ اس پروپیگنڈے سے انہیں انسانیت کے درجے سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اس کا اثر ان کے مورال پر پڑا...... جہاں تک لڑائی کا تعلق ہے ان (پاکستان آرمی) کی یونٹیں اور بریگیڈ غضب اور قہر سے لڑے''۔

میں نے یہ اقتباس اس لئے پیش کیا ہے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ دشمن کا ایک جرنیل اعتراف کر رہا ہے کہ پاکستان آرمی کا مورال توڑنے کے لئے یہ نفسیاتی حربہ استعمال کیا گیا تھا کہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ پاک فوج نے آبروریزی اور لوٹ مار وغیرہ کا ارتکاب کیا تھا لیکن پاک فوج کا مورال نہ ٹوٹ جاتا تو بھارت کا یہ جرنیل یہ اعتراف نہ کرتا کہ پاکستان آرمی کی یونٹیں اور بریگیڈ گروپ غضب اور قہر سے لڑے۔

یہ تو ہمارے دشمن کا پروپیگنڈہ تھا۔ یہی پروپیگنڈہ پاکستان میں پاکستانی مصنفوں نے کیا بلکہ ان سے کرایا گیا اور دشمن کے عائد کئے ہوئے جھوٹے الزامات کی تائید کی۔ رسوا صرف مجھے کرنا تھا مگر ساری فوج کو رسوا کر دیا گیا اور یہ مذموم حرکت صرف اس لئے کی گئی کہ

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بھارتیوں کی طرح ہماری پچھلی حکومت کا بھی یہی منشا تھا کہ پاک فوج کی قدر و منزلت بحیثیت انسان ہر پاکستانی کی نظروں میں ختم ہو جائے۔ یہ اقتدار کی کرسی اور دھاندلی کے تحفظ کی ترکیب تھی لیکن وہی ہوا جس کا بھٹو کو خطرہ تھا۔ پاک فوج نے ملک کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے بھٹو کو اقتدار سے محروم کر دیا۔

اب فوج کو اپنے چہرے سے وہ داغ مٹانے ہیں جو پچھلی حکومت نے لگائے تھے۔ فوج کو اچھلے کردار کے مظاہرے کر کے یہ ثابت کرنا ہے کہ 1971ء میں فوج کا کردار بے داغ تھا۔ میرے جرنیل بھائیوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ حقائق سے ثابت کریں کہ سقوط مشرقی پاکستان فوجی شکست نہیں تھی۔ اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ اُس نے پاکستان آرمی کا Image توڑ دیا ہے اور ایک نظریے کو شکست دی ہے۔ پاکستان میں بھی گزشتہ چھ برسوں میں پاکستان آرمی کے Image کو ہی توڑنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ اب ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ان کوششوں میں نہ بھارت کامیاب ہو سکا ہے نہ پچھلی حکومت میں پورے اعتماد سے اور پورے فخر سے کہتا ہوں کہ فن حرب و ضرب جذبۂ حب الوطنی اور مورال کے لحاظ سے پاک فوج دنیا کی بہترین فوج تسلیم کی جاتی ہے۔

بھٹو پر ملک توڑنے کا الزام بھی عائد کیا جا رہا ہے لیکن یہ کافی نہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ سقوط مشرقی پاکستان کی انکوائری کی جائے جس میں تین چار سینئر جرنیل ہوں اور اس کا سربراہ کوئی سینئر جسٹس ہو۔ یہ میرا ذاتی معاملہ نہیں، یہ مسلح افواج کے وقار اور مورال کا معاملہ ہے اور یہ تاریخ کا تقاضہ ہے۔ ہمیں آنے والی نسلوں کو بتانا ہے کہ کیسی کیسی لغزشیں کیسے کیسے بھیانک نتائج کی حامل ہوتی ہیں اور اقتدار کی ہوس ملک و ملت کو آزادی سے بھی محروم کر سکتی ہے۔

❁

(ترمیم و اضافے کے ساتھ [illegible] طبع)

عالمی سفرنامہ

جرمن، امریکہ، افغانستان اور دیگر ممالک کا چشم کشا سفرنامہ۔

(دوسرا ایڈیشن)

جرمنی۔ جی دار لوگوں کی سرزمین

جرمنی کی ترقی کا راز اور انتہائی دلچسپ سفرنامہ

قیمت 300 روپے

سفرِ حج حجاز مقدس کے روح پرور اور ایمان افروز سفر کا حال

صرف =/25 روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

مکتبہ داستان

26- پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور۔

فون: 042-37356541

"ادب سرائے" 125- ایف۔ ماڈل ٹاؤن لاہور۔

مصنف 205/M ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔ فون 0300-4154083

امریکی میڈیا پر یہودی قبضہ

امریکہ اس وقت دنیا میں سپر پاور کے درجے پر فائز ہے اور اس کا میڈیا دنیا کا مضبوط ترین میڈیا شمار کیا جاتا ہے لیکن انتہائی کم تعداد میں ہونے کے باوجود اس میڈیا پر یہودیوں کی مکمل اجارہ داری اور کنٹرول ہے جو اس ملک کی سیاسی، معاشی، سماجی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

☆ .... افضال مظہر انجم

موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ یا میڈیا جس میں الیکٹرانک میڈیا، انٹرنیٹ، کیبل نیٹ ورک، ٹیلی وژن اور پرنٹ میڈیا روزنامہ اخبارات کے علاوہ میگزین، کتب کے پبلشنگ ادارے شامل ہیں وہ دنیا میں موثر ترین کردار ادا کرتے نظر آ رہے ہیں، یہ سب میڈیا کی تیز رفتار ترقی کی وجہ سے ہے۔ دنیا سمٹ کے رہ گئی ہے، ایک ہی وقت میں دنیا کے کسی بھی حصہ میں ہونے والے کسی بھی واقعہ کو پوری دنیا میں دیکھا جا رہا ہوتا ہے اور پوری دنیا میں لوگوں کو ایک بٹن دبا کر اپنی پسند کا کوئی بھی پروگرام جس کا تعلق ثقافت، تعلیم، تہذیب، مذہب، حالات حاضرہ، میوزک، علم ٹ لنون، کھیل سے ہو اور کسی بھی ملک سے ہو دیکھنے کا موقع ہر وقت میسر ہوتا ہے۔

ذرائع ابلاغ ہی وہ موثر ذریعہ ہیں جن کے ذریعے سے لوگوں کے خیالات پر اثر انداز ہونے، اپنے خیالات اور فکر کو دوسرے تک پہنچانے کے علاوہ عام لوگوں کے خیالات بدل کر اپنا ہم نوا بنانے کا موثر ترین کام انجام دیا جاتا ہے۔ قلم اور دماغ کی اس طاقت سے ہی اپنے ہم نواؤں کی تعداد میں اضافہ کیا جاتا ہے جسے

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

عالمی طاقتیں اپنی بالادستی کے لئے مضبوط ہتھیار کے طور پر بھی استعمال کرتی نظر آتی ہیں۔ امریکہ اس وقت دنیا میں سپر پاور کے درجے پر فائز ہے اور اس کا میڈیا دنیا کا مضبوط ترین میڈیا شمار کیا جاتا ہے لیکن انتہائی کم تعداد میں ہونے کے باوجود اس میڈیا پر یہودیوں کی مکمل اجارہ داری اور کنٹرول ہے جو اس ملک کی سیاسی، معاشی، سماجی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ یہودی کمیونٹی کے زیر کنٹرول میڈیا کے اعداد و شمار سے آپ کی آنکھیں حیرت سے کھل جائیں گی۔

دنیا کی سب سے بڑی میڈیا کمپنی والٹ ڈزنی ہے جس کے چیف ایگزیکٹو مائیکل آئنز یہودی ہیں۔ ڈزنی سلطنت جس کو ایک ہی شخصیت چلا رہی ہے اس میں کئی ٹیلی وژن، پروڈکشن کمپنیاں، والٹ ڈزنی ٹیلی وژن، ٹچ سٹون ٹیلی وژن، بونا وسٹا ٹیلی وژن اس کے اپنے کیبل نیٹ ورک اور ویڈیو پروڈکشن کمپنیاں شامل ہیں۔ جہاں تک فیچر فلموں کا تعلق ہے دی والٹ ڈزنی پکچر گروپ جس کے ہیڈ جو روتھ ہیں وہ بھی یہودی ہیں۔ اس گروپ میں ٹچ سٹون پکچر، ہالی وڈ پکچرز اور کارلوان پکچرز شامل ہیں۔ وینسٹائن برادرز کے زیر سرکردگی میرامیکس فلم کی ملکیت بھی ڈزنی گروپ کے پاس ہے۔ 1984ء سے پہلے ڈزنی کمپنی جنائل ڈزنی فیملی کی ملکیت تھی جس کے بعد آئنز نے اس کے کام میں مزید وسعت پیدا کی۔ اس گروپ کے 225 ملحقہ سٹیشن پورے امریکہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ گروپ کے پاس یورپی ٹی وی کمپنیوں کی ملکیت ہے۔

اے بی سی کیبل سبسڈی ای ایس پی این کے سربراہ سٹون بوسٹن بھی ایک یہودی ہیں۔ اس کمپنی کے پاس بھی لائف ٹائم ٹیلی وژن کے حصص ہیں۔ علاوہ ازیں آرٹس اینڈ انٹرٹینمنٹ نیٹ ورک کیبل کمپنی کے حصص بھی انہی کے پاس ہیں۔ اے بی سی نیٹ ورک گیارہ اے ایم اور دس ایف ایم سٹیشن کی مالک ہے اور وہ بھی بڑے شہروں نیویارک، واشنگٹن کے علاوہ 3400 سٹیشنوں کا الحاق اس کے ساتھ ہے۔ اگرچہ ایک ٹیلی کمیونی کیشنز کمپنی کیپٹل سٹی اے بی سی نے ایک ارب ڈالر سے زائد 1994ء میں صرف پبلی کیشنز سے کمایا۔ اس کے زیر ملکیت سات روزنامے، چائلڈ پبلی کیشنز، چلڈرن پبلی کیشنز اور ڈاور ریفائیڈ پبلی کیشنز گروپ شامل ہیں۔ ٹائم وارنر میڈیا کی دنیا کا دوسرا اعلیٰ دیو ہے۔ بورڈ کا چیئرمین جیرالڈ لیون ایک یہودی ہے۔

ٹائم وارنر ملک کا سب سے بڑا ٹی وی نیٹ ورک ہے۔ وارنر میوزک دنیا کی سب سے بڑی میوزک کمپنی ہے جس کے ہیڈ گولڈ برگ یہودی ہیں۔ ٹائم وارنر پبلی کیشنز ڈویژن میگزین کی دنیا کا سب سے بڑا ادارہ ہے جس کے زیر اہتمام ٹائم، سپورٹس، فارچون اور پیپل جیسے میگزین چھپتے ہیں جس کے ایڈیٹر ان چیف فارمین پرسٹائن یہودی ہیں۔ ٹرنر نے کامیاب ٹی وی نیٹ ورک سی این این قائم کیا جہاں کلیدی عہدوں پر یہودیوں کو ہی تعینات کیا گیا ہے اور اس چینل پر بھی یہودیوں کے مفادات کے خلاف کوئی بات نہیں کرنے دی جاتی۔ چیئرمین کی حیثیت سے سی این این میں ایک اور یہودی شخصیت ولیم پالے بیٹھی ہوئی ہے جس کا اصل نام پالنسکی ہے۔ سی بی ایس نیٹ ورک کے 1986ء سے لے کر 1995ء تک چیئرمین بھی یہودی نامور شخصیت لارنس ٹش تھا جو انشورنس، ہوٹل اور سگریٹ انڈسٹری کے مالک بھی تھے۔

امریکہ کی تیسری میگا میڈیا کارپوریشن سمر ریڈ سٹون ہے جس کا سالانہ ریونیو 10 ارب ڈالر ہے اور اس کے زیر انتظام 12 ٹی وی سٹیشن اور 12 ریڈیو سٹیشن ہیں۔ یہ ادارہ 400 بلاک بسٹر سٹورز پر ویڈیوز تقسیم کرتا ہے۔ ادارہ دنیا میں کیبل پروگرام مہیا کرنے کا سب سے بڑا

ہولیدار ہے جو اس کے چینلوں ایم ٹی وی، شو ٹائم اور نکلوڈین کے ذریعے پھیلائے جاتے ہیں۔ چوتھے نمبر پر میڈیا لسٹ کا ادارہ نیوز کارپوریشن ہے جس کے زیر انتظام فاکس ٹیلی وژن اور ینچری فاکس فلمز ہیں۔ پانچویں نمبر پر جاپان کی سونی کمپنی ہے جس کی امریکہ میں سبسڈی ادارہ سونی کارپوریشن امریکہ ایک یہودی مائیکل شل ہاف چلا رہا ہے۔

بہت ساری ٹی وی اور فلم پروڈکشن کمپنیاں یہودیوں کے زیر انتظام ہی چلائی جا رہی ہیں۔ ان میں نیو ورلڈ انٹرٹینمنٹ نمایاں ہے جس کا یہودی مالک رونالڈ ہے۔ دوسری دو بڑی پروڈکشن کمپنیاں ایم سی اے اور یونیورسل پکچرز سی گرام کمپنی کی زیر ملکیت ہے جس کا سربراہ ایڈگا رورلڈ جیوش کانگریس کا بھی صدر ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی فلموں کا بنانا اور ان کی ڈسٹری بیوشن یہودیوں کے کنٹرول میں ہیں۔ پانچ بڑی موشن پکچرز کمپنیوں کی طرف سے پروڈکشن کی ہوئی فلموں کے پاس 74 فیصد باکس آفیسز کا کاروبار ہے۔ ان کمپنیوں میں ڈزنی، وارنر برادرز، سونی، پیراماؤنٹ اور یونیورسل شامل ہیں۔ ٹیلی وژن براڈ کاسٹنگ نیٹ ورک کے تین بڑے اداروں میں اے بی سی، سی بی ایس اور این بی سی شامل ہیں۔ اے بی سی ڈزنی کمپنی کا حصہ تھی اور اے بی سی کے تمام پروڈیوسر یہودی تھے۔ اے بی سی جنرل الیکٹرک کی ملکیت ہے جس کا صدر اینڈ ریو لیک ایک یہودی ہے۔

ٹیلی وژن کے بعد پرنٹ میڈیا امریکہ میں دوسرا مؤثر ترین میڈیا ہے یہاں پر روزانہ 6 کروڑ اخبارات فروخت ہوتے ہیں۔ نیو ہاؤس کا ادارہ دو یہودی بھائیوں سیمیول اور ڈونلڈ کی ملکیت ہے جن کے زیر اہتمام 26 روزنامے ہیں۔ نیو ہاؤس براڈ کاسٹنگ کے اپنے 12 ٹی وی براڈ کاسٹنگ سٹیشن اور 87 کیبل ٹی وی سسٹم موجود ہیں۔ دی سنڈے سپلیمنٹ پریڈ کی اشاعت 2 کروڑ 20 لاکھ فی ہفتہ ہے۔ علاوہ ازیں اس کے 2 درجن کے قریب دوسرے میگزین بھی ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہی جب سے یہودی تاجروں اور دولت مندوں نے امریکہ میں قدم جمائے تو اخبارات کے کاروبار کو بھی اپنے ہاتھوں میں لینے میں کامیابی حاصل کی حالانکہ اس سے پہلے اکثر بڑے اخبارات عیسائی یا غیر یہودی لوگوں کے زیر انتظام چلائے جاتے تھے۔ ایڈورٹائزنگ کمپنیاں یہودیوں کے ہاتھوں میں ہونے کی وجہ سے وہ اپنے مضبوط گروپس کے اخبارات میں اشتہارات دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔

تین بڑے یہودی روزنامے "دی نیو یارک ٹائمز"، "وال سٹریٹ جرنل" اور "واشنگٹن پوسٹ" یہودیوں کے وہ تین بڑے اخبار ہیں جو میڈیا کی فیلڈ کے مؤثر ترین اخبارات ہیں۔ یہ میڈیا کے میدان میں نئے رجحانات اور نئی گائیڈ لائنز متعین کرتے ہیں۔ یہی اخبارات ہی اس بات کا فیصلہ قومی اور عالمی سطح پر کرتے ہیں کہ بہتر کیا ہے اور کیا بہتر نہیں ہے۔ باقی لوگ ان کی نقل کرنے پر مجبور ہیں۔ 1851ء میں قائم ہونے والا نیویارک ٹائمز یہودیوں کی زیر ملکیت تھا جسے 1896ء میں ایک دولت مند یہودی ایڈالف نے خرید لیا تھا۔ شلز برجر فیملی نیویارک ٹائمز سے 33 اخبارات 12 میگزین کی مالک بنی جن میں سے ہر ایک کی دی براڈ کاسٹنگ سٹیشن، کیبل ٹی وی سسٹم اور تین پبلشنگ ادارے بھی انہی کی ملکیت ہیں۔ نیویارک ٹائمز نیوز سروس، نئی کہانیاں، فیچر وغیرہ سینکڑوں اخبارات، میگزین اور نیوز ایجنسیوں کو مہیا کرتا ہے۔ اس طرح سے ہی دی واشنگٹن پوسٹ 1877ء میں ایک غیر یہودی قائم کردہ ادارہ تھا جسے 1933ء میں اس کے دیوالیہ ہونے پر ایک یہودی فنانسر نے خرید لیا۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

"واشنگٹن پوسٹ" آج کل ایک خاتون کیتھرائن میسز گراہم کے زیرِ ملکیت چلایا جا رہا ہے۔ واشنگٹن پوسٹ کے زیرِ انتظام کئی روزنامے، میگزین، ٹی وی اور قومی سطح پر دوسرے نمبر کے میگزین چلائے جا رہے ہیں۔ وال سٹریٹ جنرل کی 18 لاکھ کاپیاں مارکیٹ میں جاتی ہیں جو امریکہ کا سب سے زیادہ سرکولیشن والا اخبار ہے۔ یہ ڈو جونز اینڈ کمپنی کی ملکیت ہے۔ نیویارک کارپوریشن 24 دوسرے روزنامے بھی چلا رہی ہے جس کے چیئرمین ڈو جونز بھی یہودی ہیں۔ دی نیویارک ڈیلی ایک یہودی رئیل سٹیٹ ڈویلپرز مور تیمر بی کی ملکیت ہے۔ دی ولیج وائس بھی ایک ارب پتی یہودی کی ملکیت ہے۔ ٹائم 41 لاکھ ہفتہ وار سرکولیشن کے ساتھ پہلے نمبر پر ہے۔ نیوز ویک 32 لاکھ کی سرکولیشن کے ساتھ دوسرے نمبر پر ہے۔ نیوز اور ورلڈ رپورٹ 23 لاکھ کی سرکولیشن کے ساتھ تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ امریکہ کے چھ سب سے بڑے پبلشرز میں سے تین یہودیوں کے کنٹرول میں ہیں۔ پہلے نمبر پر اینڈم ہاؤس آتا ہے جس کے ذیلی ادارے کراؤن، پبلشنگ اور دوسرے بڑے ادارے ہیں۔ تیسرے نمبر پر سائمن اور شسٹر اور چھٹے نمبر پر ٹائم وارنر ٹریڈ گروپ ہے۔

اپنے زیرِ تسلط ہونے کی وجہ سے ہی یہودی کمیونٹی اپنے خلاف اٹھنے والے کسی بھی طوفان کو دبانے میں کامیاب رہتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ امریکی میڈیا یا عالمی میڈیا کا یہودیوں کے کنٹرول میں ہونا ہے لیکن دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالت میں ظلم، ناانصافی اور زیادتیوں کو صرف میڈیا کے ذریعے ہی دبانا اور اپنے آپ کو سچا ثابت کرنا لیکن مظلوم کی آواز کو بلند نہ ہونے دینے کا ڈرامہ زیادہ عرصہ تک چلتا نظر نہیں آتا۔

■

ڈائجسٹوں کی دنیا کے معروف قلم کار

یہ دیا نہ بجھنے پائے

محمد سلیم اختر

☆ سلیم اختر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بہت سادہ اور سہل لکھتے ہیں اس لئے ان کی تحریر قاری کے دل و ذہن سے براہِ راست مکالمہ کرتی ہے۔

منزہ سہام، ایڈیٹر دوشیزہ و سچی کہانیاں

☆ محمد سلیم اختر نثری کائنات میں ایک معتبر نام ہے۔ انہیں قارئین کو اپنے فن میں منہمک رکھنے کا فن آتا ہے۔

ایم اے راحت

☆ محمد سلیم اختر کہانی اور قاری کے ذہن پر غضب کی گرفت رکھتے ہیں۔

اعجاز احمد نواب

☆ میں سلیم اختر کی کہانیوں کے بغیر پرچہ کو نامکمل تصور کرتا ہوں۔

پرویز بلگرامی
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کراچی

قریبی بک سٹال سے حاصل کریں۔ یا بذریعہ V.P.P طلب فرمائیں۔

نواب سنز پبلی کیشنز

Ph: 051-5555275 ۔ U/192 ۔ کمرشل مارکیٹ، راولپنڈی

ضربِ سکندری

بنگلہ دیش کا اعلانِ آزادی

27 مارچ کی رات کو میجر ضیاء الرحمٰن نے شیخ مجیب الرحمٰن کی طرف سے بنگلہ دیش کے لئے اعلانِ آزادی کیا اور خود آزاد بنگلہ دیش آرمی کا کمانڈر انچیف اور گرفتار شیخ مجیب الرحمٰن کی واپسی تک بنگلہ دیش کا صدر بن گیا۔

☆ ---------- سکندر خان بلوچ

بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کرنے والا پہلا شخص میجر ضیاء الرحمٰن تھا جو بعد میں بنگلہ دیش آرمی کا چیف آف آرمی سٹاف، مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر بنگلہ دیش بنا اور بعد میں ان کی مسز خالدہ ضیاء بھی وزیرِ اعظم بنیں۔ میجر ضیاء الرحمٰن سے میری واقفیت پاکستان ملٹری اکیڈمی میں 1967ء میں ہوئی جب اس کی پوسٹنگ وہاں ہوئی اُس دور میں اکیڈمی میں آفیسرز کی تعداد بہت کم ہوتی تھی اس لئے سب ایک دوسرے سے گھل مل کر ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔ زیادہ تر آفیسرز شادی شدہ تھے جو اپنی فیملیز کے ساتھ علیحدہ علیحدہ رہائش پذیر تھے۔ میجر ضیاء الرحمٰن بھی شادی شدہ تھا اور فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ ہماری طرح غیر شادی شدہ آفیسرز محض چند ایک ہی تھے جو آفیسرز میس میں رہتے تھے۔

کم آفیسرز ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ایک معمول تھا۔ رمضان المبارک میں تقریباً روزانہ کسی نہ کسی شادی شدہ آفیسر کے گھر افطاری ہوتی اور سب وہاں اکٹھے ہوتے۔ خوب گپ شپ لگتی۔ اتوار کے دن آفیسرز کے لئے سپیشل سینما شو ہوتا تو وہاں بھی تمام آفیسرز اور فیملیز کی ملاقات ہو جاتی۔ اُس دور کے بہت

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے جونیئر آفیسرز بعد میں اعلیٰ مقام تک پہنچے اور کچھ تاریخ ساز شخصیتیں ثابت ہوئیں اُن میں ایک میجر ضیاء الرحمٰن بھی تھا۔ یہ تقریباً دوسال وہاں رہا لیکن بہت سنجیدہ بلکہ مغرور قسم کا انسان تھا۔ ہم جیسے جونیئر آفیسرز سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے شاید ہی کبھی اسے کھل کر ہنستے ہوئے یا گپ لگاتے ہوئے دیکھا ہو لیکن بنگالی آفیسرز کی بات دوسری تھی۔ ان کی مسز جو اس وقت محض بھابی خالدہ تھیں زیادہ ہنس مکھ اور باوقار خاتون تھیں۔ اب جب کبھی بھی میں میجر ضیاء الرحمٰن کے اس دور کے رویے پر غور کرتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ شاید اس وقت بھی یہ مغربی پاکستانیوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔

میجر ضیاء الرحمٰن پاکستان ملٹری اکیڈمی کا تربیت یافتہ آفیسر تھا اور پیشہ ورانہ طور پر دلیر اور قابل آفیسرز میں شمار ہوتا تھا۔ اگر متحدہ پاکستان رہتا تو یقیناً یہ فوج کے اعلیٰ مقام تک پہنچتا۔ اس کا تعلق 8 ایسٹ بنگال رجمنٹ سے تھا جو مارچ 1971ء میں جب فوجی کارروائی کا حکم ملا تو چناگانگ میں مقیم تھی۔ میجر ضیاء الرحمٰن یونٹ کا سیکنڈ اِن کمانڈ تھا۔ مغربی پاکستان کے لیفٹیننٹ کرنل عبدالرشید جنجوعہ (شہید) یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر تھے۔ چناگانگ میں چونکہ ایسٹ بنگال رجمنل سنٹر بھی تھا اس لئے پورے مشرقی پاکستان میں سب سے زیادہ بنگالی فوجیوں کی تعداد بھی چناگانگ میں ہی تھی۔ بدقسمتی سے سب سے زیادہ سویلین مغربی پاکستانیوں اور بہاریوں کی تعداد بھی چناگانگ ہی میں تھی جو وہاں مختلف سروسز۔ کاروبار یا مزدوری وغیرہ کرتے تھے اور مزید بدقسمتی یہ کہ وہاں مغربی پاکستانی فوج کی تعداد سب سے کم تھی۔ اسی لئے وہاں مغربی پاکستانیوں اور بہاریوں کا قتل عام بہت زیادہ ہوا اور انہیں سخت اذیتیں دے دے کر مارا گیا۔ مختلف ذرائع کے مطابق تقریباً بیس ہزار بے گناہ لوگ بنگالیوں کے ہاتھوں چناگانگ میں قتل ہوئے یا سخت زخمی ہوئے۔

25 مارچ 1971ء کو جب سیاسی بات چیت ناکام ہوئی اور فوجی کارروائی کا اعلان ہوا تو تمام بنگالیوں نے مغربی پاکستانیوں کے خلاف مسلح بغاوت کردی جس کے لئے وہ پہلے ہی سے تیار تھے۔ انہوں نے بہاریوں اور مغربی پاکستانیوں پر قیامت ڈھا دی اور درندگی کے وہ مظاہرے کئے جن کے سامنے چنگیز خان اور ہلاکو خان کے مظالم بھی شرما جائیں۔ 26 مارچ کو چناگانگ کی بندرگاہ پر مغربی پاکستان سے کچھ سامان لے کر ایک بحری جہاز پہنچا۔ اطلاع ملی کہ مکتی باہنی کے غنڈے وہ جہاز لوٹنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ لہٰذا کرنل جنجوعہ نے میجر ضیاء الرحمٰن کو بھیجا کہ وہ ذاتی طور پر بندرگاہ پر جائے اور اپنی نگرانی میں سامان اتروائے۔ میجر ضیاء کے مکتی باہنی اور تحریک آزادی بنگلہ دیش کے مسلح کارکنوں سے پہلے سے رابطے تھے۔ بندرگاہ پر جانے کی بجائے یہ سیدھے ان کے ہیڈکوارٹر پہنچے۔ بغاوت اور قتل و غارت کے لئے سیکٹر کمانڈرز پہلے ہی مقرر کر رکھے تھے جنہیں اس نے فوری طور پر کارروائی کا حکم دیا اور خود واپس یونٹ میں آگیا۔ چند سپاہیوں کے ساتھ کمانڈنگ آفیسر کے بنگلے پر پہنچا اُسے زیرِ حراست لے کر دفتر لے آیا۔ وہاں اسے کرسی کے ساتھ باندھ کر اس کے اردلی سے اذیت ناک طریقے سے اسے شہید کروادیا۔ یونٹ کی کمان خود سنبھال لی اور بغاوت کا اعلان کردیا جس کے لئے پہلے ہی یونٹ کو اس نے تیار کر رکھا تھا۔

یاد رہے کہ یہ تمام کی تمام یونٹ بنگالی سپاہیوں پر مشتمل تھی جو چند مغربی پاکستانی آفیسرز یا جے سی اوز تھے انہیں بھی شہید کردیا گیا۔ یونٹ کو اس نے مختلف بغاوتی کارروائیوں پر روانہ کیا اور خود چند سپاہیوں کے ساتھ ریڈیو سٹیشن پہنچا جس پر پہلے ہی مکتی باہنی کا قبضہ تھا۔ لہٰذا 27 مارچ کی رات کو اس نے شیخ مجیب الرحمٰن کی طرف سے بنگلہ دیش کے لئے اعلان آزادی کیا کیونکہ شیخ

صاحب اس وقت تک گرفتار ہو چکے تھے۔ خود آزاد بنگلہ دیش آرمی کا کمانڈر اِن چیف اور شیخ مجیب کی واپسی تک صدر بنگلہ دیش بن جانے کا اعلان کیا۔

Announcement of the Independence of Bangladesh made by Major Zia-ur-Rahman, Second-in-Command of 8 East Bengal Regiment, on March 27, 1971.

a. "I Major Zia, provisional commander-in-chief of the Bangladesh Liberation Army, hereby proclaim, on behalf of Sheikh Mujibur Rahman, the independence of Bangladesh."

b. "I also declare, we have already formed a sovereign, legal government under Sheikh Mujibur Rahman which pledges to function as per law and the constitution."

c. "The new democratic government is committed to a policy of non-alignment in international relations. It will seek friendship with all nations and strive for international peace."

d. "I appeal to all governments to mobilize public opinion in their respective countries against the brutal genocide in Bangladesh."

e. The government under Sheikh Mujibur Rahman is sovereign legal government of Bangladesh and is entitled to recognition from all democratic nations of the world."

اس اعلان کے ساتھ ہی اِسے یہ اندازہ تھا کہ چناگانگ میں جو بھی تھوڑے بہت مغربی پاکستانی فوجی ہیں وہ جلد یا بدیر ضرور ریڈیو سٹیشن پر قبضہ کرلیں گے۔ لہٰذا اس نے فوری طور پر ''سوادھین بنگلہ بیتار کیندرا'' (آزاد بنگال ریڈیو سٹیشن) کے نام سے ایک علیحدہ نشریاتی سٹیشن قائم کیا۔ یہ ریڈیو سٹیشن کاکسز (Cox's) بازار کے نزدیک کلورگھاٹ کے علاقے میں قائم کیا گیا تھا۔ وہاں اس نے باقاعدہ نشریات کا آغاز کیا جس میں پاکستان آرمی کے بنگالیوں کے خلاف مبینہ مظالم کی خوفناک کہانیاں سنائیں اور حکم دیا کہ پاکستان فوج اور پاکستانی لوگوں کے خلاف ہر بنگالی اٹھ کھڑا ہو اور اپنے خلاف ہونے والے مظالم کا بدلہ لے۔ کسی پاکستانی کو زندہ نہ چھوڑے نیز یہ بھی اعلان کیا کہ آزاد بنگلہ دیش فوج اس وقت پاکستان فوج کے خلاف برسرِ پیکار ہے اور پاکستان فوج برے طریقے سے شکست کھا کر بھاگ رہی ہے۔ انہیں مت چھپنے دیں بلکہ آگے بڑھ کر ختم کردیں۔ ایک بھی بچنے نہ پائے۔

مزید یہ کہ پاکستانی فوج بنگالیوں سے بہت خوفزدہ ہے۔ وہ مختلف مقامات پر مارکھا کر ہتھیار ڈال رہی ہے۔ انہیں ختم کردیں۔ اس اعلان کا بنگالیوں پر بہت اثر ہوا۔ پورا مشرقی پاکستان خون میں نہا گیا۔ بھارت جو ایسے موقعہ کے انتظار میں تھا، نے باغیوں کی بھرپور طریقے سے مدد کی اور نومبر 1971ء میں حملہ کرکے پاکستان کو دولخت کردیا۔ کچھ رپورٹس کے مطابق بنگالیوں نے تقریباً ایک لاکھ بہاری اور مغربی پاکستانی قتل کئے۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اگر یہ دنیا عارفوں اور عالموں کے لئے ہوتی تو جاہل کیوں اس پر لوٹ پوٹ ہوتے اور اگر یہ پہلے کے تصرف میں باقی رہتی تو دوسرے کو کیسے منتقل ہوتی؟

حکمت و موعظت

نسیم سلیم صدف

☆ مکرم بن یوسف جو اپنے وقت کے بلند پایہ عابد و زاہد تھے، روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبی پر وحی نازل فرمائی کہ بڑے بڑے شہروں اور قلعوں میں جاؤ اور میری طرف سے دو باتیں انہیں بتا دو۔

1-صرف طیب چیز کھاؤ

2-ہمیشہ سچ بولو۔

ایک مرتبہ یزید الرقاشی عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے فرمایا۔ "یزید کوئی کلمہ نصیحت سناؤ"۔

انہوں نے کہا۔ "اے امیر المومنین! صفحہ ارض پر سب سے پہلے جو مرتبۂ خلافت پر فائز ہوا تھا، موت نے اُس بھی نہ چھوڑا"۔

عمر بن عبدالعزیز پر گریہ طاری ہو گیا اس انہوں نے فرمایا۔ "اے یزید! کچھ اور"۔

وہ کہنے لگے۔ "آپ کے اور آدم کے درمیان جو چیز حائل ہے وہ صرف موت ہے"۔

عمر بن عبدالعزیز نے روتے ہوئے کہا۔ "اے یزید! کچھ اور"۔

انہوں نے کہا۔ "اے امیر المومنین! جنت اور دوزخ کے مابین کوئی درمیانی منزل نہیں ہے"۔

عمر بن عبدالعزیز نے یہ سنا اور فرط تاثر سے بے ہوش ہو گئے۔

پس اے انسان! یاد رکھ اس دنیا کے پیچھے وہی لپکتا ہے جو عقل سے محروم ہے۔ اس کے لئے وہی جھگڑتا ہے جو اس کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ اس کی زیب و زینت سے متاثر ہو کر وہی مبتلائے حسد ہوتا ہے جو فہم و دانش سے کورا ہے۔ جس نے اس دنیا کو پا لیا وہ گھاٹے میں رہا۔ اس کے حلال کا حساب دینا پڑے گا۔ اس کا حرام موجب عتاب ہے جو اس کے پیچھے دوڑا اسے یہ دھتکار دیتی ہے اور جو اس سے استغنا برتتا ہے اس کے پیچھے خود دوڑتی ہے۔ نہ اس کے خیر کو دوام ہے نہ اس کا شر باقی رہنے والا ہے۔ نہ یہاں کا کوئی جاندار ہمیشہ زندہ رہے گا، آج جو کچھ تیرے پاس ہے وہ کسی کی موت کے بعد ہی تیرے ہاتھ آیا تھا اور یہ تیرے ہاتھ سے بھی اس طرح نکل جائے گا جس طرح تیرے پیش رو کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اگر یہ دنیا عارفوں اور عالموں کے لئے ہوتی تو جاہل کیوں اس پر لوٹ پوٹ ہوتے اور اگر یہ پہلے کے تصرف میں باقی رہتی تو دوسرے کو کیسے منتقل ہوتی؟ زائل ہو جانے والی چیز پر فخر بھی کوئی فخر ہے، باقی نہ رہنے والی چیز پر نازش کوئی معنی نہیں رکھتی۔

☆ خلیفہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ابن السماک سے اس حالت میں کہ پانی کا کٹورا اس کے ہاتھ میں تھا کہا۔ "کچھ نصیحت کیجئے"۔

ابن السماک نے کہا۔ "امیر المومنین! اگر آپ پر پانی بند کر دیا جائے تو کیا آپ اسے حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری حکومت دینے پر تیار نہیں ہو جائیں گے؟"

ہارون الرشید نے جواب دیا۔ "ہاں، بے شک ساری حکومت ایک گھونٹ پانی کے لئے دے ڈالوں گا"۔

ابن السماک نے کہا۔ "اور اے امیر المومنین! اگر اس پانی کا اخراج رُک جائے یعنی پیشاب بند ہو جائے تو کیا اس کے لئے بھی آپ اپنی ساری حکومت دے ڈالنے پر تیار نہیں ہو جائیں گے؟"

ہارون الرشید نے جواب دیا۔ "ہاں بے شک میں ایسا کر گزروں گا"۔

ابن السماک نے کہا۔ "پھر اس حکومت سے بھلا کیا فائدہ جس کی قیمت ایک قطرۂ آب اور ایک قطرۂ پیشاب سے بھی کم ہے"۔

اے سرمست شباب نوجوان! اپنی جوانی پر نہ پھول، اکثر مرنے والے جوانی ہی میں مرتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بوڑھوں کی تعداد جوانوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ کتنے بچے اور نوجوان ہیں جو گوشۂ قبر میں جا سوئے مگر ان کے نانا اور دادا ابھی زندہ ہیں۔

☆.....علی ابن ابی طالب رضوان اللہ علیہ نے ایک نومسلم سے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔ "کوئی اچھی بات سناؤ"۔

وہ کہنے لگا۔ "اگر خدا آپ سے خفا ہو جائے تو کوئی ہے جس سے آپ لو لگا سکیں؟"

فرمایا۔ "بہت خوب لیکن کچھ اور بھی تو کہو"۔

اس نے کہا۔ "اگر خدا آپ کے ساتھ ہو پھر بھی آپ کسی سے خائف ہو سکتے ہیں؟"

فرمایا۔ "بہت خوب کچھ اور بھی کہہ سکو تو کہو"۔

اس نے کہا۔ "فرض کر لیجئے، خدا تمام گنہگاروں کو معاف کر دیتا اور ان کی خطائیں بخش دیتا ہے تو بھی نیکوکاری کا ثواب تو گیا"۔

فرمایا۔ "ہاں، تم نے سچ کہا اور یہ میرے لئے بہت کافی ہے"۔ آپ پر گریہ طاری ہو گیا اور پورے چالیس دن تک آپ کی یہی کیفیت رہی۔

☆.....سلیمان بن عبدالملک نے ایک مرتبہ حمید الطویل سے کہا۔ "میں آپ کی نصیحت کا جویا ہوں، کچھ فرمایئے"۔

حمید الطویل نے جواب دیا۔ "اگر تم گناہ کرتے ہو اور تمہارا یہ عقیدہ ہے کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے تو تم نے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

رب عظیم کے مقابلے میں بہت زیادہ جرأت دکھائی اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ نہیں دیکھ رہا ہے تو تم نے کفر کا ارتکاب کیا"۔

☆......ایک مرتبہ علیؓ بن حسینؓ (امام زین العابدین) نے سلیمان کو لکھا۔"دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے کہ ہاتھ لگاؤ تو نرم اور ملائم لیکن یہی نرم اور ملائم سانپ جب ڈس لیتا ہے تو اس کا زہر قاتل ثابت ہوتا ہے۔ پس دنیا کی زیب و زینت سے حذر کرو"۔

☆......ابن شبرمہ کا قول ہے۔"بدن اگر بیمار ہے تو غذا اسے فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور دل اگر دنیا کی محبت میں گرفتار ہے تو موعظت اور تذکیر سے اسے کوئی نفع نہیں حاصل ہو سکتا۔

☆......اصمعی سے روایت ہے کہ نعمان یعنی امرؤالقیس اکبر نے ایک بہت بڑا قلعہ تعمیر کیا۔ اسے اپنی مملکت کی وسعت پر اقتدار و اختیار پر، شوکت و سطوت پر اور عروج و اقبال پر بڑا ناز تھا۔ اس نے اپنے ایک مصاحب سے جو مرد دانا و حکیم تھا پوچھا۔

"کیا میری طرح کسی اور کو بھی یہ شوکت و قوت حاصل تھی؟"

اُس مرد حکیم نے جواب دیا۔"کیا یہ جو کچھ آپ کے پاس ہے لازوال ہے؟ یا یہ ایسی چیز ہے جو پہلے کسی اور کے پاس تھی اور اب آپ کے پاس آئی ہے؟"

نعمان نے جواب دیا۔"ہاں، یہ سب کچھ پہلے کسی اور کے پاس تھا اب میرے ہاتھ آیا ہے"۔

مرد حکیم نے کہا۔"کیا آپ ایسی چیز پر نازاں ہیں جو آپ سے (کبھی نہ کبھی) چھن جائے گی؟"

نعمان نے سوال کیا۔"پھر جائے قرار بھی کوئی ہے؟"

اس نے جواب دیا۔"ہاں، اگر آپ احکام الٰہی کی پیروی کریں، اس کی عبادت کو اپنا شعار بنائیں اور خوشامد پسندوں سے دور بھاگیں تو عافیت حاصل ہو سکتی ہے!"

نعمان نے سوال کیا۔"پھر کیا ہوگا؟"

حکیم نے جواب دیا۔"وہ زندگی جو موت سے ناآشنا ہوگی، وہ شباب جس پر بڑھاپا طاری نہیں ہوگا، وہ صحت جو کبھی بیماری سے دوچار نہ ہوگی، وہ قوت و شوکت جو کبھی زوال آشنا نہ ہوگی"۔

نعمان حکمت اور دانش کی ان باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ راج پاٹ چھوڑ خدا کی عبادت اور بندوں کی خدمت میں ساری زندگی گزار دی۔

ضبط نفس

ضبط نفس کے معنی اپنی جان کو قابو میں رکھنے کے ہیں اور حلم کے معنی برداشت کرنے کے۔ جو شخص غصے کی حالت میں اپنے آپ پر قابو رکھے، وہ حلیم اور بردبار کہلاتا ہے۔ یہ خصلت پیغمبروں اور اللہ کے خاص بندوں کی ہے جنہوں نے تبلیغ اسلام میں دشمنوں سے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں اور کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ بردباری سے ایک شخص دوسرے کو اپنا غلام بنا لیتا ہے۔ دشمن دوست ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فضل کرتا ہے، اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ تیرے بندوں میں سب سے زیادہ کون سا بندہ اچھا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا جس میں بدلہ لینے کی طاقت ہو اور وہ معاف کر دے۔

ایک جنگ سے جب ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوٹے تو آپؐ نے فرمایا۔"ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹے"۔ لوگوں نے عرض کیا۔"بڑا جہاد کون سا ہے؟" فرمایا۔"اپنے نفس (جی) کے ساتھ جہاد کرنا، کیوں کہ تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے"۔

❁❁❁

المیہ مشرقی پاکستان

جو قومیں اپنی ماضی کی غلطیوں سے سبق نہیں سیکھتیں، وہ دنیا میں بے حیثیت ہو جاتی ہیں اور پھر تاریخ انہیں فراموش کر دیتی ہے۔ ہمیں بحیثیت قوم اس لیے کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

☆---------------------- 0345-8599944, 0301-3005908 --------- گلزار اختر کاشمیری

دسمبر کا مہینہ آ گیا، میرے وطن کو دو لخت ہوئے 43 سال ہو چکے مگر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو نہیں بھول سکا۔ پاکستان اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ملک تھا مگر اب تیسرے نمبر پر آ گیا ہے مگر مجموعی طور پر ہماری پوری قوم کو اس نقصان کا کوئی زیادہ احساس نہیں اور نہ ہی اس نقصان کا کوئی زیادہ افسوس ہے۔ جیسے یہ ایک بوجھ تھا جو اتر گیا۔ زندہ قومیں اپنے نقصانات کا جائزہ بھی لیتی ہیں، نقصان ہونے کی وجوہات کا جائزہ بھی لیتی ہیں اور آئندہ کے لئے اس کا تدارک بھی کرتی ہیں۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ دشمن نے بلوچستان کو پھر ڈھاکہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ اسی طرح "مکتی باہنی" بنائی جا رہی ہے۔ وہی سارا منظر ہے جو 1971ء میں مشرقی پاکستان میں تھا۔ ذیل میں ہم ان عوامل کا جائزہ لیتے ہیں کہ آخر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب کیا تھے۔ یہ ملک جو وجود میں آ رہی تھی اس وقت کے لوگوں کا نعرہ تھا— "پاکستان کا مطلب کیا...... لا الہ الا اللہ"۔

پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم قربانیوں کے بعد حاصل ہوا تھا۔ ان علاقوں کے لوگوں نے بھی حصول پاکستان کے لئے قربانیاں دیں جو پاکستان کے نقشے میں آئے اور ان علاقوں کے لوگوں نے بھی بہت قربانیاں

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دیں جن کو معلوم تھا کہ ان کا علاقہ پاکستان میں شامل نہیں ہوگا۔ اس طرح مشرقی بنگال کے لوگوں نے بھی بے پناہ قربانیاں دیں۔ مشرقی بنگال تو ہمیشہ سے مسلم اکثریت کا علاقہ رہا ہے۔ 1881ء کی مردم شماری میں پورے ہندوستان میں چار کروڑ دس لاکھ مسلمان تھے جبکہ ان میں سے ایک کروڑ اٹھہتر لاکھ تریسٹھ ہزار مسلمان صرف بنگال میں تھے۔ 1905ء میں جب انگریز نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کیا تو مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچنے کا امکان پیدا ہوا تو ہندوؤں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ 7 اگست 1905ء کو مہاراجہ معتد چندر نندی نے ایک احتجاجی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ نئے صوبہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور ہندو محدود تعداد میں ہیں اگر یہ صوبہ برقرار رہا تو ہم اپنی ہی سرزمین میں اجنبی بن جائیں گے۔

کانگریس نے تقسیم بنگال کی سخت مخالفت کی اس وجہ سے 30 دسمبر 1906ء کو ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس ہوئی۔ جس میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس اجلاس میں برصغیر کے کونے کونے سے مسلمان سرکردہ شخصیات نے شرکت کی جن میں نواب سلیم اللہ خان ڈھاکہ نواب علی چوہدری بوگرہ بنگال جسٹس شاہ دین لاہور مولانا ظفر علی خان لاہور اور مولانا محمد علی جوہر نے بھی شرکت کی تھی۔ تو گویا مسلم لیگ جو برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تھی اس کا آغاز ڈھاکہ سے ہوا 23 مارچ 1940ء کو لاہور مینار پاکستان کے مقام پر جلسہ عام میں قرارداد پاکستان پیش کرنے والے مولوی فضل حق کا تعلق بھی مشرقی بنگال سے تھا۔ 1946ء کے انتخابات جو پاکستان پر ریفرنڈم کی حیثیت رکھتے تھے 96 فیصد بنگالیوں نے قیام پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ مسلم لیگ کو ان انتخابات میں جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی وہ بنگال کے مسلمانوں کے صحیح جذبات کا مظہر تھی۔ مسلمانوں نے آسام کی 34 نشستوں میں سے 31 نشستیں جیت لیں۔ اس وقت سہلٹ آسام کا حصہ تھا اور بنگال یک ایک سو اکیس نشستوں میں سے ایک سو انیس پر شاندار کامیابی حاصل کر لی تھی۔ بنگال کی اسلام اور پاکستان کے لئے یہ والہانہ محبت کسی جذباتی یا وقتی وابستگی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلم بنگال کے عوام نے انگریزوں اور ہندوؤں کے ظلم وستم کا بھرپور مقابلہ کیا اور جب منزل متعین ہوگئی اور رہنمائی میسر آگئی تو پھر وہ دیوانہ وار منزل کی جانب دوڑ پڑے۔ راستے کی مشکلات ان کا راستہ نہ روک سکیں اور پاکستان بن گیا۔ مشرقی بنگال اور سہلٹ باہم ملا دیئے گئے۔

انگریزوں نے یہاں بھی ڈنڈی ماری اور کلکتے کو مغربی بنگال میں شامل کر لیا۔ اب سوچنے کا مقام یہ ہے کہ جو بنگال حصول پاکستان کے لئے پیش پیش رہا تئیس سال میں وہ کیا وجوہات پیش آئیں کہ یہاں کے بنگالی مسلمان مغربی پاکستان کے بھائیوں کے خلاف ہو گئے اور اسلامی رشتہ ختم کر کے بنگالی ازم پر متفق ہو گئے۔ میں تقریباً نو ماہ مشرقی پاکستان میں رہ کر آیا ہوں۔ مختلف مکتب فکر کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ ان میں پڑھے لکھے لوگ بھی تھے اور اَن پڑھ بھی۔ سرکاری افسران بھی تھے اور بیوروکریٹ بھی۔ سیاسی جماعتوں کے لوگوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور سماجی شخصیات سے بھی۔ اساتذہ بھی ملے اور ہر طرح کے طالب علم بھی۔ اس موضوع پر مختلف مضامین بھی پڑھے اور کتابیں بھی مگر ان مضامین اور کتب میں کافی تشنگی محسوس ہوئی۔ میرا دعویٰ نہیں کہ میں نے اس کا حق ادا کر دیا نہ ہی کسی چھوٹے سے مضمون میں اس ساری حقیقت کو واضح کیا جا سکتا ہے اس کے لئے تو ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ میں نے جو کچھ اخذ کیا وہ مختصر حاضر ہے یہ صرف اشارے ہیں تفصیل نہیں۔

بیوروکریسی کا ناروا رویہ

نفرت کا سب سے پہلا بیج ہمارے ان سرکاری افسران نے بویا جو قیام پاکستان کے بعد سرکاری افسران مشرقی پاکستان میں گئے۔ ان کی ایک اچھی خاصی تعداد نے وہاں کچھ اچھا رویہ اختیار نہ کیا۔ وہ انگریز کے تربیت یافتہ تھے انہوں نے انگریزوں کے اس طرز عمل کی نقل اتاری جو وہ غیر قوم پر حکومت کرنے پر اختیار کرتا تھا۔

یہ وہ سبب ہے جس نے چند سال کے اندر مشرقی پاکستان کے عام باشندوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ ان کو ایک نو آبادی بنا کر رکھا گیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ لوگ اردو بولنے والے تھے۔ چاہے وہ مغربی پاکستان سے گئے، بھارت سے ہجرت کر کے آئے تھے، مشرقی پاکستان کے عام لوگ اردو کو مغربی پاکستان کی زبان سمجھتے تھے۔ اس لئے وہاں کے عوام نے یہ سمجھا کہ اصل پاکستان تو مغربی پاکستان ہے۔ ہم اس کی ایک کالونی بنائے گئے ہیں۔ یہ باتیں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کو مایوسی پیدا کرنے کا موجب بنیں اور نفرت پیدا کرنے کا بھی۔

قیام پاکستان کے وقت پاکستان کے حصے میں آنے والے 83 انڈین سول سروس کے افسران میں سے صرف ایک بنگالی افسر تھا۔ باقی جو لوگ تھے وہ مغربی پاکستان سے تھے یا پھر انڈیا سے ہجرت کر کے آئے تھے مگر تھے وہ اردو بولنے والے۔

1948ء میں مشرقی پاکستان سے 11.01 فیصد سول آفیسر لئے گئے جبکہ 1958ء تک یہ تعداد 41.07 تک پہنچی۔ مغربی پاکستان کا تناسب 88.90 سے 58 فیصد تک آیا۔ پھر 1958ء سے 1962ء کے درمیان ایوب خان کے دور میں فیصلہ ہوا کہ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسران کو مشرقی پاکستان میں رکھا جائے۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان میں نکلنے والی پوسٹوں پر وہاں ہی کے آفیسر رکھے گئے۔

تعلیمی پالیسی کا فقدان

مشرقی پاکستان میں حکومت جن عقلمند لوگوں کے ہاتھوں میں رہی انہوں نے وہاں پیدا ہونے والے مسائل کا علاج یہ سوچا کہ موسیقی، رقص و سرود اور کھیل کود کا قوم کو رسیا بنایا جائے۔ ان کے دل و کان فتنہ پردازوں کی باتیں سننے کے لئے فارغ نہ تھے اور نت نئے مطالبات سامنے آنے پر آنکھیں بند بلکہ امر واقعہ یہ ہے اور معتبر ذرائع نے اس کی تصدیق کی ہے۔ فتنے کے علاج کا یہ حکیمانہ نسخہ ہمارے افلاطونوں نے خوب سوچ سمجھ کر مرتب کیا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی ان اسباب کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کی فکر نہ کی جو مشرقی پاکستان میں بے چینی کے حقیقی موجب بنے۔ کسی نے یہ نہ دیکھا کہ ہم اپنے کالجوں میں نوجوانوں کو کیا تعلیم دے رہے ہیں اور کس قسم کے لوگوں کے ذریعے یہ تعلیم دے رہے ہیں اور اس کے فطری نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ کسی نے اس لٹریچر پر نگاہ نہ ڈالی جو ملک کے اندر ہی سے نہیں بلکہ باہر مغربی بنگال سے آ کر یہاں پھیلاتا رہا۔ کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی اس اشاعت کا آخر کار نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ ساری فکریں تو دماغ کو تکلیف دینے والی تھیں۔ آسان تدابیر اس کے سوا کون سی تھی کہ بلبل اکیڈمیوں کی طرز پر کچھ ادارے قائم کر دیئے جائیں جس سے عوام کا دل بھی بہلے اور حکمرانوں کا بھی۔

زبان کا مسئلہ

مشرقی پاکستان میں جب یہ اعلان ہوا کہ ملک کی قومی زبان اردو ہوگی تو بھارت نواز ہندوؤں نے طلبہ میں یہ مؤقف اچھالا کہ ملک کی قومی زبان اردو ہوگی تو بنگالی بولنے والے لوگ کبھی ترقی نہیں کر سکیں گے۔

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

مشرقی پاکستان میں ان پُر جوش طلبہ کے جذبات کو سب سے پہلے ہندوؤں نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ چنانچہ ان میں بالخصوص اس تاثر کو گہرا کیا گیا کہ مرکزی حکومت میں جس میں پنجابیوں اور مہاجرین کا غلبہ ہے اکثریتی آبادی کے صوبے کو اس کی مادری زبان سے محروم کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ انہوں نے زبان کے مسئلے پر ذرا برابر نرمی دکھائی تو اردو بولنے والے غیر بنگالی ان کے حقوق غصب کر لیں گے اور تمام کلیدی آسامیوں پر ان کا ہی قبضہ اور تصرف ہوگا۔ طلبہ کے جذبات اس حد تک برانگیختہ کر دیئے گئے کہ وہ قائداعظمؒ کی بات سننے کے روادار نہ رہے۔ 20 مارچ 1948ء کو جب قائداعظمؒ ڈھاکہ تشریف لے گئے اور انہوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ صرف اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہوگی۔ 24 مارچ 1948ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں اساتذہ اور طلبہ کے خصوصی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے جب قائداعظمؒ نے پھر دہرایا کہ پاکستان کی واحد سرکاری زبان اردو ہوگی تو اس کے ساتھ ہی ہال میں آواز گونجی نہیں، نہیں۔ طلبہ کے اس گروہ کی قیادت طالب علم رہنما شیخ مجیب الرحمان کر رہا تھا۔ جسے مسٹر حسین سہروردی کی حمایت حاصل تھی۔ رفتہ رفتہ ڈھاکہ یونیورسٹی کیمپس بنگلہ زبان کی حمایت میں منعقد ہونے والے اجتماعی مظاہروں کا مرکز بن گیا جس کے نتیجے میں 21 فروری 1952ء کو ڈھاکہ پولیس کی فائرنگ کا المناک واقعہ رونما ہوا۔ پولیس فائرنگ سے تین طالب علم مارے گئے۔ یہ واقعہ جلتی پر تیل کا کام کر گیا۔ شر پسند عناصر کو یہی مطلوب تھا۔ اب نہ صرف اردو کے خلاف بلکہ اردو بولنے والوں کے خلاف بھی جذبات نشوونما پانے لگے۔ آخرکار 1962ء کے دستور میں بنگلہ زبان کو اردو کے ساتھ دوسری سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا۔ مشرقی پاکستان ہندوؤں نے اور کمیونسٹوں نے اس کامیاب لسانی تحریک سے درج ذیل نتائج اخذ کئے وہ یہ تھے۔

1- عوام کو لسانی مسائل کے ذریعے آسانی سے ایکسپلائٹ کیا جا سکتا ہے۔

2- کسی بھی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے تشدد ضروری ہے۔

3- کسی بھی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے پاکستان میں طلبہ سب سے زیادہ مؤثر گروہ ہیں۔

4- کسی بھی ایسی تحریک کو قوت کے ذریعے دبایا نہیں جا سکتا جس میں طلبہ سرگرمی سے حمایت میں کھڑے ہو جائیں۔

ہندو اور کمیونسٹ جس زبان کے لئے لڑ رہے تھے وہ مسلم بنگلہ تھی بلکہ یہ وہ زبان تھی جس کی تخلیق کلکتہ کے فورٹ ولیم میں ہندو براہمنوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس کی ترقی و ترویج کے لئے بنگالی اکادمی قائم ہوئی اس اکادمی سے کتابوں کا ایک سیلاب مشرقی پاکستان کی مارکیٹوں میں آیا اس لٹریچر سے مشرقی پاکستان میں فکری انتشار بھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔

اسلامی لٹریچر کا فقدان

ڈھاکہ مسجدوں کا شہر کہلاتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہاں کے علمائے کرام بحیثیت مجموعی اثر انداز نہ ہو سکے۔ پھر ان کے دین اور سیاست علیحدگی کے تصور نے عوام کو طالع آزما سیاسی کھلاڑیوں کے سپرد کر دیا۔ جو چند لوگ دین کا صحیح تصور اور حالات کا شعور رکھتے تھے ایک دوسرے کے خلاف فتوؤں نے پاکستان کے دشمنوں اور ہندوؤں کے راستے آسان بنا دیئے۔ دراصل علمائے کرام کی ایک بڑی تعداد ملک کے حالات سے بے تعلق ہو کر اپنے مدارس میں فتوؤں میں مخصوص مذہبی و فقہی مباحث میں مشغول رہے۔ بنگلہ زبان میں اقبالؒ کا لٹریچر تھا نہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی المصنفین کی کتابیں

تھیں اور نہ ادارہ تعلیمات اسلام کی۔ نہ تو ندوۃ المصنفین کی کتب ترجمہ ہو سکیں نہ مدرسہ دارالاصلاح کی۔ ستم یہ ہے کہ اس وقت تک کسی مستند تفسیر قرآن کا ترجمہ نہ ہو سکا نہ ترجمہ قرآن پاک کا نہ کوئی سیرت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمہ ہو سکا نہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ اجمعین کی سیرت کی کتابوں کا نہ ہی اسلام کے انقلابی داعیوں کے حالات زندگی میسر تھے۔ مشرقی پاکستان میں اس وقت جو سرمایہ ادب بنگلہ زبان میں موجود تھا وہ تمام تر بنکم چند مکرجی، رابندر ناتھ ٹیگور یا ان کے زیر اثر ادیبوں کا پیدا کردہ تھا۔ ایک صاحب قاضی نذر اسلام کا نام ان کتابوں میں مسلمانوں والا نظر آیا مگر ان کا حال یہ تھا کہ انہوں نے عمر بھر ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کی حمد و ثناء میں ایسے ایسے بلند پایہ بھجن اور کیرتن لکھے تھے کہ کوئی زبردست ہندو شاعر بھی اپنے گلدستہ عقیدت میں اس معیار کے پھول پرو کر اپنے دیوتاؤں کے سامنے پیش کرنے سے قاصر تھا۔ ایسی صورت میں نوجوان نسل بنگلہ کلچر اور بنگلہ قومیت کی طرف اگر جاتی ہے تو اس کا گلہ شکوہ کسی بات کا اشتراکیت کی طرف جائے یا بنگلہ قومی تعصب کا شکار ہو جائے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔

تعلیم کا المیہ

قیام پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان میں 1290 ہائی سکول تھے اور 47 کالجوں میں 95 فیصد ادارے ہندوؤں کے پرائیویٹ انتظام میں تھے جبکہ سرکاری سکولوں میں بھی ہندو اساتذہ کا تناسب زیادہ تھا۔ یہ اساتذہ بڑی کاوش کے ساتھ مسلمان بچوں اور نوجوانوں کے معصوم ذہنوں میں تشکیک کا زہر گھولتے رہے۔ انہوں نے اسلام اور اسلامی ثقافت کے بارے میں مسلمان طلبہ میں انتشار پیدا کیا اور اس انتشار نے بالآخر صراط مستقیم سے ہٹا دیا۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ مشرقی پاکستان میں پرائمری اور مڈل سطح کے سکول سرکاری سطح پر بنائے ہی نہیں گئے بلکہ پرائیویٹ سطح پر قائم پرائمری سکول اور مڈل سکولوں کو حکومت سالانہ گرانٹ دیتی تھی۔ تعلیمی بجٹ کا بڑا حصہ ان سکولوں پر خرچ ہوتا تھا۔ غور و فکر کی بات یہ ہے کہ 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد ہندو اساتذہ اور پروفیسروں کی بڑی تعداد جو ہائی سکولوں اور یونیورسٹیوں میں موجود تھی مشرقی پاکستان میں ہی رہی لیکن ان کی اکثریت نے اپنے خاندانوں کو مغربی بنگال بھارت میں منتقل کر دیا تھا۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں بلکہ یہ سب طے شدہ پلان تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں 90 فیصد سٹاف ہندو تھا انہوں نے نہایت ہوشیاری سے طلبہ کو ذہن نشین کرایا:۔

1- پاکستان کا معاشی طور پر قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔

2- غیر بنگالیوں کا مقصد مشرقی پاکستان کو اپنی نوآبادی بنانا ہے۔

اساتذہ کی جانب سے مسلسل ان نظریات کی تشہیر نے آخر اپنا اثر دکھایا اور بے اطمینانی نے طلبہ کے ذہنوں پر اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا۔ ایک شرمناک حقیقت تعلیم کے المیے میں تھی کہ بیشتر درسی کتب کلکتہ سے چھپ کر آتی تھیں اور ان کے مصنفین بھی مغربی بنگال سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ کتابیں 1971ء تک ہمارے سرکاری اداروں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ گویا پاکستان کی نسل پاکستان کے دشمنوں کی تصنیف کردہ نصابی کتب پڑھتی رہی۔ ہائی کلاسز کی گرامر اور کمپوزیشن کے معمولی جملے بھی اسی طرح لکھے جاتے جن میں ہندو اور مسلمان فرق کو ختم کرنا مقصود تھا۔ مثلاً "رام اچھا بچہ رحیم گندہ بچہ ہے"۔

مطالعہ پاکستان اور تاریخ کی کسی کتاب میں بھی 1940ء کی قرارداد پاکستان کا تذکرہ تک نہ تھا۔ تاریخ کی ایک کتاب دیکھی جس میں سب سے بڑی تصویر اور

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

سب سے بڑا مضمون شیواجی مرہٹہ پر تھایا ہندو نواز بادشاہ اکبراعظم کی تصویر تھی۔ اکبر کی پالیسیوں کو بہت سراہا گیا تھا۔ تاریخ پاکستان کے نصاب کی یہ حالت تھی کہ 1970ء میں کرنل بشارت سلطان جب ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے تو وائس چانسلر نے انہیں بتایا کہ تاریخ پاکستان کے یونیورسٹی نصاب کے لئے ہم نے تاریخ پاکستان کا ایک جامع نصاب مرتب کرایا تو بنگالی طلبہ نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ ہم نے کورس کم کر کے محض چار ابواب رکھے مگر طلبہ اس پر بھی تیار نہ ہوئے۔ ناچار اس کتاب کا فقط ایک ہی باب طے کیا مگر طلبہ اس پر بھی انکاری ہیں کہ ہم تاریخ پاکستان پڑھنا ہی نہیں چاہتے۔ لازمی طور پر اس ماحول میں مشرقی پاکستان سے جو نسل اٹھی ان کے اندر بنگالیت کا احساس پیدا ہوا کہ ہندو اور مسلمان پہلے بنگالی اور پھر ہندو اور مسلمان ہیں۔

بنگالی ایک قوم کا نام ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ نئی تہذیب اپنانے والی ہندو اور مسلمان خواتین میں کوئی امتیاز نہ رہا۔ مسلمان عورتیں ماتھے پر تلک لگاتی تھیں۔ مسلمان نوجوانوں اور ہندو نوجوان میں کوئی فرق نہ رہا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی سمیت تمام کالجوں میں شعوری طور پر نوجوانوں کو بنگالی قومیت پر ابھارا گیا۔ اس طرح وہاں کے مسلمان نوجوانوں میں ہندو کلچر، ہندو تہذیب اور ہندو اقدار کو بنگالی کلچر، بنگالی تہذیب اور بنگالی اقدار بنا کر پیش کیا گیا۔ جو ان نوجوانوں میں سرائیت کرگیا جس کی واضح مثال 1951ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں آل پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس ہوئی جس کے ایک اجلاس کی صدارت برصغیر کے عظیم مفکر اور مسلمان مؤرخ مولانا سید سلمان ندوی نے کی، شرکاء کی اکثریت ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ تھے۔ جنہوں نے نہ صرف جلسے کو درہم برہم کردیا بلکہ معزز مہمانوں پر حملہ آور بھی ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنی ایک کتاب میں بنگال اور ہندو تعصب اور مسلم دشمنی کی تاریخ اور مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی نشاندہی کی تھی۔ یہ ظاہرہ ارباب حکومت کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا جس سے ظاہر ہوگیا تھا کہ مشرقی پاکستان کی نوجوان نسل کس سمت میں جا رہی ہے۔ 1953ء تک ہندو اساتذہ پروفیسروں نے وہ کام کرلیا تھا جس کے لئے بھارتی حکومت نے مغربی بنگال سے انہیں واپس اپنے اپنے اداروں میں حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔ وہ ایک مشن لے کر آئے تھے اور اسی مشن کے مطابق کام کرتے رہے، ان کا مشن 6 ستمبر 1971ء کو پورا ہوگیا۔

پاکستان توڑنے والے کرداروں کا حشر

مملکت پاکستان اللہ کا عطیہ ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان بن گیا تو اس میں اللہ کا نظام نافذ کریں گے۔ اسلام کا عادلانہ نظام تو قائم نہ ہوسکا مگر پاکستان کو توڑنے کی سازش کرنے والوں اور ان کے خاندان کی تباہی کا منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پاکستان کو توڑنے والے تین کردار ڈائریکٹ تھے ان میں بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی، سابق پاکستانی وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو اور بنگلہ دیش کے سابق وزیراعظم شیخ مجیب الرحمان تینوں کا حال یہ ہوا کہ وہ اپنے ہی ملک میں اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں انجام کو پہنچے۔ ان میں سرفہرست بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کا نام ہے۔

پاکستان کو توڑنے والے تینوں ڈائریکٹ کردار تینوں قتل ہوئے تینوں کے بیٹے بھی قتل ہوئے اور تینوں کے خاندان بھی مدوجزر کا شکار ہوئے۔ پاکستان ان شاء اللہ قائم رہنے کے لئے بنا ہے اس کو توڑنے کی سازش کرنے والے تباہی سے بچ نہیں سکتے۔

❁

رفیق ڈوگر قسط:4

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

مرزا کریم بخش کے سرداروں نے اپنے سواروں کے ساتھ مغل شہنشاہ کی سفارت کا لاہور سے ایک کوس باہر نکل کر استقبال کیا اور انہیں شہر کے بازاروں میں سے گھماتے ہوئے جلوس کی صورت شاہی قلعہ لے گئے۔ بخشی غازی بیگ خان نے سفارت کو دہلی دروازہ کے سامنے خوش آمدید کہا۔ نادر بیگ نے مہمان خانے تک ان کی رہنمائی کی۔

میر مومن خان اور ان کے ساتھی وہ رات بھی سو نہ سکے، وہ سوچتے رہے کہ مغلانی بیگم اب کیا چال چلے گی۔ شہنشاہ کی سفارت کے ارکان نے غازی بیگ خان کو بتا دیا تھا کہ وہ میر مومن خان کے نام کی سند حکومت لے کر آئے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ ''شہنشاہ عالم پناہ عالمگیر ثانی کے ہر حکم کی تعمیل ہم بندگان پنجاب کے لئے باعثِ افتخار ہے۔ میر مومن خان آج تک نائب حاکم پنجاب تھے۔ حاکم پنجاب مغلانی بیگم کا حکم ہے کہ عالی مرتبت مہمانوں کو ان کے مقام و مرتبہ کے مطابق عزت اور احترام کے ساتھ رکھا جائے۔ کل صبح شہنشاہ معظم کا فرمان میر مومن خان کے حوالے کرنے کی شایانِ شان تقریب منعقد کی جائے''۔

وہ مطمئن ہو گئے۔

بادشاہ کی سفارت کی شاندار مہمان نوازی کی گئی، غازی بیگ خان کے جواب کے بعد وہ رات سکون سے سوئے صبح کی نماز کے بعد غازی بیگ خان امرائے دربار کے ساتھ مہمان خان میں حاضر ہوئے۔ مغلانی بیگم کی طرف سے سب ارکان سفارت کو قیمتی خلعت اور تحائف پیش کئے اور انہیں جلوس کی صورت میں میر مومن خاں کی حویلی لے گئے جہاں ان کے حامی جمع تھے۔ میر مومن خاں نے شاہی سفارت کا استقبال کیا اور شکریہ کے ساتھ سند حکومت وصول کی، سب عمائدین اور عمال نے میر مومن خاں کو مبارکباد دی، غازی بیگ خان اور امرائے دربار نے بھی میر مومن خاں کو مبارکباد دی اور قلعہ واپس چلے گئے۔

شہنشاہ عالمگیر ثانی کی سفارت سند حکومت پہنچا کر اگلی صبح شاہجہان آباد روانہ ہو گئی۔ مغلانی بیگم قلعہ اور حکمرانی پر قابض رہیں، فوج اور امرائے دربار اس کے وفادار اور طابع فرمان تھے۔ میر مومن خان اور اس کے حامیوں نے بہت کوشش کی مگر انہیں اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میر مومن خاں نے موچی دروازہ میں ایک اور حویلی خریدی اور اس میں حاکم پنجاب کے شایانِ شان دربارداری کے لوازمات فراہم کئے، وہ ہر صبح وہاں دار بار لگاتے۔ غازی بیگ خان بخشی اور دیگر امرائے دربار صبح ان کے دربار میں حاضر ہوتے آداب بجالاتے اور پھر جلوس کی صورت میں قلعہ روانہ ہو جاتے اور مغلانی بیگم کی ہدایات کے مطابق حکومت کرتے۔ وہ ماہ تک پنجاب کے دو حاکم رہے۔ فوج اور عمال مغلانی بیگم کے ساتھ تھے اور مغل شہنشاہ کی سند حکومت میر مومن خاں کے پاس تھی لوگ میر مومن خاں کی شرافت کا احترام کرتے تھے مگر حکم مغلانی بیگم کا مانتے تھے۔ مغلانی بیگم نے بھکاری خان اور ان کے ساتھیوں کی یہ چال بھی ناکام بنا دی۔ وزیراعظم عمادالملک نے شہنشاہ کے جاری کردہ فرمان پر عمل کرانے اور میر مومن خاں کو طاقت کے ذریعے حاکم پنجاب منوانے کے لئے کوئی تدبیر نہ کی۔ بھوانی داس کی اطلاع پر آدینہ بیگ نے وزیراعظم کو مراسلہ ارسال کیا تھا کہ اگر انہوں نے مغلانی بیگم کے خلاف فوجی کارروائی کی تو احمد شاہ ابدالی خاموش نہیں رہے گا اور اگر ابدالی اس کی مدد کے لئے پنجاب تک آ گیا تو اس کی فوجوں کو شاہجہان آباد کی طرف بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ آدینہ بیگم نہیں چاہتا تھا کہ میر مومن خان کامیاب ہو اور وزیراعظم اپنی ساس کو فوجی قوت کے ذریعے اقتدار سے خارج کر کے اس کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سمجھانے پر شہنشاہ عالمگیر ثانی نے بھی خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر جانا اور میر مومن خاں مایوس ہو کر خاموش بیٹھ گیا۔

میر مومن خان اور مغلیہ دربار کے امراء کا منصوبہ ناکام بنانے کے بعد بیگم نے پھر سے سکھوں کی شورش دبانے کا آغاز کیا۔ حاکمانہ دو عملی کی بنا پر وہ پنجابی فوج کو لاہور سے باہر نہیں بھیج سکتی تھیں تاکہ مغل اور ترک سردار کوئی سازش نہ کریں۔ جسا سنگھ کلال عرف آہلووالیہ لاہور کے نواح میں بہت سرگرم ہو گیا تھا اور اس کے جتھے دن کے وقت بھی مسافروں اور قافلوں کو لوٹ لیتے تھے۔ اب تک سکھوں کے خلاف مہموں کی سرکردگی مغل اور ترک سردار کیا کرتے تھے۔ مغلانی بیگم نے ان کے خلاف پنجابی دستے بھیجے اور مرزا کریم کو لاہور کے جنوب اور مشرق میں سکھوں کے خلاف مہموں کا سربراہ مقرر کیا جس نے تھوڑے ہی دنوں میں لاہور سے قصور تک اور مشرق میں اٹاری تک مکمل امن بحال کر دیا۔ مغلانی بیگم نے انہیں آگے بڑھ کر رام گڑھ پر قبضہ کرنے کا حکم دیا تاکہ جالندھر تک راستے محفوظ ہو جائیں۔ پنجابی فوج کی ان کامیابیوں سے اہل لاہور کے علاوہ مسلمان کسان اور دیہاتی بھی بہت خوش ہوئے اور ان کا اپنے آپ پر اعتماد بحال ہونے لگا۔

*

پوہ کی وہ رات بہت ٹھنڈی تھی اور بہت طویل ہو گئی تھی، کئی روز سے مسلسل بارش ہو رہی تھی، بارش میں بھیگے کانپتے ہوئے پہریدار ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو انگیٹھی کے سامنے اونگھتے کماندار نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا

''لومڑ بخیریت ہے؟''

''پنجرہ اور لومڑ دونوں بخیریت ہیں''۔ انہوں نے کپڑوں سے پانی جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔

''پتہ نہیں خواجہ سعید اس کے کباب کب بنائیں گے؟'' کماندار نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

''لومڑ کے کباب حلال ہوتے ہیں؟'' ایک سپاہی نے پوچھا۔

''حلال ہوں یا حرام ہم نے کون سے کھانا ہیں، جان تو چھوٹے گی ہماری۔ دن رات اس کی حفاظت کرتے کرتے اب تو تنگ آ گئے ہیں۔ مغلانی بیگم شاید بھول ہی گئی ہیں کہ لومڑ پنجرے میں پل رہا ہے''۔ کماندار نے جواب دیا۔

پہرے سے واپس آنے والی ٹولی نے بھیگے کپڑے نچوڑ کر ایک طرف لٹکائے اور انگیٹھی کے سامنے نصف دائرہ میں بیٹھ گئے۔ کماندار ایک طرف ہٹ گیا۔ ''ان کو کھینچوا اٹھو کر چکر لگائیں کچھ ہو گیا تو اماں کو یہ بھی معلوم نہیں ہو گا لاڈلے کیسی موت مرے''۔ اس نے انگیٹھی کے پاس اونگھتے سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں ہو گا سردار! اس سردی میں کون آئے گا''۔ ایک سپاہی نے جواب دیا۔

''ایسی سردی ہی تو خطرناک ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے تم لومڑ کی فطرت سے واقف نہیں''۔

وہ باتیں کر رہے تھے کہ باہر کی طرف کھلنے والے دروازے کے محافظ نے کسی کو سلام کیا، سب نظریں دروازے کی طرف اٹھیں اور کسی اور طرف مڑ نہ سکیں۔ جس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں ساکت ہو گیا، ادھورے الفاظ ہونٹوں پر جم گئے۔ خواجہ سعید اپنے محافظ دستہ کے ساتھ سامنے کھڑے تھے۔

جب سے بھکاری خاں کو گرفتار کر کے ان کی نگرانی میں دیا گیا تھا وہ کبھی رات کو حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینے نہیں آیا تھا۔ اتنی سرد سیاہ رات میں وہ بذات خود بارش میں بھیگتا آ وارد ہو گا، پہریداروں کے گمان میں بھی نہ تھا۔ سوتے جاگتے اونگھتے اور بیٹھے سب پہرہ ڈیوٹی والے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہاں کرادی۔

خواجہ سعید نے فجر کی نماز ڈیوڑھی میں ہی ادا کی، بارش تھم چکی تھی مگر صبح کی ڈیوٹی والے دستہ کے آنے میں ابھی تاخیر تھی، وہ ڈیوڑھی سے نکلے اور پنجرے کی طرف چل دیئے۔ ''میں خود دیکھنا چاہتا ہوں کہ لومڑ کے پنجرے کی صحت تو قابل بھروسہ ہے۔''

خواجہ سعید کو آتا دیکھ کر بھکاری خان بستر سے اٹھ کر آہنی دروازے کے قریب آ گئے، ان کے ہاتھ میں قرآن تھا۔ خواجہ سعید نے سلام کیا اور آداب بجالایا جواب میں بھکاری خان نے انہیں دعا دی اور ایک تہہ شدہ کاغذ کھلے قرآن میں رکھ کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ خواجہ سعید نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ اٹھا لیا، اسے پڑھا اور پھر تہہ کر کے بھکاری خان کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کھلا قرآن آگے کیا، خواجہ سعید نے ایک اور کاغذ قرآن پر رکھ دیا۔ بھکاری خان نے کاغذ اٹھا کر چوما اور کلمہ پڑھ کر پھر قرآن میں رکھ کر خواجہ سعید طرف بڑھا دیا، اس نے تہہ شدہ کاغذ اٹھا کر اپنی جیب میں چھپا لیا۔

''مغلانی بیگم میر منو اور ترکوں کے نام پر بدنما داغ ہے، اسے مٹانا سب ترکوں کا فرض ہے''۔ بھکاری خاں نے قرآن بستر پر رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''آپ کا پیغام برادر بزرگ خواجہ مرزا خاں تک پہنچا دیا جائے گا''۔ خواجہ سعید نے انہیں یقین دلایا۔

''عمادالملک اس پر خوش ہوں گے، بادشاہ سے سند حکومت مل جائے گی، پنجاب کے مغل اور ترک سرداروں سے اس عرضداشت پر دستخط کرائے جا سکتے ہیں''۔ بھکاری خاں نے کہا۔

''میں اپنی طرف سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا، برادر بزرگ کا حکم تھا پیش ہو گیا ہوں، جو پیغام دیں گے آپ تک پہنچا دوں گا، اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا''۔

''میرے اور خواجہ مرزا خان کے درمیان یہ قرآن ضامن ہے''۔ بھکاری خاں نے قرآن اٹھا کر اسے چومتے ہوئے کہا۔ ''خواجہ مرزا خان اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں جو عہد کرتا ہوں پورا کرتا ہوں''۔

''آج سے محافظ اور پہریدار کچھ سختی کریں تو اسے مزید احتیاط سمجھ کر معاف کر دیں، مغلانی بیگم کے مخبر بہت ہوشیار ہیں''۔ خواجہ سعید نے کہا۔

''دس ماہ سے اتنا کچھ برداشت کر رہا ہوں، میر منو اور ترکوں کی عزت کے لئے سب کچھ برداشت کر لوں گا''۔ بھکاری خاں نے جواب دیا۔

خواجہ سعید ڈیوڑھی میں واپس آئے تو دن کے پہرے والا دستہ پہنچ چکا تھا رات کے دستہ کے کماندار کو باہر سڑک میں پڑا دیکھ کر سپاہی اور کماندار سب خوفزدہ دکھائی دیتے تھے۔

''لومڑ کو خوراک پہنچانے والے ملازم کو ڈیوڑھی سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ آگے خوراک تمہارا سپاہی لے جائے گا۔ آج سے ایک سپاہی ہمہ وقت پنجرے کے سامنے موجود رہے گا''۔ خواجہ سعید نے کماندار کو حکم دیا۔

دستہ کے کماندار نے تین دفعہ فرشی سلام کر کے نئے احکامات وصول کئے۔

''دوپہر تک یہ کمین زادہ یہیں پڑا رہے گا، اس کے بعد اسے گھوڑوں کے اصطبل میں بند کر دیا جائے اور کتوں والی خوراک دی جائے۔ ہم اس کا سر اس کی ماں تک پہنچانے کا بندوبست کریں گے''۔ خواجہ سعید نے سڑک میں پڑے کماندار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا اور اپنے دستہ کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔

دوپہر تک لاہور کی ہر حویلی اور دکان پر لوگ ایک دوسرے کو ایک ہی تازہ کہانی سنا رہے تھے کہ کس طرح بارش اور سردی میں خواجہ سعید اس کوٹھڑی تک جا پہنچے جہاں بھکاری خان بند ہے اور نگرانی میں غفلت برتنے پر کماندار

''ان سب کے کپڑے اتروا کر باہر بارش میں کھڑے کر دو اور کماندار کی مشکیں باندھ کر ڈیوڑھی سے باہر سڑک پر پھینک دو''۔ خواجہ سعید نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

پہرہ والے دستہ کے کماندار نے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کر ان کے پاؤں چھونے کی کوشش کی تو خواجہ نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ ''تمہاری ماں نے اپنے خاوند کی امانت میں ضرور خیانت کی ہے، اس جرم میں تمہارا سر کل اس کو بھجوا دیا جائے گا''۔

ستر پوشی کے سوا سب کپڑے اتروا کر سب کو بارش میں کھڑا کر دیا گیا۔ کماندار کے کپڑے اتار کر ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور ڈیوڑھی کے سامنے سڑک پر منہ کے بل لٹا کر اس پر سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا دی۔

بھکاری خاں کو گھر سے کھانا منگوانے اور دن کے وقت کمرے سے باہر نکل کر ایک چھوٹے سے احاطہ میں گھومنے کی اجازت تھی۔ کھانا لانے والے ملازم کے علاوہ کوئی اور ان سے نہیں مل سکتا تھا۔ غروب آفتاب سے پہلے انہیں کمرے میں بند کر کے چابی ڈیوڑھی میں پہرہ دستہ کے کماندار کو پہنچا دی جاتی تھی۔ جس کمرے میں انہیں بند کیا جاتا تھا اسے لوہے کی سلاخوں کا دروازہ لگا دیا تھا تاکہ پہریدار جب چاہیں دیکھ کر سکیں کہ لومڑ خیریت سے ہے۔ کمرے کے اندر لکڑی کا تخت، ریشمی قالین آرام دہ بستر اس کے مرتبہ کے مطابق ضرورت کی ہر چیز فراہم کر دی گئی تھی۔ ہر جمعہ کی صبح حجام اور حکیم ان سے مل سکتے تھے۔ بھکاری خاں زیادہ وقت پڑھنے میں مصروف رہتا۔ جب کچھ لکھنا ہوتا تو کاغذ قلم دوات فراہم کر دیئے جاتے اور ایک آدمی سامنے بیٹھا دیکھتا رہتا جو کچھ وہ لکھتا مکمل کر کے اس کے حوالے کر دیتا۔ وہ پڑھ کر تسلی کر لیتا کہ کوئی قابل گرفت چیز تو نہیں لکھ دی اور پھر یہ تحریر کھانا لانے والے ملازم کے ہاتھ اس کے گھر بھیج دی جاتی تھی۔ وہ تاریخ اور تہذیب کے بارے میں کتابیں زیادہ پڑھا کرتا تھا لیکن کچھ عرصہ سے تصوف میں بھی دلچسپی لینے لگا تھا۔ تہجد کی نماز کے بعد وہ قرآن کی تلاوت کرتا اور دن چڑھے تک قرآن پڑھتا رہتا۔ اس تبدیلی کا یہ مطلب لیا جانے لگا تھا کہ اس کے خیالات میں تبدیلی آ رہی ہے اور اقتدار پر قبضہ کی تمام کوششوں اور سازشوں کی ناکامی کے بعد وہ دنیا کی بجائے دین کا سہارا تلاش کرنے چل پڑا ہے۔ اس کے باوجود اس کی نگرانی سخت کی جاتی تھی۔ اس کے تجربہ اثر و رسوخ اور ہوشیاری کو جانتے ہوئے مغلانی بیگم کو احساس تھا کہ وہ اس پنجرے سے بھی ان کے مخالف عناصر کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے ہر ممکن طریقہ سے اسے سازشوں اور سازشیوں سے دور رکھا جا رہا تھا۔ اس نگرانی کی ساری ذمہ داری خواجہ سعید کے سپرد تھی۔

اپنے دستہ کے کچھ سپاہیوں کو ''لومڑ'' اور پنجرہ کا جائزہ لینے بھیج کر خواجہ سعید خود متبادل حفاظتی انتظامات کے بارے میں ہدایات دینے لگے۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سپاہیوں نے واپس آ کر بتایا کہ لومڑ اور پنجرہ خیریت سے ہیں اور اندر سے تلاوت کی آواز آ رہی ہے۔ خواجہ سعید نے جھانک کر باہر کھڑے سپاہیوں کو بلوا لیا اور انہیں کپڑے پہننے کی اجازت دے دی۔ اس حکم کی تعمیل پر سب نے گھٹنے زمین پر ٹیک کر اس کے پاؤں کو چھوا اور اپنے جرم کا اعتراف کر کے دست بستہ معافی کی درخواست کی۔

''ابھی تم سب فارغ ہو صبح ہم تمہارے جرم کی سزا سنائیں گے''۔ خواجہ سعید نے انہیں ڈیوڑھی سے نکلوا دیا۔

کماندار ابھی تک سڑک پر پڑا بھیگ رہا تھا، دو سپاہی وقفہ وقفہ سے اسے الٹ پلٹ رہے تھے۔ ''صبح کی اذان ہونے والی ہے جب نمازی مسجد کی طرف جائیں تو اسے زور زور سے جوتے لگوائیں''۔ اس نے اپنے دستہ کے کماندار کے کان میں کہا جس نے سر جھکا کر تعمیل کی یقین

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اور سپاہیوں کو کیا کیا عبرتناک سزائیں دیں۔

*

خواجہ مرزا خان نے دربار میں حاضری کی درخواست بھیجی تو مغلانی بیگم نے دوسرے روز خصوصی ایلچی کے ہاتھ اسے درخواست کی قبولیت کا پیغام ارسال کر دیا اور غازی بیگ خان کو اس کے استقبال اور قیام و طعام کے انتظامات کا حکم دیا۔ خواجہ مرزا خان نے اپنی وفاشعاری اور کارکردگی سے بیگم کے دربار میں خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔ انتظامی معاملات اور فوجی مہمات میں کوئی بھی مغل اور ترک عامل اس کے برابر نہیں تھا۔ عام مسلمان علماء اور اہل لاہور بھی اس کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ اس لئے جب اس نے خود حاضر ہو کر مالیہ کی قسط اور اپنے پرگنہ کی حالت کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے کی اجازت چاہی تو کسی طرف سے احتیاط یا مخالفت میں رائے نہیں آئی، سب اس کے استقبال اور مہمانداری کی تیاریوں میں لگ گئے۔ جمعرات کی دوپہر خواجہ مرزا خان اور اس کے دستہ کو دریا کے اس پار سے لانے کے لئے ملاحوں نے بہت چکر لگائے، سب سے آخر میں جب خواجہ خود کشتی سے اترے تو قلعہ دار نادر بیگ نے ان کا استقبال کیا۔ پتن سے قلعہ کے دروازے تک انہیں جلوس کی صورت میں لایا گیا جہاں ان کے دستہ کے قیام کے لئے خیمے لگے تھے۔ خواجہ مرزا خان نے اپنے دستہ کے درمیان قیام کی خواہش ظاہر کی لیکن جب انہیں بتایا گیا کہ مغلانی بیگم کے حکم پر مہمان خان خاص میں ان کے قیام کا انتظام کیا گیا ہے تو وہ اپنے خاص محافظوں کے ہمراہ وہاں منتقل ہو گئے۔ مغلانی بیگم کے دربار میں ان کی حاضری ہفتہ کے روز تھی، اس کے لئے امرائے شہر اور عمائدین کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ مہمان خانہ میں خواجہ مرزا نے چند گھڑی آرام کیا اور پھر سید صابر شاہ کے مزار پر قرآن خوانی کی محفل میں شرکت کرنے چلے گئے۔ دعا کے بعد اس نے بابا خان ولی کے حجرہ میں حاضری دی اور نذرانہ پیش کیا۔ ''معذرت خواہ ہوں قدم بوسی کے لئے جلد حاضر نہ ہو سکا''۔

''تم جہاں بھی تھے ہماری دعائیں تمہارے تعاقب میں رہیں۔ تم نے مسلمانوں کی بہت خدمت کی ہے ہم بہت خوش ہیں۔ ایک روز اللہ اس کی جزا دے گا''۔ بابا خان ولی نے تسبیح پڑھتے ہوئے جواب دیا۔

''کامیابی اور عزت جو بھی ہے اللہ کے کرم اور آپ کی دعاؤں کی بدولت ہے، بندہ جتنا بھی شکر کرے کم ہے''۔

''ہم آپ کا ستارہ بلندیوں کی طرف جاتا دیکھ رہے ہیں۔ اللہ آپ پر بہت مہربان ہے''۔ بابا خان ولی نے ان کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''اس میں حاکم پنجاب کے اعتماد اور کرم کا بھی ہاتھ ہے، بندہ ان کا شکریہ ادا کرنے آیا ہے''۔

''یہ تمہاری وفاشعاری ہے مگر ہم آپ کے لئے دعا اور دوا کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے''۔

''جب تک جان ہے وفاشعاری جزو جان رہے گی، اس میں سب کی فلاح ہے''۔

بابا خان ولی نے نظریں اٹھا کر کمرے کی نیم روشنی میں خواجہ مرزا خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''تمہاری آنکھوں میں خواب ہیں، ہم ان کی تعبیر کے لئے دعا کریں گے''۔

''یہ آپ کی بندہ نوازی ہے، آپ دعا کریں، وفاشعاری کے خواب پورے ہوں''۔

''ہماری دعائیں ہر اس خواب کی تعبیر میں تمہارے ساتھ ہیں جو امت مسلمہ کے فائدہ میں ہے''۔

خواجہ مرزا خان نے بابا خان ولی سے اتوار کی شام حاضری کی درخواست کی اور اجازت لے کر اپنے دستہ کے سواروں کے ساتھ قلعہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ بادشاہی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جا سکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

مسجد کے پہلو سے ہو کر وہ حضوری باغ میں داخل ہوئے تو عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ گھوڑے سے اتر کر لگام تھامے جب تک اذان ہوتی رہی وہیں کھڑا رہا، اس کے ساتھی بھی ساکت کھڑے رہے۔ اذان ختم ہوئی تو سب گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعہ میں داخل ہو گئے۔

*

خواجہ مرزا خان اپنے دستہ کے ارکان کے ساتھ جمعہ کی نماز کے لئے بادشاہی مسجد میں داخل ہوئے تو نمازیوں نے گردنیں گھما کر انہیں دیکھا۔ وہ اہل لاہور کے لئے نئے نہیں تھے مگر ان کی کامیابیاں اور کارنامے نئے تھے۔ اس لئے خطبہ کے دوران ہی انہوں نے گردنیں گھما لیں۔ خواجہ مرزا خان دل میں اہل لاہور کے رویہ پر بہت خوش ہوئے اور سر جھکا کر مؤدب بیٹھ گئے۔ نماز کے بعد وہ سید بخاری کو سلام کہنے گئے اور ان کے سامنے دوزانو بیٹھ گئے، ان سے خصوصی دعا کی درخواست کی۔ سید بخاری مسلم امہ اور سلطنت کے تحفظ اور ترقی کے لئے ہمہ وقت قلب و ذہن سے دعا گو رہتے تھے انہوں نے اس جہاد میں خواجہ مرزا کی کامیابی کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

دعا کے بعد سید بخاری کافی دیر تک ان سے پرگنہ ایمن آباد اور اس سے آگے کے حالات کی تفصیل سنتے رہے۔ سورج کی آنکھوں میں سرخی اتر رہی تھی جب وہ مسجد سے نکل کر قلعہ کے سامنے اپنے کیمپ میں داخل ہو رہے تھے۔ کیمپ میں انہوں نے کماندار سے سواروں کے قیام و طعام پر بات کی حال احوال پوچھا اور روانگی کے لئے رکاب میں پاؤں رکھ کر رک گئے۔ "ہم چاہتے ہیں رات کھانا کے بعد تم مہمان خانہ میں ہم سے ملو"۔ کماندار نے رکوع کی حالت میں جا کر تعمیل ارشاد کا یقین دلایا تو وہ سواروں کے ساتھ قلعہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ عالمگیری دروازہ کے محافظوں نے بندوقوں پر ہاتھ مار کر انہیں سلامی دی۔

خواجہ مرزا خاں کی رگوں میں اس مہم جو قوم کا خون دوڑ رہا تھا جس کے مختلف گروہوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں دنیا کے مختلف حصوں پر زبردست حکومتیں قائم کی تھیں۔ اس قوم کا جو فرد بھی وطن سے روانہ ہوتا تھا اس کے دل میں چھوٹی موٹی حکومت اور سرداری کی خواہش کہیں ضرور موجود ہوتی تھی۔ جب وہ تین صد سواروں کا دستہ لے کر گھر سے روانہ ہوا تھا تو اس کے دل میں بھی ایسی ہی خواہش ہو گی لیکن وہ اس مقام تک پہنچ بھی سکے گا جہاں آج شام وہ کھڑا تھا، اسے امید نہ تھی۔ دیوان عام کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے جھروکے کی طرف دیکھا تو اکبر اعظم کے رعب و دبدبہ سے عالمگیر ثانی کی دست بستہ بادشاہت تک کی کہانی تازہ ہو گئی۔ اس نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں، پیچھے آنے والے سوار بھی رک گئے، وہ گھوڑے سے اترا تو سب نے اس کی تقلید کی۔

"گھوڑا اصطبل میں پہنچا دیں، ہم مہمان خانہ تک پیدل چلنا چاہتے ہیں"۔ اس نے سواری خادم کے حوالے کر دی۔ اس کے نائب سر جھکائے کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چلنے لگے۔ اس نے دیوان عام دیوان خاص اور دیگر عمارتوں کو غور سے دیکھا اور پھر شیش محل کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ وہ ان لمحوں کا شمار کر رہا تھا جو اس کے اور شیش محل کے درمیان حائل تھے، جو اس کی حکمرانی کو مغلانی بیگم کے دور سے جدا کرنے کا عمل تیزی سے پورا کر رہے تھے۔ اس نے کسی اہم منصب کا خواب دیکھا تھا مگر بابا خان ولی نے اس کے دل میں کشور پنجاب کی حکمرانی کے خواب بھی بیدار کر دیئے تھے لیکن یہ امید نہ تھی کہ یہ خواب کبھی پورے بھی ہوں گے اور بابا خان ولی کے تعاون اور خواہش کے بغیر وہ پنجاب کی صوبیداری تک پہنچ سکے گا۔ اپنے آقا کو دھوکہ دینا اور اس کی نعش پر پاؤں رکھ کر اقتدار تک پہنچنا ان کی اخلاقیات میں کبھی معیوب نہیں رہا تھا، اس کے دل میں کوئی ایسی خلش نہیں تھی۔ مہمان خانہ سے شیش محل کا راستہ اور فاصلہ آنکھوں میں ناپتا ہوا آگے بڑھا تو نادر بیگ کے گھوڑے کے سموں کی آواز اس کی سوچ کے تسلسل میں مخل ہو گئی۔

نادر بیگ کا والد اور پانچ بھائی میر منو پر قربان ہو گئے تھے، وہ اس خاندان کا واحد زندہ فرد تھا۔ صبح تک اس کا انجام کیا ہو گا، وہ سوچنے لگا۔ قریب پہنچ کر نادر بیگ چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اتر گیا، اس کے ساتھی سوار بھی گھوڑوں سے کود گئے۔ نادر بیگ خواجہ مرزا خان کے پہلو میں چلنے لگا۔

"میں یہ سوچ کر گھوڑے سے اتر گیا کہ ایک زمانہ میں بادشاہ کے علاوہ کسی کو قلعہ کے اندر سواری کی اجازت نہ تھی۔ ہمیں ان روایات کا احترام کرنا چاہئے"۔ خواجہ مرزا خان نے بہانہ بنایا۔

"قلعہ کے اندر کی ضروریات کے لئے کچھ راستوں پر اب سواری لانے کی اجازت ہے، دروازے سے مہمان خانہ تک اب پالکی مناسب نہیں سمجھی جاتی"۔ نادر بیگ نے وضاحت کی۔

نادر بیگ مہمان خانہ تک ان کے ساتھ رہا اور پھر آداب بجا لا کر فصیل اور مختلف برجوں پر پہرہ کی پڑتال کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

رات نے کروٹ لی تو نادر بیگ نے گھوڑے کا رخ موڑ دیا، فصیل پر آخر شب کے پہریدار خبردار اور ہوشیار ہو چکے تھے، ڈیوڑھی کے کماندار کو ہدایات دے کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا تو رات کی سیاہ چادر میں سنہری ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ دیوان عام کے سامنے پہنچ کر اس نے فصیل کے اوپر سے خوابیدہ شہر ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔ تھوڑا سا گھوم کر وہ دیواروں کے سایہ سایہ چلنے لگا۔ اس کے گھوڑے کے سموں کے سوا کہیں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ یہ خاموشی اور اندھیرا اسے عجیب سا لگا، اس کا دل چاہا وہ گھوڑے کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ کر اسے ایڑ لگا دے اور فصیل کے ساتھ ساتھ گھوڑا دوڑاتا رہے۔ گھر کے دروازے پر گھوڑا ملازم کے حوالے کر کے وہ دبے پاؤں اس طرح اندر داخل ہوا جیسے اپنے گھر میں نہیں کسی اور کے گھر میں چوری کرنے داخل ہو رہا ہو۔ اگلے روز اسے خواجہ مرزا خان کو بیگم کے حضور پیش کرنا تھا، اس نے سوچا بچے جاگ گئے تو نیند کے چند گھنٹے بھی میسر نہیں آئیں گے۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے بستر میں گھس گیا اور اگلی صبح کی مصروفیات کے بارے میں سوچتا ہوا نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اس کی بیوی نے کروٹ بدل کر دیکھا اور اس کی نیند پر رشک کرتی ہوئی خود بھی شعور کی منزل سے آگے نکل گئی۔

کماندار نے بھاری بندوق دیوار کے ساتھ کھڑی کی، ڈیوڑھی کے بیرونی دروازہ پر کھڑے محافظ کو آخری گالی دی اور ٹانگیں پسار کر دراز ہو گیا۔ مغلانی بیگم نے مرزا کریم بخش کی پنجاب فوج کو سکھوں کے خلاف بھیج کر واقعی اچھا نہیں کیا۔ وہ سوچنے لگا اس کی کامیابیوں سے مغلوں اور ترکوں کی بے عزتی ہوئی ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ان کی عزت کیا رہے گی۔ اس عورت کی عقل واقعی ناقص ہے، اس نے بھی وہی غلطی کی ہے جو رضیہ سلطانہ نے کی تھی، اسی لئے تو سیانے کہتے ہیں عورت کو حکومت میں نہیں ہونا چاہئے۔ وہ سوچنے لگا۔

نادر بیگ کے دروازے کے سامنے دو سوار آ کر رکے "قلعہ دار کو فوراً بے آرام کریں" وہ چلائے پہریدار انہیں پہچان کر بھاگتا ہوا اندر چلا گیا اور نادر بیگ کی خواب گاہ کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ تیسری ضرب پر نادر بیگ کی بیوی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا، وہ کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"حضور! سرفراز خاں مداخلت کے لئے معذرت خواہ ہیں اور فوری طور پر خطرے کی نوبت بجانے کی درخواست لے کر آئے ہیں"۔ پہریدار نے اطلاع دی۔

نادر بیگ لحاف ایک طرف پھینک کر شب خوابی کے لباس میں دروازے کی طرف بھاگا۔

"خواجہ مرزا خاں کی فوج قلعہ پر قبضہ کرنے کا عمل شروع کرنے والی ہے"۔ سرفراز خاں اسے دیکھتے ہی چلایا۔

نادر بیگ اسی طرح بھاگتا ہوا واپس گیا اور ہتھیار لگانے لگا۔ اسی دوران اس نے گولی چلنے کی آواز سنی، وہ سرفراز خان کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور نوبت خانے کی طرف سرپٹ گھوڑا دوڑایا مگر وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ نوبت خانہ کے دروازے میں بھاری تالا پڑا تھا۔ انہوں نے تالا توڑنے کی کوشش کی اسی دوران ڈیوڑھی اور مستی دروازے کی طرف بھی گولیاں چلنے لگیں۔ انہوں نے ڈیوڑھی کی طرف گھوڑا دوڑادیا مگر ان کے پہنچنے سے پہلے خواجہ مرزا خان کے سوار قلعہ میں داخل ہو چکے تھے اور فائرنگ کرتے ہوئے فصیل کے ساتھ ساتھ بھاگے جا رہے تھے۔ انہوں نے گھوڑا وہیں چھوڑ دیا اور متصل دیوار کے سایہ سایہ ہو کر خفیہ راستہ سے شیش محل کی طرف دوڑنے لگے۔ پہریدار نے انہیں پہچان کر دروازہ کھول دیا۔ کمرے کے درمیان میں روشن شمعدان اٹھا کر وہ بھاگتے ہوئے اندھیری سڑھیاں چڑھنے لگے۔ شیش محل کے اندرونی دروازوں پر محافظ ہوشیار کھڑے تھے۔ باہر ہر طرف گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں، اندر خواجہ سرا کنیزیں خدام سب شیش محل کے صحن میں جمع تھے۔ رات کی ڈیوٹی والے خدام پورے لباس میں اور ڈیوٹی سے فارغ شب خوابی کے کپڑوں میں سہمے ہوئے خوفزدہ اور بے بس کھڑے تھے۔

"بیگم عالیہ کہاں ہیں؟" نادر بیگ نے میاں خوش فہم کو پہچان کر پوچھا اور چلا کر شیش محل کے بیرونی دروازوں کے پہریداروں کو ہوشیار رہنے کا حکم دیا۔ قلعہ دار کو اپنے درمیان میں دیکھ کر محافظ دلیر ہو گئے۔

"میاں خوش فہم بیگم عالیہ کو اطلاع دیں نادر بیگ ولد عزیز بیگ اپنی جاں نثاری کا ثبوت دینے آیا ہے"۔ اس نے چلا کر کہا۔ ان کی آواز پر ایک کمرے کے دروازے پر سے پردہ ہٹا اور گل بنفشہ اندر سے برآمد ہوئی۔ "بیگم عالیہ نے شرف باریابی کے لئے حکم دیا ہے"۔

"سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں کسی کو کوئی خطرہ نہیں"۔ نادر بیگ نے صحن میں جمع خدام کو حکم دیا اور سرفراز کے ہمراہ گل بنفشہ کے پیچھے چل دیا۔

کمرے میں فرشی شمعدان روشن تھا، مغلانی بیگم ریشمی قالین پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور ان کی دونوں بیٹیاں عمدہ بیگم اور طلعت بیگم پاس کھڑی تھیں۔ نادر بیگ اور سرفراز خاں نے جھک کر سلام کیا۔

"ہمیں امید تھی کہ میر منو کے جاں نثار ضرور پہنچ جائیں گے"۔ بیگم نے اطمینان سے کہا۔

"ہم اپنی کوتاہی کے لئے معافی کے خواستگار ہیں اور جو سزا حضور پسند فرمادیں اس کے لئے حاضر ہیں"۔ نادر بیگ اور سرفراز خاں نے دست بستہ عرض کیا۔

"نادر بیگ یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہمیں تمہاری جاں نثاری پر فخر ہے، ہم تمہاری سلامتی چاہتے ہیں۔ کیا تم قلعہ سے بحفاظت نکل سکتے ہو؟" بیگم نے پوچھا۔

"آپ کے قلعہ دار کے لئے قلعہ سے نکلنا کوئی مشکل نہیں لیکن ہم آپ کی سلامتی کے لئے جانیں قربان کرنے آئے ہیں"۔ نادر بیگ نے جواب دیا۔

"ہمیں جاں نثاروں کی جانیں زیادہ عزیز ہیں، تم میاں مہابت خاں کو ساتھ لو یہ کچھ سامان اماں حضور کی حویلی پہنچا کر ملک سجاول کے ہاں پہنچ جاؤ اور ہمارے حکم کا انتظار کرو"۔ مغلانی بیگم نے ایک بکس کی طرف اشارہ کیا۔

"مگر آپ؟" نادر بیگ نے پریشانی سے پوچھا۔

"ہمارا خدا ہماری مدد کرے گا، آپ جتنا جلد ممکن ہو قلعہ سے نکل جائیں، ہمیں اندیشہ ہے باغی جلد ادھر آنے والے ہیں"۔

"مگر ہم آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے"۔ نادر بیگ نے جانے سے انکار کر دیا۔

"نادر بیگ یہ ہمارا حکم ہے اور ہمیں یقین ہے تم ہمارا حکم اسی طرح مانو گے جیسے مانتے رہے ہو"۔ بیگم نے اسی اعتماد سے کہا۔ نادر بیگ اور سرفراز خاں نے جھک کر آداب عرض کیا اور صندوق اٹھا کر میاں مہابت خاں کے ساتھ باہر نکل گئے۔

دالان میں پہنچ کر نادر بیگ نے پہریداروں کو پھر ہوشیار رہنے کا حکم دیا اور بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اتر کر اس خفیہ راستہ کی طرف چلے گئے۔

"جانِ مادر آپ میر منو کی بیٹیاں ہیں، ایسے حادثات سے گھبرا گئیں تو باپ دادا کی روحوں کو تکلیف ہو گی۔ چلو جلدی سے لباس تبدیل کرو، ہم شیش محل خالی کرنا چاہتے ہیں"۔ بیگم نے بیٹیوں کو حکم دیا۔

عمدہ بیگم اور وقار بیگم سر جھکائے پردہ اٹھا کر ملحقہ کمرے میں چلی گئیں۔

"گل بنفشہ! ہم میاں خوش فہم کو کچھ ہدایات دینا چاہتے ہیں"۔ مغلانی بیگم نے کنیز کو مخاطب کیا۔ گل بنفشہ باہر گئی اور واپس آ کر میاں خوش فہم کی حاضری کی اطلاع دی۔ میاں خوش فہم نے فرشی سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"خدام اور کنیزیں سب اپنے کمروں میں جائیں گے، گل بنفشہ اور گلنار ہمارے ساتھ رہیں گی، ہم باہر آئیں تو صحن میں کوئی نہ ہو، تم جلد واپس آ کر اطلاع دو"۔ بیگم نے حکم دیا۔

میاں خوش فہم دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

طلعت بیگم اور عمدہ بیگم واپس آئیں تو مغلانی بیگم کھڑی ہو گئی۔ دونوں کی پیشانیاں چومیں گل بنفشہ اور گلنار کپڑوں کی گٹھڑیاں اٹھائے کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کے پھول سے چہرے مرجھائے ہوئے تھے اور آنکھوں میں خوف کے ڈورے ابھر آئے تھے۔

مغلانی بیگم اپنی بیٹیوں اور کنیزوں کے ہمراہ دالان میں سے ہو کر سیڑھیاں اتر گئی، میاں خوش فہم شمع اٹھائے آگے چل رہا تھا۔

جب بادشاہی مسجد میں صبح کی اذان ہوئی تو قلعہ پر خواجہ مرزا خاں کی فوج کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا، کہیں سے بھی کسی پہریدار نے مزاحمت نہیں کی تھی۔ خواجہ سعید نے پہریداروں کے کمانداروں کو رشوت اور ترغیب سے ساتھ ملا لیا تھا اور پہلی گولی کی آواز پر خواجہ سعید کے زیر کمان فوج نے باہر سے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا اور ایمن آباد سے آنے والے دستے تمام اندرونی عمارتوں پر قابض ہو گئے تھے۔ شیش محل کے دروازوں کے محافظ ہر طرف سے قبضہ کی اطلاع پا کر چپکے سے غائب ہو گئے تھے۔ جب خواجہ سعید اپنے دستہ کے ہمراہ شیش محل کے احاطہ میں داخل ہوئے تو ملازم اور کنیزیں بدحواسی میں اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ مسلح سپاہیوں کو دیکھ کر وہ سب چیخ و پکار کرنے لگے۔

سپاہیوں نے سب ملازمین کو صحن میں جمع کیا اور تلواریں تان کر ان کے گرد کھڑے ہو گئے۔

خواجہ سعید نے محل کا ایک ایک کونا چھان مارا مگر مغلانی بیگم کا کہیں کوئی نشان نہ ملا۔ بیگم کے اس طرح غائب ہونے سے وہ بہت مایوس اور غصہ میں تھا۔ "بیگم کہاں ہے؟" وہ خدام کے قریب آ کر چلایا۔

خوف سے کانپتے سراسیمہ ملازمین میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ہم پوچھتے ہیں بیگم کہاں ہے؟" اس نے مجمع میں

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے ایک خواجہ سرا کو زناٹے کا تھپڑ رسید کیا۔

"خدا کی قسم خدا ہی جانتا ہے"۔ خواجہ سرا اس کے پاؤں پر گر گیا۔

"اسے دروازے کے ساتھ الٹا لٹکا دو"۔ خواجہ سعید نے اسے ٹھڈا رسید کرتے ہوئے حکم دیا۔

دو سپاہی آگے بڑھے اور خواجہ سرا کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

"اگر تم نے بتایا نہیں کہ بیگم کہاں ہے تو تم سب کی گردنیں اڑا دی جائیں گی"۔ خواجہ چلایا خوفزدہ ملازمین مزید خوفزدہ ہو گئے مگر کسی نے منہ نہیں کھولا۔

"تم نے بیگم کو آخری بار کب دیکھا تھا؟" اس نے ایک اور خواجہ سرا کو گریبان سے کھینچتے ہوئے پوچھا۔

"پچھلے جمعہ کو حضور"۔ خواجہ سرا کانپ رہا تھا۔

"کتیا کے بچے میں آج کی بات کرتا ہوں تم پچھلے جمعہ کی بات بتاتے ہو"۔ اس نے خواجہ سرا کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کیا۔

"سچ کہتا ہوں حضور میری بیوی بیمار تھی، میں آج شام ہی واپس آیا ہوں اور پکڑا گیا ہوں"۔ خواجہ سرا نے خون تھوکتے ہوئے جواب دیا۔

"کون بیمار تھی، بیوی؟ تمہاری بیوی بھی ہے؟" خواجہ سعید چلایا۔

"آپ کے سر مبارک کی قسم ہے حضور! اس کے بچے بھی ہیں، ان پر رحم فرمادیں"۔ خواجہ سرا رونے لگا۔

"کس کے بچے ہیں؟" خواجہ سعید چلایا۔

"اس میری بیوی کے حضور! آپ مجھ پر رحم فرمادیں"۔

"جب تک تمہاری بیوی تمہارا بچہ نہیں جنتی تم لٹکے رہو گے"۔ اس نے فیصلہ سنایا۔

سپاہی روتے ہوئے خواجہ سرا کو ٹانگوں سے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

"شیش محل میں باہر سے کوئی آدمی آیا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"جی حضور! یہ ہم بتا سکتے ہیں۔ جب گولی چلی تو اس کے بعد قلعہ دار حضور اور سرفراز خان حضور، بیگم حضور کے شرف یاب ہوئے تھے"۔ ایک خواجہ سرا نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔

"پھر وہ کدھر کو گئے تھے؟" خواجہ نے پوچھا۔

"جدھر سے آئے تھے، حضور وہ اُدھر کو چلے گئے تھے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا"۔ خواجہ سرا نے جواب دیا۔

"اگر تم نے بتایا نہیں تو میں تمہاری آنکھیں نکلوا دوں گا"۔ خواجہ سعید غصہ میں چلایا۔

"آنکھوں کے بغیر ہم حضور کا روشن چہرہ کیوں کر دیکھیں گے، ہم تو آپ کے حکم کے خلاف ہیں، دیکھتے تو ضرور بتاتے"۔ خواجہ سرا نے اس کے پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اب انہیں کیا کرنا ہے"۔

خواجہ سعید سوچنے لگا اگر قلعہ دار اور سرفراز خاں مغلانی بیگم کے پاس تھے تو اب کہاں ہیں؟ قلعہ کے اندر یا وہ سب قلعہ سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

"ان سب کو باہر میدان میں لے جاؤ"۔ اس نے خدام کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا۔ "اور مرزا اعظمت کو حاضر کرو"۔

"ایک سپاہی سلام کر کے باہر نکل گیا اور باقی ملازمین کو ہانکتے ہوئے باہر لے گئے۔

"قلعہ اور شہر کے سب دروازوں کے پہرہ والوں کو جلد از جلد حاضر کرنے کا اہتمام کریں اور سب دروازوں پر اپنے پہریدار متعین کر دیں"۔ اس نے مرزا اعظمت کو دیکھتے ہی حکم دیا۔

مرزا اعظمت بیگ حکم سنتے ہی سلام کر کے دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

خواجہ سعید کی موٹی موٹی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، وہ اپنے کو لاہور کا حاکم اور مغلانی بیگم کا محافظ سمجھتا تھا۔ قلعہ کے باہر اس کے دستے تھے، اندر اس کے بھائی کے سپاہیوں کا قبضہ تھا، اس کے باوجود ایک عورت سب کی آنکھوں میں مرچیں ڈال کر نکل گئی، اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ اپنی لمبی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا دالان میں ایسے ٹہل رہا تھا جیسے پنجرے میں بند کوئی خونخوار بھیڑیا چکر لگا رہا ہو۔ اس کے ازبک سپاہی کچھ فاصلہ پر مؤدب کھڑے تھے اور للچائی ہوئی نظروں سے محل کے دروازوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"تم چند سپاہیوں کے ساتھ ادھر آؤ، باقی سب یہاں رہیں گے"۔ اس نے ایک افسر کی طرف اشارہ کیا اور پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔

*

خواجہ مرزا خاں فوجی جلوس کے ساتھ مہمان خانے سے برآمد ہوا تو خواجہ سعید اور اس کی اپنی فوج کے افسر آگے پیچھے اور دونوں طرف چلے آرہے تھے۔ قلعہ اور شہر پر قبضہ سے اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ پاؤں زمین پر رکھتا تو ہوا میں تیرتا ہوا محسوس کرتا۔ دیوان عام اور دیوان خاص سے ہوتا ہوا جلوس شیش محل میں داخل ہوا تو ویرانی نے آگے بڑھ کر آداب عرض کیا، چند سپاہیوں کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ پردہ اٹھا کر اندر گئے تو اس سے بھی بڑی ویرانی گلے ملی۔ مغلانی بیگم کا محل مکمل طور پر لوٹ لیا گیا تھا۔ خواجہ مرزا خان اپنے بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "مال غنیمت میں ہمارا کچھ حصہ بھی ہے یا سب فوج میں تقسیم کر دیا؟"

"فوج اور اس کے پاس جو کچھ بھی ہے آپ کے لئے وقف ہے"۔ خواجہ سعید نے جھک کر عرض کیا۔

"ہم فوج اور اس کے سربراہ کی کارکردگی پر بہت خوش ہیں، انہیں جو کچھ ہاتھ آیا ان کی خدمت کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ ہماری طرف سے اعلان کر دیں کہ ہم انہیں انعامات بھی دیں گے"۔ خواجہ مرزا خان مسکرایا۔

خواجہ سعید نے جھک کر سلام کیا۔ "یہ آپ کی روایت ہے"۔

"اس گھر کے مکینوں کا کچھ پتہ چلا؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہم پوری کوشش کر رہے ہیں، امید ہے جلد کوئی اچھی خبر سنانے میں کامیابی حاصل کریں گے"۔ خواجہ سعید نے جواب دیا۔

"مغلانی بیگم وزیراعظم اعتمادالملک کی ممانی اور ساس ہیں ان کا ہاتھ سے نکل جانا بھی خطرناک ہے اور مارا جانا بھی تمہیں اس کی طرف سے غفلت نہیں برتنا چاہیے تھی"۔ خواجہ مرزا خان نے کہا۔

"اس غفلت کے لئے ہم معافی کے خواستگار ہیں، نادر بیگ اور سرفراز خان اس تک پہنچ جائیں گے۔ ہم سوچ نہ سکے ہماری اطلاع کے مطابق تو اس وقت نادر بیگ گھر میں سو رہے تھے"۔ خواجہ سعید نے بتایا۔

"مرزا کریم بخش اپنی فوج کے ساتھ لاہور سے باہر ہے اگر وہ سب اس کے پاس پہنچ گئے تو جھگڑا بڑھ جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں خواجہ قاضی کی فوج آج شب دریا سے پار اتر جائے"۔ خواجہ مرزا خان نے ہدایت کی۔

"اس کا انتظام ہو گیا ہے، سب کشتیاں اس فوج کو لانے پر لگا دی گئی ہیں"۔

"ناظم شہر کو ابھی تک ہمارے حضور پیش نہیں کیا جا سکا"۔

"خبر ہے کہ چمن لال اہل وعیال سمیت فرار ہو گیا ہے"۔

"خواجہ سعید! یہ سب ہمارے انتظامات کے ناقص ہونے کا ثبوت ہے۔ حاکم پنجاب، ناظم شہر، ناظم قلعہ اور پرچہ نویسوں کا سربراہ سب فرار ہو گئے اور مرزا کریم بخش

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہمارے ساتھ نہیں"۔ خواجہ مرزا خان نے بھائی کی طرف دیکھا۔

"ساری ترک اور مغل فوج امرائے شہر آپ کے اقبال اور ترقی کے لئے دعائیں کر رہے ہیں، اہل لاہور آپ کی کامیابی پر شاداں ہیں۔ اس کشور کا مقدر آپ کے نام لکھ دیا گیا ہے"۔ خواجہ سعید نے جواب دینے کی بجائے خوشامد کی۔

"دعا کے ساتھ دوا کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے، ہم چاہتے ہیں سب نظام جلد قائم کر دیا جائے۔ اس بارے میں بھکاری خاں اور ان کے ساتھی امراء سے بھی مشورہ کیا جائے"۔ خواجہ مرزا خان نے حکم دیا۔

"حضور کا حکم سر آنکھوں پر تعمیل میں کوتاہی نہیں ہو گی"۔

"ہماری خواہش ہے کہ بھکاری خاں کو عزت کے ساتھ ہمارے پاس لایا جائے ہم ان سے مشورہ کرنا چاہیں گے"۔

"بھکاری خان؟" خواجہ سعید نے سوالیہ نظروں سے خواجہ مرزا خان کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں بھکاری خان ہم سمجھتے ہیں ہماری بات میں کوئی ابہام نہیں۔ ہم اس مقام تک ان کے منصوبہ اور مشورہ سے پہنچے ہیں۔ مغل دربار کے امراء سے رابطہ، وزیراعظم اور بادشاہ تک رسائی کے لئے ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ ان کی حالت اس شہباز کی سی ہے جس کے پر کاٹ دیئے ہوں، ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں"۔ خواجہ مرزا خان نے بھائی کو تسلی دی۔

"بہت بہتر حضور آج شام انہیں پورے احترام کے ساتھ آپ کے حضور پیش کر دیا جائے گا"۔ خواجہ سعید نے عرض کیا۔

شیش محل سے وہ ہاتھی پور کے راستہ نیچے آئے تو گھوڑے تیار کھڑے تھے، خواجہ مرزا خان رکاب کا سہارا لئے بغیر اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گئے، باقی افسر بھی ان کے ساتھ ہو لئے۔ وہ قلعہ سے باہر آئے اپنی فوج کے کیمپ کا معائنہ کیا، افسروں اور سپاہیوں کو مبارکباد دی اور راوی کے چمن پر اترنے والی اپنے بھائی خواجہ قاضی کی فوج دیکھنے چلے گئے۔ جب سورج آسمانوں سے پھسل کر راوی میں غرق ہو گیا تو وہ واپس لوٹ آئے۔ شاہی مسجد کے عقب میں سید صابر شاہ کے مزار کی طرف دیکھ کر بابا خان ولی سے ملاقات کی خواہش نے کروٹ لی، جنہوں نے پہلی بار ان کے دل میں کشور پنجاب کی حاکمیت کا خواب بیدار کیا تھا اور خوشخبری سنائی تھی اور اس کے لئے دعا اور دوا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ سوچنے لگے اگر بابا خان ولی انہیں یہ خوشخبری نہ سناتے اور بھکاری خان کا ساتھ چھوڑ کر مغلانی بیگم کی حمایت کا مشورہ نہ دیتے تو آج وہ اس قلعہ اور کشور کے حاکم اور مالک نہ ہوتے۔ فرط عقیدت سے ان کی آنکھیں بھر آئیں، ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ ننگے پاؤں چل کر ان کی خدمت میں حاضری دیں، ان کا شکریہ ادا کریں، ان سے مزید دعاؤں اور دواؤں کی درخواست کریں۔ انہیں یقین تھا کہ بابا خان ولی ان کی اس گستاخی کو معاف کر دیں گے کہ گزشتہ ملاقات میں انہوں نے اپنا ارادہ اور پروگرام ان پر ظاہر نہ کیا تھا۔ "یقیناً بابا خان ولی کو میرے ارادے کا علم ہو گیا ہو گا اسی لئے وہ اتنی شفقت اور پیار سے ملے تھے"۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دی مگر وہ خیالی ہاتھ ان کے حضور پیش نہیں ہونا چاہتے تھے۔ وہ آگے چل دیئے، شام کی نماز قضاء ہو چکی تھی اور خواجہ سعید نے نماز کے بعد بھکاری خان کو پیش کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔

*

تہہ خانہ کے تنگ اندھیرے راستہ کے آخری سرے پر مدھم سی روشنی نمودار ہوئی تو بند دروازے کے سامنے بیٹھے میاں خوش فہم کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

کالے برج کے نیچے کے تہہ خانہ کے دو منزل نیچے اس تہہ خانہ کا راستہ بیگم کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔ روشنی بڑھتی گئی ان کی طرف چلتی رہی تو اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ گل بنفشہ نے تھوڑا سا دروازہ کھولا تو انہوں نے بتایا کہ اندھیرے راستہ میں روشنی چلتی ہوئی آ رہی ہے، گل بنفشہ کانپنے لگی، اس کی زبان پر لفظ پھڑ پھڑائے تو عمدہ بیگم نے آگے بڑھ کر کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیئے۔ "روشنی آ رہی ہے" گل بنفشہ نے بڑی مشکل سے بتایا۔

"روشنی سے نہیں اندھیرے سے ڈرنا چاہئے، میاں خوش فہم سے کہیں جو آتا ہے آنے دیں"۔ مغلانی بیگم نے بستر سے تھوڑا سا سر اٹھا کر کہا۔

"ہو سکتا ہے نادر بیگ آ رہا ہو، حالات ٹھیک ہو گئے ہوں، مرزا کریم بخش آ گیا ہو"۔ وقار بیگم بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"حالات اتنی جلد بہتر نہیں ہوا کرتے جان مادر! مرزا کریم بخش اتنا قریب نہیں"۔ مغلانی بیگم نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اگر باغیوں کے سپاہی ہوئے تو پھر کیا ہو گا؟" عمدہ بیگم کی آواز کانپ گئی۔

"آپ عمادالملک کی منگیتر اور میں اس کی ساس اور ممانی ہوں۔ عمادالملک سلطنت مغلیہ کا وزیراعظم ہے، باغیوں کو اس کا علم ہے، آپ بے فکر رہیں"۔ مغلانی بیگم نے بیٹی کو تسلی دی۔

"اگر باغیوں کو اس کا علم ہوتا تو وہ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے؟" عمدہ بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کچھ باتیں بغاوت کی کامیابی کے بعد سمجھ آیا کرتی ہیں، کچھ افراد کا بغاوت کر چکنے کے بعد پتا چلا کرتا ہے، آپ آرام فرمائیں"۔ بیگم نے جواب دیا۔

گل بنفشہ نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی اور وہیں کھڑی رہی، عمدہ بیگم اپنے بستر میں واپس آ گئی۔ روشنی کے بعد قدموں کی آہٹ بھی قریب آ رہی تھی۔ میاں خوش فہم کا دل کانپنے لگا، جب روشنی اور آواز اور بھی قریب آ گئی تو اس نے پوری قوت سے سرگوشی کی کوشش کی۔ "تم کون ہو؟" مگر آواز اس کے حلق سے خارج نہ ہو سکی۔

"میں میر منو کا جاں نثار ہوں، میں بیگم عالیہ کے نمک کا حق ادا کرنے کی اجازت لینے آیا ہوں"۔ جواب آیا۔

"تم وہیں کھڑے رہو اور بتاؤ یہ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟" میاں خوش فہم نے طہماس خان کی آواز پہچان کر پوچھا۔

"یہ میرا دوست اور میر منو کا جاں نثار محمد عاقل ہے، ہم بیگم عالیہ سے خواجہ مرزا خان اور بھکاری خاں کو قتل کرنے کی اجازت لینے آئے ہیں"۔

وہ دونوں ہتھیار بند تھے، میاں خوش فہم نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا اور خوفزدہ آواز میں پوچھا۔ "کہاں ہیں قتل کے حقدار بھکاری خان اور خواجہ مرزا؟"

"وہ دونوں اس وقت شیش محل کے ایک کمرے میں اکیلے بیٹھے مشورہ کر رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں"۔ طہماس خان نے بتایا۔ "سپاہی باہر ہیں بیگم صاحبہ حکم دیں تو ہم ابھی ان دونوں کے سر پیش کر دیں گے"۔

میاں خوش فہم خوش ہو گیا اور جلدی سے دروازے پر دستک دی۔ گل بنفشہ کواڑ سے لگی ان کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے بھکاری خان اور خواجہ مرزا خان کے سر پیش کر دینے کے بکھرے بکھرے الفاظ سن کر ذہن میں جمع کئے تو اس کے چہرے پر خوشی آ گئی، وقار بیگم اسے دیکھ کر خوشی سے بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"گل بنفشہ! میاں خوش فہم سے پوچھ کر ہمیں

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بتائیں کون ہے اور کیا پیغام ہے"۔ مغلانی بیگم بھی بستر میں بیٹھ گئی۔

گل بنفشہ نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر میاں خوش فہم سے پیغام لیا اور بیگم کو پہنچا دیا۔

"اماں حضور فوری حکم دیں کہ باغیوں کو ختم کر دیا جائے"۔ ننھی وقار بیگم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"جانِ مادر! جنہوں نے قتل کرنا ہو وہ اجازت لینے نہیں آیا کرتے اور جو اجازت لینے آئیں وہ قتل نہیں کیا کرتے"۔ مغلانی بیگم نے کہا تو گل بنفشہ نے وہی پیغام طہماس خاں کو پہنچا دیا مگر معلوم ہوتا تھا وہ بھی اس فیصلے پر خوش نہیں کہ بیگم عالیہ نے دونوں دشمنوں کو ختم کرنے کی پیشکش قبول کیوں نہ کر لی۔

طہماس خان اور محمد عاقل کچھ دیر خاموش کھڑے رہے پھر طہماس خان نے اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا واسطہ دے کر درخواست کی کہ وہ بیگم عالیہ سے اجازت حاصل کر دیں مگر میاں خوش فہم کو پھر سے درخواست پہنچانے کی جرأت نہ ہوئی۔

"میاں! آپ ہماری جاں نثاری کے گواہ ہیں"۔ طہماس خان نے واپس پلٹتے ہوئے مایوسی سے کہا اور اسی راستے سے واپس چلے گئے۔ میاں خوش فہم خاموش بیٹھا انہیں جاتے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ حکمرانی کے اپنے اپنے اصول کیوں ہوتے ہیں اور یہ اصول الگ الگ کیوں ہوتے ہیں۔ اگر مغلانی بیگم کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو وہ بھی یہ پیشکش مسترد کر دیتا؟ "میرے ہاتھ آ جائیں تو میں دونوں کی کھال میں بھس بھروا دوں"۔ اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔ "اتنے بڑے قاتل کو معاف کرنا اس سے بھی بڑا جرم ہے"۔ طویل اندھیرا راستہ اور پوہ کی سرد رات بیگم عالیہ اور اس کی بیٹیوں کا غم اور خواجہ مرزا خاں کے سپاہیوں کا خوف، اگر طہماس خاں نے انہیں بتا دیا تو کیا ہوگا؟ وہ سوچنے لگا۔ "نہیں طہماس خان ایسی غداری نہیں کر سکتا۔ اس نے اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ میر منو کے گھر کے نمک پر پلنے والا کوئی اتنا نمک حرام نہیں ہو سکتا"۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی، سردی اس کے جسم میں گھستی جا رہی تھی۔

مغلانی بیگم بستر سے اٹھی، بیٹیوں کو پیار کیا اور اپنے اپنے بستروں میں واپس جا کر سو جانے کو کہا۔ محلوں میں پیدا ہونے اور پلنے والی اس کی بیٹیوں پر ایسا وقت بھی آئے گا، اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ اس نے زندگی کا آغاز کہاں سے کیا اور وقت نے کہاں پہنچا دیا؟ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ تہہ خانہ کی دیواروں اور چھت کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی وہ بستر میں واپس آ کر لیٹ گئی اور گل بنفشہ اور گلنار کو شمعدان ایک کونے میں رکھ کر بتی مدھم کر کے سو جانے کا حکم دے کر آنکھیں بند کر لیں مگر نیند کہیں بہت دور چلی گئی تھی۔ اس نے تخیل کے گھوڑوں کی باگیں کھلی چھوڑ دیں اس نے دیکھا کہ وزیراعظم سلطنت مغلیہ عمادالملک دربار لگائے بیٹھا ہے۔ پرچہ نویس اسے لاہور پر خواجہ مرزا خان کی فوجوں کے قبضہ کی خبر دیتے ہیں تو وہ غصہ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ فوجوں کے کمانداروں کو طلب کر کے فوری تیاری کا حکم دیتا ہے اور ہفتوں کا سفر دنوں میں طے کرتا ہوا لاہور پہنچ جاتا ہے۔ خواجہ مرزا خان اور اس کے ساتھی قلعہ اور شہر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں، وہ اپنی ممانی اور منگیتر کو تلاش کرتا ہے اور انہیں ڈھونڈ کر مسند حکومت پر بٹھا کر معافی مانگتا ہے کہ وہ ان کی حفاظت نہ کر سکا۔ بھکاری خان اور اس کے حامیوں کو گرفتار کر کے ان کے سامنے پیش کرتا ہے پھر اس نے دیکھا کہ احمد شاہ ابدالی قندھار میں دربار لگائے بیٹھا ہے۔ لاہور سے ایلچی کے آنے کی اطلاع پر فوری حاضری کا حکم دیتا ہے۔ ایلچی بتاتا ہے کہ خواجہ مرزا خان اور بھکاری خان نے سازش کر کے پنجاب کی حکومت پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کے "فرزند خاص" کی بیگم اور بچیوں کو قید کر لیا ہے۔

ابدالی تلوار پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھاتا ہے۔ "ہم مجرموں کو ایسی سزائیں دیں گے کہ تاریخ عبرت حاصل کرے گی"۔ اور لاہور پر حملہ کی تیاری کا حکم دے دیتا ہے۔ کابل قندھار کی فوجیں اور پشاور کے گورنر یلغار کرتے ہوئے راوی کے اس کنارے نمودار ہوتے ہیں قلعہ کے نوبت خانہ میں خطرے کا نقارہ بجتا ہے۔ خواجہ مرزا خان اپنے ساتھیوں سمیت بھاگ جاتا ہے۔ احمد شاہ ابدالی لاہور پر قبضہ کر کے انہیں عزت اور احترام کے ساتھ شیش محل میں لاتے ہیں، پنجاب کی حکومت ان کے حوالے کر کے شرپسندوں کو سزائیں دیتے ہیں اور بھکاری خان کو ان کے سامنے پیش کر کے عرض کرتے ہیں۔ "سب سے بڑا مجرم حاضر ہے، اس کی سزا آپ تجویز فرما دیں"۔

پوہ کی سنگین رات اس کے خیالات کے گھوڑوں کی پاؤں تلے کچل کر دم توڑ رہی تھی کہ خطرہ کے نقاروں کی آواز تہہ خانہ کے سوراخوں سے چھن چھن کر اندر آنے لگی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ عمدہ بیگم، وقار بیگم، گل بنفشہ اور گلنار گہری نیند سو رہی تھیں۔ اس نے شمعدان اٹھا کر بتی اونچی کی اور دروازے کی کنڈی اتار کر تھوڑا سا کواڑ کھول کر آواز دی۔ "میاں خوش فہم!"

مغلانی بیگم کی آواز پر میاں خوش فہم ہڑبڑا کر اٹھا۔

"جی بیگم عالیہ بندہ شرمسار ہے"۔

"شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں، ذرا جلدی سے جا اور راہداری کی کھڑکی کے سوراخوں سے دیکھو یہ نقارے کیوں بج رہے ہیں"۔ اس نے ایک کاغذ کھولا اسے غور سے دیکھا اور قالین کے نیچے سے ایک موٹی سی آہنی چابی نکال کر اس کا جائزہ لیا پھر وہ چلتی ہوئی عقبی دیوار تک گئی اور نقش و نگار کو غور سے دیکھنے لگی۔ چھ کونے میں بنے ایک دیواری گلدان کے پیندے پر انگلی رکھ کر دبایا تو پتھر اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہٹ گیا۔ اس کے پیچھے ایک آہنی سوراخ تھا، کھڑکی میں داخل ہو کر اس نے وہی چابی آہنی دروازے کے سوراخ میں ڈال کر گھمائی تو ہلکی سی آواز سے دروازے کے پٹ دیواروں کے اندر چلے گئے۔ آگے ایک اور وسیع آراستہ کمرہ تھا جس کے آخری سرے پر ایک قالین لٹک رہا تھا۔ کمرے میں شمعدان روشن کر کے وہ واپس آ گئی۔ بیٹیوں کو جگایا۔ "جلدی سے اس کمرے میں منتقل ہو جائیں"۔ کہہ کر کنیزوں کو حکم دیا کہ سامان اس کمرے میں منتقل کر دیں۔ اس طرح اچانک جگانے اور کمرہ فوری خالی کر دینے کے حکم پر عمدہ بیگم، وقار بیگم اور کنیزیں پریشان دکھائی دیتی تھیں مگر کسی میں وجہ پوچھنے کا حوصلہ نہ تھا۔

میاں خوش فہم نے دروازے پر دستک دی تو مغلانی بیگم نے خود آگے بڑھ کر کواڑ کھولا۔ اس نے بتایا کہ خطرہ کے بعد لڑائی کے نقارے بجنے لگے ہیں اور فصیل پر سے بندوقوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ مغلانی بیگم نے اسے بھی اندر بلا لیا اور دروازہ بند کروا کر اندر سے آہنی کنڈی چڑھا دی۔ میاں خوش فہم کمرہ خالی دیکھ کر حیران رہ گیا۔

مغلانی بیگم نے کمرے میں پہنچ کر سوراخ میں چابی ڈال کر گھمائی اور دروازہ بند کر دیا۔ اس کی بیٹیاں اور کنیزیں ابھی تک پریشان کھڑی تھیں، وہ چلتی ہوئی سامنے کی دیوار تک گئی، قالین ایک طرف ہٹایا تو پیچھے لکڑی کی ایک الماری تھی جس میں پتھر شیشے اور بلور کے مرتبان اور چھوٹے چھوٹے بکس ترتیب سے رکھے تھے، اس نے الماری کا ہینڈل گھمایا تو پوری الماری دروازے کی مانند کھل گئی اس کے پیچھے سیڑھیاں تھیں جو اوپر کو جا رہی تھیں۔

"یہ سیڑھیاں چڑھ کر سب سے اوپر کے زینہ پر پہنچ جائیں اور کان کھلے رکھیں"۔ اس نے میاں خوش فہم کو حکم دیا۔

میاں سیدھا چلتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا، مغلانی بیگم نے ہینڈل گھمایا الماری اپنی جگہ واپس آ گئی۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''الماری میں سے خشک گوشت، روٹی، شہد نکال کر دسترخوان بچھا کر ناشتہ لگائیں، میری بیٹیوں کو بھوک لگی ہے''۔ اس نے گلنار سے کہا اور خود قالین پر تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''اماں حضور! کیا باہر لڑائی ہو رہی ہے؟'' وقار بیگم نے پوچھا تو عمدہ بیگم اور کنیزوں نے کان بیگم کے جواب کی طرف لگا دیئے۔

''جانِ مادر! آثار تو سب لڑائی کے ہیں''۔ اس نے جواب دیا۔

''کون لڑ رہا ہے، غداروں سے؟''

''ہم سمجھتے ہیں مرزا کریم بخش پہنچ گیا ہے''۔ بیگم نے جواب دیا۔

انہوں نے خوش ہو کر مرزا کریم بخش کی کامیابی کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''اماں حضور! پھر ہم ادھر کیوں آ گئے؟'' وقار بیگم نے معصومیت سے سوال کیا۔

''جانِ مادر! جب دوست اور دشمن فوجیں لڑتی ہیں تو محفوظ جگہ بھی غیر محفوظ ہو جاتی ہے''۔ بیگم نے جواب دیا۔

''غداروں کے قبضہ کے وقت ہم وہاں کیوں رہے؟'' عمدہ بیگم نے پوچھا۔

''جب غدار فوج قلعہ پر قابض ہوئی تو تمہارے بابا کے جاں نثار گواہ تھے کہ ہم سلامت ہیں، غدار ہم تک پہنچ بھی جاتے تو انہیں احساس ہوتا کہ گواہ محفوظ ہیں۔ عمادالملک زندہ ہے۔ اب کوئی گواہ نہیں وہ کہہ سکتے ہیں لڑائی میں کس نے کیا کیا، ہم نہیں جانتے فاتح فوج کی نسبت شکست خوردہ سپاہی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں''۔ بیگم نے جواب دیا۔

گلنار نے ناشتہ چنا تو مغلانی بیگم اٹھ کر دسترخوان پر آ بیٹھی، عمدہ بیگم اور وقار بیگم اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ اس نے روٹی کے ٹکڑے پر شہد لگا کر وقار کو دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''عروج میں زوال کو کبھی نہ بھولیں اور زوال میں عروج سے کبھی مایوس نہ ہوں، ہمت اور حوصلہ سب سے بڑی طاقت ہیں انہیں ہمیشہ جمع رکھیں''۔

''اس تہہ خانہ کے بارے میں تو آپ نے ہمیں کبھی نہ بتایا''۔ عمدہ بیگم نے گفتگو کی سنجیدگی کو محسوس کیا۔

''ہر محل میں کوئی ایسی جگہ ہوتی ہے جس کا کم از کم لوگوں کو علم ہوتا ہے''۔

''لیکن یہ سب سامان یہاں کون لایا؟'' وقار بیگم بولی۔

''ایسی جگہ پر ضرورت کا سامان محفوظ رکھا جاتا ہے، حاکموں کے حالات پوچھ کر نہیں بدلا کرتے''۔ اس نے گوشت کا ایک ٹکڑا دانتوں سے کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

گل بنفشہ اور گلنار ذرا ہٹ کر کھڑی تھیں۔ ''گل بنفشہ میاں خوش فہم تک ناشتہ پہنچا دو اور معلوم کرو باہر کیا خبر ہے؟''

گل بنفشہ نے روٹی گوشت کے ٹکڑے اور شہد رکابیوں میں رکھے۔ گلنار نے قالین ہٹایا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ نیم تاریکی میں اونچے زینے چڑھتے ہوئے وہ دو تین دفعہ گرتی گرتی بچی۔ اس کے پاؤں ایسی مشقت کے عادی نہ تھے۔ سانس اکھڑنے لگی تو رک کر اوپر دیکھا میاں خوش فہم دیوار سے ٹیک لگائے گہری نیند سو رہے تھے۔ اس نے رکابیاں سیڑھی پر رکھ دیں اور دبے پاؤں میاں خوش فہم کے قریب پہنچ کر آہستہ سے ''میاں خوش فہم لڑائی کا کیا بنا؟'' پوچھا۔

میاں ہڑبڑا کر اٹھا۔ ''کون ہو تم؟''

''جو کوئی بھی ہوں ہوشیار خبردار اور ذمہ دار پہریدار بہرحال نہیں ہوں''۔

میاں خوش فہم نے آنکھیں ملتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''گل بنفشہ خیریت تو ہے نا؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''یہی معلوم کرنے تو بیگم عالیہ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے''۔ وہ مسکرائی۔

''سب خیریت ہے''۔

''ہاں سونے والے کے لئے تو سب خیریت ہی ہوتی ہے''۔

''دیکھو، میں سویا نہیں بس ذرا اونگھ گیا تھا''۔ میاں شرمندہ ہو گیا۔

''تو بیگم عالیہ کو اطلاع کر دوں کہ حالات ذرا اونگھ رہے ہیں''۔

''دیکھو گل بنفشہ! نیند تو سولی پر بھی آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑتی کم بخت''۔

''اچھا تو میں یہی بتا دیتی ہوں''۔ وہ پیچھے مڑنے لگی۔

''خدا کے لئے گل بنفشہ! ایسا نہ کرنا''۔ میاں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے درخواست کی۔

''تو کیا جھوٹ بولوں؟ میاں جی ہم سے ایسا نہ ہو گا''۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

''گل بنفشہ! ہم نے تمہاری خاطر کئی جھوٹ بولے، کل بھی ہم نے یہ نہیں بتایا کہ طہماس خاں اصل میں تمہاری خیریت معلوم کرنے آیا تھا، میر منو پر جاں نثاری تو سب دکھاوا تھا''۔ میاں نے کہا۔

''دیکھو میاں! ہمیں ایسا مذاق پسند نہیں۔ بیگم عالیہ کا خوف نہ ہو تو ہم اس کمینے کو اتنے جوتے لگائیں کہ سر حلوہ ہو جائے۔ آپ سے تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے، آپ بزرگ ہیں''۔ وہ ناراضگی سے بولی۔

''اس کا سر حلوہ ہو جائے یا پنیر ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں، ہم تو اس لئے خاموش رہتے ہیں کہ آپ کے جوتوں کی خیریت چاہتے ہیں''۔ میاں بھی مسکرا دیا۔

گل بنفشہ نے رکابیاں اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیں۔ ''ناشتہ فرمائیں اور بیگم عالیہ کے لئے باہر کے حالات سے متعلق ٹھیک ٹھیک مراسلہ سوچ لیں''۔

''آپ اس دیوار سے کان لگائیں اور چیونٹی کے چلنے کی آواز بھی صاف سنائی دیتی ہے، نہ کوئی کھڑکی ہے نہ سوراخ پتا نہیں بنانے والوں نے یہ کیا کمال کیا ہے''۔ میاں نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

''بیگم عالیہ کو لڑائی کی خبر مطلوب ہے، چیونٹیوں کے پاؤں میں کس قسم کی پازیب ہیں یہ انہوں نے نہیں پوچھا''۔

''اگر طہماس خاں کے نام کی مٹھاس سے آپ کے کان بالکل بند نہیں ہو گئے تو آپ کو لڑائی کی آوازیں بھی سنائی دینا چاہئے''۔

گل بنفشہ طہماس خاں کا موضوع بدلنا چاہتی تھی۔

''تو بتا دوں کہ لڑائی جاری ہے''۔

''ہاں بلاخوف تردید بتا دیں کان صاف کریں بندوقوں کی آوازیں صاف سنائی دیں گی''۔

''کہہ دوں غداروں کا ستیاناس ہونے والا ہے''۔

''غداروں کا ستیا تو ضرور ناس ہو گا مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ کب ہو گا''۔ میاں نے منہ چلاتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو اچھی خبر ہے، میں بتا دیتی ہوں میاں کہتے ہیں غداروں کا ستیا ضرور ناس ہو گا''۔

''مگر ہم نے یہ تو نہیں کہا، آج ہی ان کا ستیاناس ہو گا۔ کیا معلوم کچھ اور ہو جائے، ہم غلط بات کبھی نہیں کرتے''۔

''ہم تو سجدے میں سر رکھ کر دعائیں کر رہے ہیں، غدار ملیامیٹ ہو جائیں، بیگم عالیہ شیش محل میں واپس جائیں''۔

''تاکہ آپ مرمریں جالیوں کی اوٹ سے طہماس خاں کے درشن کر سکیں''۔ میاں نے بات کاٹی۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"میاں جی ہمیں گھٹیا باتیں پسند نہیں"۔ وہ غصہ میں آ گئی۔

"ہم نے کب کہا ہے، حضور کو گھٹیا باتیں پسند ہیں۔ ہم ایسی رہمت کی جرأت کر سکتے ہیں؟"

"اچھا تو ہم جا رہے ہیں"۔ گل بنفشہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

"ہم خود رکابیاں لے کر آئے تو بیگم عالیہ خفا ہوں گی"۔ میاں خوش فہم نے برتن اس کی طرف بڑھا دیئے۔

قالین ایک طرف ہٹا تو سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ گل بنفشہ جھک کر آداب بجا لائی اور خبر دی کہ لڑائی ابھی تک جاری ہے اور بندوقوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ مغلانی بیگم نشست گاہ سے اٹھی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ محسوس ہوتا تھا اسے کمرے میں اپنی بیٹیوں اور کنیزوں کی موجودگی کا احساس تک نہیں وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ عمدہ بیگم اور وقار بیگم نے ایک دوسری کی طرف دیکھا اور بستروں میں چلی گئیں۔ کنیزیں ایک طرف ہٹ کر کونے میں کھڑی ہو گئیں۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی ایک دیوار تک جاتی اور پھر واپس مڑ کر دوسری کی طرف چل پڑتی۔

"آپ کے خیال میں لڑائی کا نتیجہ کیا ہو گا؟" چلتے چلتے وہ عمدہ بیگم کے قریب آ کر رک گئی۔

"غداروں کو ذلت اور رسوائی نصیب ہو گی"۔ اس نے جواب دیا۔

"ہمارے خیال میں ابھی ان کی ذلت اور رسوائی کا وقت نہیں آیا مرزا کریم بخش کی فوج تعداد میں کم ہے اور اس کے پاس باغیوں جیسے ہتھیار بھی نہیں وہ اپنی جاں نثاری اور وفاشعاری کے جوش میں چڑھ آئے ہیں۔ ہمیں نادر بیگ اور سرفراز خاں کو ہدایت کرنا چاہئے تھی کہ وہ انہیں ایسا کرنے سے روکیں اور انتظار کرنے کا مشورہ دیں"۔ بیگم نے کہا۔

"کیا ہماری فوج پسپا ہو جائے گی؟" وقار بیگم افسردہ ہو گئی۔

"بڑی فتوحات اکثر چھوٹی چھوٹی پسپائیوں کے بعد حاصل ہوا کرتی ہیں اس سے فکرمند نہیں ہونا چاہئے۔"

"تو ہم ہمیشہ اسی جگہ بند رہیں گے؟" وقار بیگم نے سوال کیا۔

"یہ جگہ ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں بنی"۔ بیگم کی آواز بہت مدھم تھی۔

"تو پھر کہاں جائیں گے ہم اماں حضور؟" وقار بیگم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"شیش محل میں"۔ مغلانی بیگم نے اطمینان سے جواب دیا۔

"ہم شیش محل میں واپس جا رہے ہیں؟" دونوں بیٹیوں نے بیک زبان ماں سے پوچھا لیکن وقار بیگم کے انداز میں خوشی تھی اور عمدہ بیگم کے سوال میں حیرانی۔

"ہاں جانِ مادر! ہمیں شیش محل میں واپس جانا ہے"۔ اس نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔

چاروں لڑکیوں کی نگاہیں مغلانی بیگم کے چہرے سے پھسلتی ہوئی آپس میں ٹکرائیں۔

سورج ڈھلے میاں خوش فہم نے اطلاع دی کہ لڑائی ختم ہو گئی ہے۔

"کون جیتا میاں خوش فہم؟" وقار بیگم تو جیسے اس خبر کی منتظر تھی۔

"ابھی کچھ نہیں معلوم"۔ میاں خوش فہم نے سوچ کر جواب دیا اس کا حوصلہ نہ پڑا کہ بتائے ازبک خوشی سے ناچ رہے ہیں۔

"خوشی کے نقارے جو کچھ بتانے والے ہیں وہ ہم جانتے ہیں یہ مرزا کریم بخش کی غلطی تھی، ابھی لڑائی کا وقت نہیں تھا"۔ مغلانی بیگم نے حواس پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وقار بیگم نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ عمدہ بیگم نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگایا اور پیار کرنے لگی۔

گل بنفشہ اور گلنار کی آنکھیں بھیگ گئیں، مغلانی بیگم خاموش بیٹھی ان کی طرف دیکھتی رہی۔

"میاں خوش فہم تم وہیں رہو اور کان کھلے رکھو"۔ اسے یاد آیا کہ میاں ابھی حکم کا منتظر کھڑا ہے۔

"اماں حضور! آپ کہتی تھیں ہمیں واپس شیش محل جانا ہے"۔ ننھی وقار بیگم نے سسکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔

"جانِ مادر ہم نے جو کہا تھا ٹھیک کہا تھا"۔ اس نے آگے بڑھ کر بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔

کنیزوں نے آنکھیں پونچھ کر ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا۔ مغلانی بیگم نے الماری کھول کر ایک بکس کا ڈھکنا اٹھایا، الماری بند کر کے واپس نشست پر آ بیٹھی۔ گل بنفشہ اور گلنار کو قریب بلا کر ایک ایک جڑاؤ انگوٹھی دی۔

"یہ تمہارا انعام ہے، اس آزمائش میں تم نے حوصلہ نہیں ہارا"۔

دونوں کنیزوں نے جھک کر شکریہ ادا کیا اور چور نظروں سے انگوٹھیوں کا جائزہ لینے لگیں۔

"ہم چاہتے ہیں اس دوسرے کمرے میں منتقل ہو جائیں، تم ضروری سامان تیار کرو۔ عمدہ بیگم اور وقار بیگم کپڑے تبدیل کر لیں"۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے حکم دیا۔

کنیزیں سامان سمیٹنے لگیں اور وقار بیگم اور عمدہ بیگم بے دلی سے اٹھیں اور پردے کے پیچھے چلی گئیں۔

قلعہ سے باہر ازبک اور ترک سپاہی خوشی سے ناچ رہے تھے۔ قلعہ کے اندر دیوانِ عام کے سامنے رقص و سرود کی محفل بپا تھی جہاں خواجہ مرزا خان بلند مسند پر تشریف فرما تھے۔ ان کے پہلو میں بھکاری خان اور دائیں بائیں امرائے شہر اور فوجی افسر درجہ بدرجہ بیٹھے تھے۔ گانے اور ناچنے والیوں کو انعام دینے کے لئے خواجہ مرزا خان نے سب افسروں میں اشرفیاں تقسیم کی تھیں۔ لڑائی میں کامیابی کے بعد اس کی حاکمیت مستحکم ہو گئی تھی، اس خوشی میں وہ سب کو شریک کرنا چاہتا تھا۔ سب ایک دوسرے سے بڑھ کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور بڑھ بڑھ کر ناچنے والیوں کو انعام دے رہے تھے۔ تربیت یافتہ رقاصہ نے ایک فارسی غزل چھیڑ دی۔ ایک دوشیزہ میدانِ جنگ سے فتح یاب آنے والے اپنے محبوب کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے اور کہتی ہے۔ "میرے دل کے بعد تم نے دشمنوں کے جسم بھی پارہ پارہ کر دیئے ہیں۔ دشمن تو خراج میں اپنی لاشیں اور مال و متال دے گئے۔ بتاؤ میں کیا پیش کروں؟ کیا تم زندہ جسم قبول کر لو گے؟"

خواجہ مرزا خان نے بھکاری خان کی طرف دیکھا جس نے نظروں میں اسے سمجھا دیا کہ اب وہ حاکم کشور پنجاب ہے اس لئے جذبات و خیالات پر قابو رکھنا اس کی مجبوری ہے۔ باقی افسروں کی مجبوری ان دونوں کی موجودگی تھی اسے محسوس کرتے ہوئے اس نے رقاصہ کو انعام دیا اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا بھکاری خاں امراء اور درباری بھی کھڑے ہو گئے رقاصہ کے تھرکتے پاؤں رک گئے۔

"رقص جاری رہے گا، سب کھل کر خوشی منائیں، ہم جلد ہی واپس آ رہے ہیں"۔ خواجہ مرزا خاں نے کہا اور بھکاری خان کے ہمراہ دیوانِ خاص کی طرف چل دیا۔

مغلانی بیگم کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا، یہ غم خوشی کی محفل میں بھی اس کے اعصاب پر سوار رہا تھا۔ "ہم سمجھتے ہیں مغلانی بیگم لاہور سے باہر نہیں گئی"۔ اس نے چلتے چلتے بھکاری خاں کی رائے معلوم کرنے کو کہا۔

"لاہور میں ہے تو کل شام تک اس کا سراغ مل جانا چاہئے، لڑائی کی وجہ سے ہم اس طرف دھیان نہ دے سکے"۔ بھکاری خان نے جواب دیا۔

*

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آخر شب کے پہریدار اونگھ رہے تھے، رات گئے تک ناچ رنگ اور گانے کی محفلیں اور زوال شب میں پہرہ کی ڈیوٹی حاکم کی تبدیلی کے بعد شیش محل کے پہریدار بدل دیئے گئے تھے، صرف رسمی سا پہرہ رہ گیا تھا۔ خواجہ مرزا خان ابھی تک مہمان خانہ میں مقیم تھے اور حفاظت ان کے ازبک دستہ کے ذمہ تھی۔ قلعہ سے باہر خواجہ قاضی کی فوج کا کیمپ تھا۔ شیش محل میں کسی کو متخل ہونے کی فرصت نہیں تھی مگر رسم پہرہ پھر بھی ادا کی جاتی تھی۔ دالان کے مشرقی دروازے کے سامنے اونگھتے پہریدار نے مرکزی ایوان میں روشنی دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس طرف بھی روشنی دکھائی دی، یہ خواب ہے یا حقیقت اسے سمجھ نہ آیا۔

''تمہارا کماندار کہاں ہے؟'' شمع برادر نے قریب آ کر پوچھا۔

''جی حضور ادھر ہے''۔ وہ ویران شیش محل میں روشنی آدمی اور آواز سے گھبرا گیا۔

''اس کو بلا کر جلدی پیش کرو''۔ شمع بردار نے حکم دیا۔

پہریدار نے اپنے ساتھی کو آواز دی وہ بھی اونگھ رہا تھا، وہ بھاگتا ہوا اس کے پاس گیا اور جھنجھوڑتے ہوئے بتایا کہ اندر سے ایک شمع بردار برآمد ہوا ہے اور کماندار کو طلب کر رہا ہے، اس کا ساتھی بھی گھبرا گیا۔

''ہم کہتے ہیں کماندار کو بلاؤ''۔ شمع بردار چلایا۔

دونوں پہریدار پیچھے دیکھے بغیر دوڑ پڑے وہ چلا رہے تھے۔ ''بھوت...... بھوت''۔ بیرونی دروازے پر متعین پہریداران کی حالت دیکھ کر ہنسنے لگے، سپاہیوں کے قہقہوں اور بھوت بھوت کا شور سن کر کماندار بھی جاگ گیا۔

''کیا بک رہے ہو؟'' اس نے آنکھیں ملتے ہوئے گرج کر پوچھا۔

''یہ کہتے ہیں اندر بھوت چراغاں کر رہے ہیں''۔ ایک سپاہی نے آہستہ سے کہا۔

''ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر اور گھسیٹتے ہوئے اندر پہنچا کر دروازہ بند کر دو، صبح دیکھیں گے بھوت کیا مانگتے ہیں''۔ اس نے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوئے غصہ سے کہا۔

''حضور! وہ آپ کا پوچھ رہے ہیں کہتے ہیں انہیں جلد بلا کر لاؤ''۔ خوفزدہ پہریدار نے کہا۔

''بھوت میرا پوچھ رہے ہیں؟'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''تم نے خواب دیکھا اور نیند میں ہی بھاگ آئے''۔

''قسم ہے، خالق کائنات کی ہم جو کہتے ہیں حقیقت ہے، وہ شمع جلا کر آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں''۔

''بھوت شمعیں جلا کر مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟ چلو میں ان سے خود ملتا ہوں''۔ وہ تلوار اٹھا کر ان کے ساتھ چل دیا۔ دروازے کے قریب پہنچے تو سامنے شمع بردار کھڑا تھا۔ سرد رات میں کماندار کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ پہرہ تبدیلی کے وقت اس نے گھوم پھر کر خالی ایوانوں اور دالانوں کا جائزہ لیا تھا، اب یہ شمع بردار کہاں سے آ گیا؟

''تم نے پہلے کبھی یہاں پہرا دیا ہے؟'' شمع بردار نے پوچھا۔

''نہیں یہ ہماری پہلی رات ہے''۔ کماندار نے گھبرا کر جواب دیا۔

''تمہیں کسی نے بتایا نہیں شیش محل کے پہرہ کے آداب کیا ہیں؟''

''آداب تو حضور کسی نے نہیں بتائے صرف پہرہ دینے کو کہا تھا''۔ وہ گھبرا گیا۔

''جاؤ جلدی قلعہ دار کو لا کر حاضر کرو''۔ شمع بردار نے حکم دیا۔

''حضور! مجھے تو علم نہیں قلعہ دار کہاں ہوتا ہے''۔ وہ کانپ رہا تھا۔

''ڈیوڑھی پر جاؤ اپنے اعلیٰ افسر کو بتاؤ حاکم کشور پنجاب مغلانی بیگم نے قلعہ دار کو یاد فرمایا ہے''۔

''حاکم کشور پنجاب مغلانی بیگم نے یاد فرمایا ہے؟'' اس نے اپنے دل میں دہرایا اس کے چہرے پر سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ مغلانی بیگم کہاں سے آ گئی؟ یہ شمع بردار بھوت ہی تو نہیں؟ اگر مغلانی بیگم کے پاس ایسے بھوت پریت ہیں تو پھر کسی کی خیر یت نہیں۔ سپاہیوں نے شمع کی روشنی میں اپنے افسر کے شرابور چہرے کو دیکھا تو ان کے دل بھی ڈوبنے لگے۔

''تم نے ہمارا حکم سمجھا نہیں یا تعمیل میں تردد ہے؟'' شمع بردار غصہ سے چلایا۔

''کہاں یاد فرمایا ہے، حضور عالیہ حاکم پنجاب نے قلعہ دار کو؟'' کماندار نے بدحواسی چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''حاکم عالیہ کشور پنجاب اپنے محل میں تشریف فرما ہیں اور قلعہ دار کو حاضر کرنے کا حکم دیا ہے''۔

''حضور میں ابھی جاتا ہوں''۔ کماندار جلدی سے مڑا اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگنے لگا۔

بیرونی دروازہ کے پہریداروں نے اپنے کماندار کو بھاگتے دیکھا تو وہ بھی دوڑ پڑے۔ اندرونی دروازہ کے پہریدار سب کو بھاگتا دیکھ کر ان کے پیچھے دوڑنے لگے۔ کماندار چلا چلا کر انہیں رک جانے کا حکم دے رہا تھا مگر وہ ڈیوڑھی کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ ڈیوڑھی پر متعین سپاہیوں نے ان سب کو چیختے چلاتے دوڑتے دیکھا تو گھبرا کر اپنے کماندار کو جگانے دوڑے۔ آوازیں، شور اور چیخ و پکار سے کماندار کی آنکھ کھل گئی۔

''کیا حملہ کر دیا کسی نے؟'' وہ چلایا۔

''حملہ نہیں حضور! وہ محل میں بھوت شمعیں جلا کر قلعہ دار کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں''۔ آنے والوں نے اطلاع دی۔

''اچھا تو تم سب بھوتوں کے خوف سے ڈیوٹی سے بھاگ آئے ہو؟'' اس نے غصہ سے چلا کر پوچھا۔

''ان کے ساتھ ملکہ بھی ہے حضور! وہ کہتے ہیں ملکہ نے قلعہ دار کو طلب فرمایا ہے''۔

''مغلانی بیگم کے بعد بھوتوں کی ملکہ آ گئی ہے محل میں؟'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''حضور وہ مغلانی بیگم خود ہیں''۔

''مغلانی بیگم خود ہیں، بھوتوں کی فوج لے کر محل پر قبضہ کر لیا ہے اس نے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟'' وہ چلایا۔

''فوج نہیں حضور! ایک بھوت تھا اس کے ہاتھ میں شمع تھی''۔

''اور تم سب ایک بھوت سے ڈر گئے؟ کتنی بہادر ماؤں کا دودھ پیا ہے تم نے''۔

''باہر ایک ہی آیا تھا، عالی جاہ! اندر اور بھی شمعیں جل رہی تھیں''۔

ڈیوڑھی کا کماندار سوچ میں پڑ گیا، شیش محل میں اتنی شمعیں کون جلا رہا ہے؟ مغلانی بیگم کو شہر اور نواح شہر میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں تو وہ خود کیوں آئے گی؟ اور کیسے آئے گی؟ اور کہاں سے آ گئی؟ ضرور کوئی گڑبڑ ہے مگر بھوت قلعہ دار کو کیوں بلا رہے ہیں؟

''اور کیا کہتے تھے، بھوت صاحب؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے انہیں بتایا کہ مجھے نہیں معلوم قلعہ دار کہاں ہیں تو انہوں نے کہا جاؤ ڈیوڑھی کے کماندار سے کہو اسے بیگم عالیہ کے حضور پیش کرے''۔

''اچھا تو انہیں یہ بھی معلوم ہے میں یہاں ہوں؟'' وہ سوچنے لگا۔ ''تم اپنی ڈیوٹی پر جاؤ میں کچھ کرتا ہوں''۔ اس نے حکم دیا۔

''مگر ہم......''

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

”مگر ہم کچھ نہیں خواجہ سعید کو پتا چل گیا کہ تم ڈیوٹی سے اس طرح ڈر کر بھاگ آئے تھے تو تمہاری چڑیاں اتروا دے گا“۔ اس نے بات کاٹ دی۔

محل کے پہریدار آہستہ آہستہ واپس چل دیئے، ان کا کماندار اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے ان سب کو ڈانٹنے لگا۔ ”میں تو پیغام پہنچانے کے لئے بھاگ رہا تھا، تم ڈیوٹی سے کیوں بھاگ آئے؟ بزدل کہیں کے میں تم سب کی چڑیاں اتار دوں گا“۔

وہ سر جھکائے چلے جا رہے تھے، کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ کوئی یہ بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ آپ کی گھبراہٹ اور پسینہ دیکھ کر ہم بھی گھبرا گئے تھے۔

اب کیا کیا جائے؟ کماندار سوچنے لگا۔ اسے معلوم نہیں تھا قلعہ دار کون ہے۔ خواجہ مرزا خان کی اپنی فوج کے افسر اعلیٰ نے اپنے آدمیوں کو قلعہ کے پہرہ کی ڈیوٹی پر لگا دیا تھا۔ اس نے دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور ایمن آباد کی فوج کے کیمپ کی طرف چل دیا مگر اسے کیا بتائے گا؟ وہ سوچتا جا رہا تھا اگر اس نے پوچھ لیا کہ ڈیوڑھی کی ڈیوٹی سے کیوں آ گئے تو کیا جواب دے گا؟

جب وہ قلعہ کے سامنے کیمپ کی طرف جا رہے تھے تو شاہی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ ”اللہ اکبر...... اللہ اکبر!“ وہ چلتے چلتے رک گئے، اذان مکمل ہونے تک وہ کھڑے رہے اور دعا مانگ کے چل پڑے۔

”جہاں تک آ گئے ہو وہیں کھڑے رہو اور اپنی نشانی بتاؤ“ کیمپ کے پہریدار انہیں دیکھ کر چلائے۔

وہ کھڑے ہو گئے، اپنے نام اور نشانی بتائی تو اس نے پہچان کر آگے آنے کی اجازت دے دی۔

”مغلانی بیگم کماندار کو طلب کر رہی ہیں میں انہیں بتانے آیا ہوں“۔ اس نے آمد کا مقصد بیان کیا۔

”مغلانی بیگم کہاں سے آ گئیں، تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟“ کیمپ کے پہریدار نے طنز کیا۔

”زیادہ باتوں کا وقت نہیں مغلانی بیگم کہاں سے آ گئیں یہ میں کماندار کو بتاؤں گا“۔ وہ اس کے خیمے کی طرف چل پڑے۔

پہریدار نے دوسرے پہریدار کو بتایا دوسرے نے تیسرے کو اس کے کماندار کو بتانے تک آدھے کیمپ میں مشہور ہو گیا تھا کہ مغلانی بیگم شیش محل میں موجود ہے اور کماندار کو طلب فرمایا ہے۔ کماندار اپنے خیمے کے سامنے نماز کی تیاری کر رہا تھا۔ جب ڈیوڑھی کے پہریدار کی آمد اور مغلانی بیگم کی طلبی سے اسے آگاہ کیا گیا وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ مغلانی بیگم کیسے اور کہاں سے آئی؟ یہ پوچھنے اور سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا اور جلدی جلدی نماز کی ادائیگی میں لگ گیا۔

خواجہ مرزا خاں نماز سے فارغ ہوئے تو اس کے حفاظتی دستہ کے کماندار نے اطلاع دی کہ کیمپ کا کماندار آیا ہے اور کہتا ہے کہ مغلانی بیگم شیش محل میں قلعہ دار کو طلب کر رہی ہیں۔ خواجہ مرزا خاں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ”مغلانی بیگم شیش محل میں قلعہ دار کو طلب کر رہی ہیں؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”جی حضور! کیمپ کے کماندار نے یہی بتایا ہے“۔

”اسے ہمارے حضور پیش کرو“۔ خواجہ نے حکم دیا۔

کیمپ کماندار کمرے میں داخل ہوا اور آداب بجا لا کر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

”یہ ہم کیا سن رہے ہیں؟“ خواجہ نے اطمینان سے پوچھا۔

کیمپ کماندار نے ڈیوڑھی کے کماندار اور محل کے پہریداروں کے حوالے سے جو کچھ سنا تھا تفصیل سے بتا دیا۔

”تم دونوں جاؤ اور خود دیکھ کے آؤ کہ شیش محل میں کون ہے اور کیا کہتا ہے“۔ اس نے حکم دیا۔

وہ دونوں آداب بجالا کر کمرے سے باہر نکل گئے

خواجہ مرزا خان واقعات و ممکنات پر غور کرنے لگا۔ مغلانی بیگم کہاں سے اور کیسے آ گئی؟ وہ اتنے شب و روز کہاں تھی؟ اگر وہ قلعہ کے اندر ہی تھی تو نادر بیگ اور سرفراز خان بھی اس کے ساتھ ہی ہوں گے ان کے اور افسر بھی ہیں، ہو سکتے ہیں مگر وہ تھے کہاں؟ کیا مرزا کریم بخش نے ان کے حکم پر حملہ کیا تھا؟ وہ اس کی کامیابی کے خواب دیکھ رہی تھی؟ اس کی شکست کا پتا چلا تو باہر آ گئی؟ مگر مغلانی بیگم چاہتی کیا ہے؟ چلو سب قابو آ گئے وہ خوش ہو گیا اور سجدہ میں گر گیا۔

سجدے سے سر اٹھا کر کمانداروں کی واپسی کا انتظار کرتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ مغلانی بیگم کی موجودگی کی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟

دونوں کمانداروں نے آ کر بتایا کہ مغلانی بیگم اس کی بیٹیاں کنیزیں اور خواجہ سرا محل میں موجود ہیں۔ ”ہم نے خواجہ سرا میاں خوش فہم سے بات کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ بیگم عالیہ محل لوٹ لینے پر سخت ناراض ہیں اور کہتی ہیں کہ فوری طور پر اشیائے ضرورت اور ملازم فراہم کئے جائیں“۔

خواجہ مرزا خان مسکرا دیا۔ ”اور کوئی حکم تو نہیں دیا بیگم عالیہ نے؟“

”میاں خوش فہم کہتے ہیں کہ بیگم صاحبہ نے حکم دیا ہے کہ حضور ان سے ملیں“۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”شیش محل کے گرد پہرہ سخت کر دیا جائے، ہماری اجازت کے بغیر کسی کو بیگم سے ملاقات اور بات نہ کرنے دی جائے۔ میاں خوش فہم جو کچھ طلب کریں فراہم کیا جائے۔ ہم خود بیگم سے ملنا چاہتے ہیں“۔ خواجہ مرزا خاں نے حکم دیا اور سوچنے لگا کہ بیگم کیا کہہ سکتی ہے اور اسے کیا جواب دینا چاہئے۔ دونوں کمانداروں کے جانے کے بعد اس نے خواجہ سعید کو طلب کیا تاکہ بیگم سے ملاقات سے پہلے اس سے مشورہ کر سکے۔

کیمپ سے اطلاع مسجد میں پہنچی اور مسجد سے سارے لاہور میں پھیل گئی کہ مغلانی بیگم اپنے خادموں اور بیٹیوں سمیت شیش محل میں واپس آ گئی ہے اور انہوں نے قلعہ دار کو فوری پیش کرنے کا حکم دیا ہے پھر اس میں بہت سے اضافے ہو گئے۔ کسی نے کہا۔ بیگم عالیہ نے قلعہ دار کو خوب ڈانٹا ہے۔ کسی نے سنا۔ خواجہ مرزا خان نے خود حاضر ہو کر معافی مانگی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ وہ بھکاری خان اور اس کے ساتھیوں کو جیل میں ڈال دے گا اور پنجاب اور شہر کے حالات ٹھیک ہوتے ہی واپس ایمن آباد چلا جائے گا۔ مغلانی بیگم سے خواجہ مرزا خان کی ملاقات سے پہلے ہی شہر میں مشہور ہو گیا تھا کہ خواجہ مرزا خان نے مغلانی بیگم کے حکم پر انہیں خدام اور ضرورت کی ہر چیز فراہم کر دی ہے۔ اہل لاہور قلعہ پر خواجہ مرزا خان کے قبضہ اور مغلانی بیگم کی گمشدگی پر افسردہ تھے۔ ان کی واپسی کی خبر سن کر خوش ہو گئے اور ایک دوسرے کو مغلانی بیگم کی حکومت کی بحالی کی خوشخبریاں سنانے لگے۔ ”بابا خان ولی نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ احمد شاہ ابدالی کے پاس پیغام بھیج رہے ہیں کہ وہ آئیں اور مغلانی بیگم کی حکومت بحال کرائیں“۔

”ہم نے تو سنا ہے۔ انہوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر بیگم کی حکومت بحال نہ کی گئی تو وہ خود قندھار جائیں گی اور ابدالی کو ساتھ لے کر آئیں گی۔ بیگم کا ہونے والا داماد مغل بادشاہ کا وزیراعظم ہے، خواجہ مرزا خاں کو علم ہے کہ وہ اپنی ساس اور منگیتر کی بے عزتی کی اسے سخت سزا دے گا“۔ مرزا کریم بخش فوج جمع کر رہا ہے اور آدینہ بیگ اس کی مدد کو آنے والا ہے“۔ ”بھوانی داس اسی روز سے غائب ہے وہ آدینہ بیگ کو لینے ہی تو گیا ہے آدینہ بیگ غداروں کو سزا دے کر عماد الملک کو خوش کرنا چاہتا ہے“۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں لوگ کہنے لگے۔

ظہر کی نماز کے بعد مغلانی بیگم تلاوت میں مصروف

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

تھیں کہ گل بنفشہ آداب بجالا کر مؤدب کھڑی ہو گئی۔ بیگم نے قرآن بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔ ”میاں خوش فہم عرض گزار ہیں کہ خواجہ مرزا خان اذن باریابی چاہتے ہیں“۔

مغلانی بیگم نے قرآن سنہری جزدان میں بند کر کے کنیز کے حوالے کیا اور پردہ ہٹا کر نشست گاہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”میاں کو خبر دو کہ خواجہ مرزا خان کو پیش کریں“۔

وہ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، میاں خوش فہم پردہ اٹھا کر خواجہ مرزا کے ہمراہ اندر آ گیا، وہ خود دروازے کے پاس کھڑا رہا، خواجہ مرزا خاں نے ذرا آگے بڑھ کر بیگم کو آداب عرض کیا۔

”تشریف رکھیں نواب خواجہ مرزا خان!“ مغلانی بیگم نے طنز کیا۔

خواجہ مرزا خان نے ارد گرد دیکھا اور کوئی نشست نہ پا کر کھڑا رہا۔

”نواب خواجہ مرزا خان کو ہمارے حضور ہفتہ کے روز حاضری دینا تھی، اتنی تاخیر کا کیا سبب ہوا؟“ بیگم نے پوچھا۔

خواجہ مرزا خاں میدان اور انتظام کا آدمی تھا، اسے درباری زندگی اور گفتگو کا تجربہ نہیں تھا۔ وہ مغلانی بیگم کے طنز کے تیروں کے کرب سے تڑپ اٹھا۔ یہ خاتون قید کی حالت میں بھی حاکم کو ایسے مخاطب کر رہی ہے؟ یہ امر اس کے لئے اور بھی تکلیف دہ تھا۔

”دراصل بیگم صاحبہ! حالات نے مجھے ایسا کرنے پہ......“

”نواب خواجہ مرزا خان آپ نے ازبک ماں کا دودھ پیا ہے دودھ کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ہم سب جانتے اور سمجھتے ہیں۔ میر منو، اس کے والد اور دادا نے اپنی ماؤں کے دودھ کی مجبوریوں کی پابندی کی۔ آپ نے اپنی ماں کے دودھ کی لاج رکھ لی“۔ مغلانی بیگم نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میری ماں اور خاوند کے خاندانوں نے چالیس سال تک پورے ہندوستان پر حکومت کی۔ اب بھی ہمارا بیٹا مغل ہندوستان کا وزیر اعظم ہے۔ تم نے اس کی ماں اور منگیتر کی توہین کی ہے۔ ترک بغاوت معاف کر سکتے ہیں، توہین کبھی معاف نہیں کیا کرتے“۔ بیگم نے کہا۔

”کشور پنجاب کے حالات تیزی سے روبہ زوال ہیں، بادشاہ اور وزیر اعظم دونوں فکر مند ہیں۔ پنجاب کے مسلمان سکھوں کے ہاتھوں تنگ ہیں، امرائے دربار اور پنجاب کی درخواست پر ہم نے حالات بہتر بنانے اور عماد الملک کی حکومت مضبوط بنانے کے لئے مجبوراً ایسا کیا ہے“۔ مرزا نے وار کا درد سہہ کر رک رک کر جواب دیا۔

”جو کوئی مغل اور ترک سردار کہیں بغاوت کرتا ہے، خود مختاری اور سرکشی کرتا ہے، مغلیہ سلطنت کی مضبوطی اور اسلامیان ہند کے تحفظ کے لئے ہی کرتا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں“۔ بیگم نے کہا۔

”ہمیں افسوس ہے کہ متعلقہ افسروں کی کوتاہی کے سبب آپ کے محل کی اشیاء غائب ہو گئیں۔ ہم نے حکم دیا ہے کہ آپ کو ہر سہولت اور ہر چیز فراہم کی جائے اور آپ کے مقام اور آرام کا پوری طرح خیال رکھا جائے“۔ خواجہ مرزا خاں نے بات چیت میں اپنے کو بے مایہ پا کر موضوع بدلا۔

”اگر ازبک ہمارا محل نہ لوٹتے تو یہ افسوس کی بات ہوتی۔ تم نے اور تمہارے سپاہیوں نے اپنے اجداد کی روایت کی پابندی کی، یہ خوشی کی بات ہے“۔ مغلانی بیگم نے ایک اور تیر چھوڑا۔

”ہم نے محل اور آپ کی حفاظت کے سخت احکامات دیئے تھے، آپ محل میں ہوتیں تو کسی کو ایسی گستاخی کی جرأت نہ ہوتی“۔

”ہم نے سوچا آپ پر ہماری حکومت کی حفاظت کا بوجھ کیا کم ہے جو مزید بوجھ ڈال دیں۔ اس لئے ہم محل سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ اب بھی ہم آپ پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتے۔ ہم اپنے والد مغفور کی حویلی میں منتقل ہونا چاہتے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ میر منو کے خاندان کے جاں نثار نواب خواجہ مرزا خان کو ایک اور جاں نثاری کا مظاہرہ کر کے خوشی ہو گی“۔

”ہمارے افسر آپ کی خدمت کے لئے ہمہ وقت حاضر رہیں گے۔ ہم حضور کی یہ خواہش پوری کرنے کی کوشش کریں گے“۔ خواجہ مرزا خان نے کہا۔ اس میں طنز کے مزید تیر سہنے کی طاقت نہیں تھی اسی کرب میں وہ بھول گیا کہ اسے رخصتی کے لئے اجازت بھی لینا چاہئے۔

بیگم نشست پر بیٹھی رہی خواجہ مرزا خان آداب عرض کر کے کمرے سے نکل گیا۔ میاں خوش فہم خواجہ مرزا خان کی بے بسی اور بے کسی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

*

خواجہ مرزا خان شاندار جلوس بنا کر نکلا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں بندوق بردار، نیزہ بردار اور گھوڑ سوار قطاروں میں چل رہے تھے۔ قلعہ کے مستی دروازہ سے سوا سال بعد حاکم پنجاب کا جلوس برآمد ہوا تھا۔ خواجہ نے صابر شاہ کے مزار تک جانے کے لئے اس لئے طویل راستہ چنا تھا کہ اہل لاہور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ ان کا حاکم کون ہے اور حکومت کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ راہ چلتے لاہوریے جلوس کو ایک نظر دیکھتے اور آگے چل دیتے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی شان و شوکت کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہے۔ قلعہ کا نصف چکر کاٹ کر روشنائی دروازہ کے سامنے پہنچے تو شاہی مسجد کی طرف سے نمازی مغرب کی نماز ادا کر کے باہر آ رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے خوشی کا نعرہ لگایا نہ آگے بڑھ کر رکاب تھام کر مبارکباد دی۔ خواجہ مرزا خان کو لاہوریوں کے رویہ پر بہت غصہ آیا، اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی فوج کو لاہور کو لوٹ کر اہل لاہور کو اچھی طرح سزا دینے کا حکم دے۔ پھر خیال آیا کہ وہ بیرونی فاتح نہیں اندرونی حملہ آور تھا۔ اس کے ایسا کرنے سے شاہجہان آباد اور قندھار دو جگہ کے بادشاہ ناراض ہوں گے۔ رعایا کے دل میں نفرت بڑھ جائے گی، شاہی مسجد کے عقب میں مزار کے سامنے پہنچ کر جلوس رک گیا، سوار گھوڑوں سے اتر آئے۔ مجاور حیران تھے انہوں نے آج تک اتنے بڑے جلوس کے ساتھ کسی کو حاضری دیتے نہیں دیکھا تھا۔ سوار اپنے اپنے گھوڑوں کی لگامیں تھامے میدان میں دور تک پھیل گئے اور خواجہ مرزا خان اپنے معتمد سرداروں کے جھرمٹ میں پیدل مزار کے احاطہ میں داخل ہو گیا۔ ان کے پیچھے باوردی خدام نذرانوں کے تاشے اٹھائے ہوئے چل رہے تھے۔ وہ سر جھکائے سیدھا چلتا ہوا پیر صابر شاہ کی قبر پر حاضر ہوا۔ فاتحہ پڑھی اور قبر کے پاؤں کی طرف بیٹھ کر وظیفہ پڑھنے لگا۔ عام زائرین حاکم اور اس کے جلوس کو دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئے تھے اور دور دور کھڑے انہیں حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ ایک بار پھر فاتحہ پڑھ کر مرزا نے ایک سردار کو اشارہ کیا تو وہ مجاوروں میں اشرفیاں بانٹنے لگا۔ خواجہ مرزا خان خود سر جھکائے قبر کے پائنتی کھڑے رہے۔ اشرفیاں بٹ چکیں تو وہ ننگے پاؤں بابا خان ولی کے حجرے کی طرف چل دیئے۔ سردار اور خدام سر جھکائے پیچھے چلنے لگے۔ حجرے کے دروازے پر متعین خادم سے اس نے بابا جی سے حاضری کی اجازت کے لئے کہا اور مؤدب کھڑا رہا۔ خادم کافی دیر بعد برآمد ہوا اور بتایا کہ بابا جی نے صرف ایک آدمی کو حاضری کی اجازت دی ہے، باقی کوئی اندر نہیں جا سکتا۔ خواجہ مرزا خان نے اپنے ساتھیوں کو وہیں کھڑے رہنے کا حکم دیا اور خود خادم کے پیچھے حجرے میں داخل ہو گیا۔ بابا خان ولی آنکھیں بند کئے وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ خواجہ مرزا خان ان کے سامنے مؤدب کھڑا

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

رہا۔ انہوں نے آنکھیں اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''فقیر صرف دعا کرتا ہے کام سب خدا کرتا ہے، حاضری اس کے حضور لازم ہے''۔

خواجہ مرزا خان نے جھک کر ان کا دایاں ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر چوما۔ بابا خان ولی نے ان کے کندھے پر تھپکی دی۔ ''فقیر کی کٹیا میں حاکموں کے شایانِ شان مسند نہیں، چٹائی پر بیٹھ سکتے ہو تو بیٹھ جاؤ''۔ انہوں نے سامنے کی دیوار کے ساتھ بچھی چٹائی کی طرف اشارہ کیا۔

خواجہ مرزا خان الٹے قدموں چلتا ہوا چٹائی تک گیا۔ ''دنیاوی حاکموں کو مسندیں عطا کرنے والی یہ مسند سب سے مقدس اور بلند تر ہے۔ آپ کا کرم ہے کہ اس پر بیٹھنے کی اجازت دی''۔ اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''حکم اللہ کا، عطا اللہ کی ہے، رضا اللہ کی ہے، وہی عطا کرتا ہے، وہی چھین لیتا ہے۔ اس کے حکم کی پابندی کرو، اس کے بندوں کی حفاظت کرو وہ تمہاری حفاظت کرے گا؟'' بابا خان ولی نے نیم وا آنکھیں اس کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ رہنمائی نہ فرماتے، دعا نہ کرتے تو بندہ بھٹک گیا ہوتا۔ یہ سب آپ کا کرم ہے''۔ خواجہ نے کہا۔

''یہ مت کہو یہ کلمہ کفر ہے۔ کرم کرنے والی خدا کی ذات ہے، فقیر صرف دعا کر سکتا ہے۔ ہم نے جو کچھ کیا اللہ کی رضا کے لئے کیا۔ ہم دعا کرتے رہے، اس میں اللہ کی رضا شامل تھی۔ ہم کچھ نہیں سب وہ ہے، جس کے ہاتھ میں فقیر کی جان اور آن ہے''۔

''خاکسار سے بہت گناہ ہوا کہ اس روز آپ سے اجازت نہ لی، معافی کے لئے حاضر ہوا ہوں''۔

''معاف کرنے والا وہ ہے جس کے فرشتے اعمال کا حساب رکھتے ہیں۔ فقیر کو تمہارے ارادے کا علم دیا گیا تھا، وہ اس کی تکمیل کی دعا کرنے لگا۔ مسلم رعایا اور حکومت کے لئے یہ تبدیلی بہتر تھی۔ اس خاتون نے فساد پھیلایا رعایا کو مفسدوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ حکومت اور رعایا کا مالک اس کی جگہ کسی اور کو لے آیا''۔

''اس خاکسار کی درخواست ہے کہ حضور مسلم حکومت اور رعایا کی خدمت کے کام میں کامیابی کے لئے دعا اور رہنمائی فرمادیں''۔

''رہنمائی وہ کرتا ہے جو راہیں متعین کرتا ہے۔ فقیر صرف دعا کر سکتا ہے اور مناسب گھڑی میں دعا کرے گا۔ آپ جائیں اپنا اور فقیر کا وقت ضائع نہ کریں۔ وقت تمہارے پاس امانت ہے اسے معاملات مملکت کی اصلاح میں خرچ کریں''۔ بابا خان ولی نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

خواجہ مرزا خان چٹائی سے اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے بابا خان ولی کے پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔ ''بہت حقیر سا نذرانہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں''۔

''دنیا اور اس کی دولت اہل دنیا کے لئے ہیں، فقیر کی دولت فقر ہے ہم اس دولت میں دنیا کی ملاوٹ نہیں کیا کرتے''۔ بابا خان ولی نے کہا۔

''خاکسار کا ہرگز مطلب یہ نہیں درخواست ہے کہ یہ نذرانہ اپنے ہاتھ سے حاجت مندوں میں تقسیم فرمادیں''۔

''اپنے ہاتھ سے جو کچھ ہے اس چٹائی پر رکھ دو، ہم خالق کی رضا کے پابند ہیں''۔

خواجہ مرزا خان اٹھے اور حجرہ سے باہر نکل گئے۔ خدام سے نذرانے کے تاشے لئے اور چٹائی پر رکھ کر ایک بار پھر بابا خان ولی کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور الٹے پاؤں دروازے کی طرف چل دیئے۔

''رک جاؤ اور مرشد کی بتائی ایک حکایت سنو۔ اس دیس میں جہاں برف ہوتی ہے۔ ایک سانپ سردی سے مر رہا تھا۔ ایک درویش نے دیکھا تو اٹھا کر چغے کے نیچے رکھ لیا کہ جسم اور چغے کی گرمی سے مرنے سے بچ جائے۔

سانپ کو ہوش آیا تو درویش کو ڈس لیا۔ مرشد نے حکایت بیان کر کے حکم دیا۔ سانپ کو کبھی جسم کے قریب نہ رکھو۔ جسم انسان کا بھی ہے اور حکومت کا بھی ہوتا ہے۔ مرشد نے یہ بھی حکم دیا تھا۔ بلی کو کبھی اتنا تنگ نہ کرو کہ وہ شیرنی بننے پر مجبور ہو جائے۔ سمجھ سکو تو فائدہ ہوگا۔ فقیر نے جو کہنا تھا کہہ دیا، اب جاؤ اپنا کام کرو''۔ بابا خان ولی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''حضور کا کرم کہ رہنمائی فرمائی، بندہ شکر گزار ہے اور پوری طرح عمل کرے گا''۔

''جائیں اور جو مناسب سمجھیں کریں، فقیر نے اپنا فرض ادا کر دیا''۔

خواجہ مرزا خان اسی طرح چلتا ہوا حجرے سے باہر نکل گیا۔ دروازے پر کھڑے سرداروں اور خدام کو ساتھ لے کر ایک بار پھر سید صابر شاہ کی قبر پر حاضری دی، فاتحہ پڑھی اور مزار کے احاطہ سے باہر نکل آئے۔

رات کا اندھیرا کافی گہرا ہو چکا تھا، جلوس بادشاہی مسجد کے پاس سے گزرا تو خواجہ مرزا خان کو وہ رات یاد آئی جب بابا خان ولی نے اسے کشور پنجاب کی حاکمیت کی خوشخبری دی تھی اور بھکاری خان کی بجائے مغلانی بیگم کا ساتھ دینے کی ہدایت کی تھی۔ وہ بابا خان ولی کی ہدایت اور مشورہ کے فوائد گننے لگا۔ مشیروں اور بھکاری خان نے مشورہ دیا تھا کہ مغلانی بیگم کو شیش محل میں رکھا جائے اور سخت نگرانی کی جائے۔ اسی مشورہ کی وجہ سے اس نے مغلانی بیگم کو اس کی والدہ کی حویلی میں منتقل کرنے سے اتفاق نہیں کیا تھا مگر باباجی کی ہدایت کے بعد اس نے بیگم کو اس کی ماں کی حویلی پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔ ''جسم انسان کا بھی ہوتا ہے اور حکومت کا بھی اور سانپ کو کبھی جسم کے قریب نہیں رکھنا چاہئے''۔ بابا خان ولی کے الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ مستی دروازے کی طرف جانے کی بجائے وہ اپنے کیمپ کی طرف مڑ گیا۔ سرداروں کو وہیں چھوڑا اور ذاتی دستہ کے ساتھ عالمگیری دروازے سے قلعہ میں داخل ہو گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ بابا خان ولی کی تائید اور حمایت کا یہ بھی مطلب تھا کہ احمد شاہ ابدالی مغلانی بیگم کی مدد کو نہیں آئے گا۔ مغل دربار کے امراء کی تائید و حمایت اور بادشاہ سے سند حکومت حاصل کرنے کے لئے بھکاری خاں نے پنجاب کے امراء اور جاگیرداروں کو لاہور میں طلب کیا تھا تاکہ ان سب کی طرف سے بادشاہ کو عرضداشت بھیجی جائے۔ دونوں بادشاہوں سے معاملات سلجھ جانے کے بعد مغلانی بیگم کی حیثیت واقعی بلی سے زیادہ نہیں ہو گی پھر اسے تنگ کر کے شیرنی بننے پر کیوں مجبور کیا جائے۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

*

آدینہ بیگ دالان میں ایسے ٹہل رہا تھا جیسے پنجرے میں بند چڑیا گھر کی لومڑی بے چینی سے اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہے۔ وہ بار بار اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ لاہور پر خواجہ مرزا خان کے قبضہ کا اسے علم ہو چکا تھا لیکن بھوانی داس نے جو حالات زبانی بیان کئے وہ اس کے لئے پریشان کن تھے۔ جس شب خواجہ مرزا خاں نے قلعہ پر قبضہ کیا اس سے اگلی صبح بھوانی داس کوٹ لکھپت چلا گیا تھا۔ تین چار روز بعد واپس آ کر اس نے حالات کا جائزہ لیا اور نئی ہدایات لینے بذات خود جالندھر پہنچ گیا۔ آدینہ بیگ نے اپنے جرنیل صدیق خاں کو مشورہ کے لئے بلایا تھا اور بھوانی داس کی رپورٹ کی روشنی میں مستقبل کے خاکہ پر غور کر رہا تھا۔ خادم نے اطلاع دی کہ صدیق خان حاضر ہیں تو وہ ''پیش کریں'' کہہ کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ مغل فوجی جرنیلوں جیسا لباس زیب تن کئے صدیق خاں کمرے میں داخل ہوا اور روایتی انداز میں سلام کر کے حکم کا منتظر کھڑا رہا۔

''ہم بھوانی داس کو جلد واپس لاہور بھیجنا چاہتے ہیں لیکن اس سے پہلے آپ سے مشورہ ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تو آپ جانتے ہیں کہ ایمن آباد کے ضلع دار خواجہ مرزا خان نے قلعہ اور حکومت پر قبضہ کر لیا ہے اور مغلانی بیگم کو عملاً قید کر رکھا ہے" اس نے صدیق خاں کو سامنے کی دیوار کے ساتھ نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

"جی حضور! معلوم ہے"۔ صدیق خان نے جواب دیا۔

"بھوانی داس کی اطلاع ہے کہ خواجہ مرزا خان نے باقاعدہ دربار عام منعقد کر کے اپنے پنجاب کا صوبیدار ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اس کے سر پر ہیروں سے مرصع قبا تھی اور جسم پر لباس فاخرہ۔ دربار میں موجود سب مغل ازبک اور ترک فوجی افسروں امرائے دربار نے اسے مبارکباد دی اور اپنی اطاعت کا اعلان کیا۔ بھکاری خان کی مدد مشورہ اور تعاون سے انہوں نے حکومت پر قبضہ کیا ہے۔ اب وہ پنجاب کے امراء اور جاگیرداروں کو جمع کر کے ان کی طرف سے بادشاہ کو مشترکہ عرضداشت بھجوا رہے ہیں کہ مغلانی بیگم کے منتشر کردہ نظم کی بحالی اور سکھوں کی سرکوبی کے لئے خواجہ مرزا خان کو پنجاب کی حکومت کی سند جاری فرمائی جائے"۔ آدینہ بیگ نے اپنے جرنیل کو بتایا۔

"عمادالملک کی موجودگی میں بادشاہ ایسا نہیں کرے گا"۔ صدیق خاں نے رائے دی۔

"مغل دربار کے بیشتر امراء بھکاری خان کے حامی اور مغلانی بیگم کے مخالف ہیں۔ اگر پنجاب کے سب جاگیردار اور امراء مشترکہ عرضداشت بھیجتے ہیں تو عمادالملک کے لئے اپنی ساس کی حمایت میں سب کی مخالفت ممکن نہیں ہوگی۔ مغلانی بیگم خاتون ہے اور یہ اس کا سب سے کمزور پہلو ہے"۔

"جملہ مغل اور ترک امراء اور جاگیردار خواجہ مرزا خاں کی قیادت مان لیں یہ ان کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا"۔ صدیق خان نے کہا۔

"بھکاری خان کے بعد اشور علی خان نے بھی خواجہ مرزا خان کی اطاعت اور حمایت کا اعلان کر دیا ہے جو مغل اور ترک سردار خواجہ مرزا خان سے منصب و مرتبہ میں ممتاز تھے۔ جیسے بھالا بخش خان، فرمان بیگ خان، ابراہیم قلی خان اور اسماعیل خاں انہوں نے بھی وفاداری کا اعلان کر کے خلعتیں وصول کر لی ہیں اور نئے تقرر نامے حاصل کئے ہیں۔ خواجہ مرزا خان مغل سرداروں میں "خان" کے خطاب بانٹ رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے ترک اجارہ داری کے مسئلہ پر وہ سب ایک ہیں"۔

"آپ بجا فرماتے ہیں مگر زیادہ دیر تک وہ خواجہ مرزا کے وفادار نہیں رہ سکتے، یہ ان کے خون میں نہیں"۔

"یہ درست ہے مگر فی الحال وہ متحد ہیں اور اس اتحاد سے خواجہ مرزا خان کے لئے حصول سند آسان ہو جائے گی جو ہمارے نقطہ نظر سے اچھا نہیں ہو گا۔ وہ ہوشیار نوجوان ہے، اس کے بھائی اور قبیلے کے ہزاروں سوار اس کے ساتھ ہیں۔ اگر کچھ وقت مل گیا تو وہ امن قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا"۔

"احمد شاہ درانی اس تبدیلی پر خاموش رہے گا؟"

"اطلاع یہ ہے کہ ان کے نمائندہ بابا خان ولی نے خواجہ مرزا خان کو مکمل تائید و حمایت کا یقین دلایا ہے اور بتایا ہے کہ ابدالی کی دلی خواہش ہے کہ کوئی ایسا صوبیدار ہو جو مسلمانوں کو تحفظ اور امن دے سکے اور حکومت چلا سکے۔ بابا خان ولی مغلانی بیگم سے خوش نہیں اور خواجہ مرزا خان کی کھل کر حمایت کر رہے ہیں اس سے یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ بابا خان ولی احمد شاہ ابدالی سے خواجہ مرزا خان کے لئے سند حکومت نہ بھی حاصل کر سکیں تو بھی انہیں مغلانی بیگم کی حمایت میں کوئی اقدام کرنے سے باز رکھ سکیں گے"۔

"اگر صورت حال ایسی ہے تو پھر ہمارے لئے واقعی قابل غور ہے"۔ صدیق خاں نے سر تسلیم کر دیا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ مرزا کریم بخش کے منتشر

سپاہیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنی فوج میں بھرتی کر لیا جائے۔ جو مقامی فوجی مغلوں اور ترکوں کے خلاف لڑتا ہے وہ دل سے انہیں پسند نہیں کرتا۔ ہمیں ایسے سپاہیوں کی ضرورت ہے، تم ان کو بھرتی کرو اور ان کی حوصلہ افزائی کرو"۔

"آپ کے حکم کی آج ہی تعمیل شروع ہو جائے گی"۔

"سکھ جتھہ داروں سے رابطہ کرو اور ان کی مدد کرو تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ فتنہ پھیلائیں"۔

"بہت بہتر حضور!"

"ہم بھوانی داس کو کل صبح واپس بھیجنا چاہتے ہیں، راستہ کے جتھہ داروں کے نام مراسلے تیار کروا دیں کہ وہ ہمارے آدمی ہیں اور ان کے ساتھ جانے کے لئے دستہ تیار کریں"۔

"آپ کے ارشاد کی تعمیل ہوگی"۔

"اب آپ جا سکتے ہیں، ہفتہ تک ہم ان امور پر عمل کے بارے میں جاننا چاہیں گے"۔

صدیق خان آداب بجا لایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ آدینہ بیگ نے دربان کو طلب کیا اور بھوانی داس کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ چھوٹے قد کا بھوانی داس فرشی سلام کے لئے جھکا تو لمبا دربان غور سے دیکھنے لگا۔ سلام سے فارغ ہو کر وہ ہاتھ باندھ کر آدینہ بیگ کے سامنے کھڑا رہا۔

"تم کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے، صدیق خان تمام انتظامات کر دے گا۔ دس ہزار اشرفی ہم نے تمہارے نام دینے کا حکم دے دیا ہے۔ لاہور کے دربار اور مغلانی بیگم کے بارے میں جملہ معلومات ہمیں باقاعدگی سے ملنی چاہئیں۔ ہمیں امید ہے کہ تم ماضی کی طرح آئندہ بھی روپیہ وقت اور توانائیاں بہتر طور پر استعمال کرو گے۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ مغل اور ترک سردار زیادہ دیر تک متحد نہ رہیں اس کے لئے مزید رقم فراہم کی جا سکتی ہے۔ مغلانی بیگم کے ان عزیز و اقارب سے رابطہ قائم رکھیں جو اب بھی اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ان سے اس کے ارادوں کا علم ہوتا رہے گا"۔ آدینہ بیگم نے داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

بھوانی داس دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر رکوع کی حالت میں چلا گیا۔

"تم خواجہ عبداللہ خان کو جانتے ہو ان سے تمہارا کوئی رابطہ ہے؟" آدینہ بیگ نے پوچھا۔

"اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ وہ مغلانی بیگم کے ماموں ہیں"۔ بھوانی داس نے بتایا۔

"وہ بہت ہوشیار اور سمجھدار آدمی ہے اس سے تعلق قائم کریں اور اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔ وہ ہرگز پسند نہیں کرے گا کہ پنجاب کی حکومت ان کے خاندان سے باہر جائے اس خاندان نے تیس پینتیس سال پنجاب پر حکومت کی ہے وہ ضرور کوئی کوشش کرے گا ایسا ہو تو فوراً ہمیں اطلاع دیں"۔

بھوانی داس ایک بار پھر دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر رکوع میں چلا گیا۔

"کیا یہ درست ہے کہ بابا خان ولی کے ہندو جوگیوں سے بھی تعلقات ہیں؟" آدینہ بیگ نے پوچھا۔

"جی حضور! بالکل درست ہے"۔

"کیا تم کسی دنیادار جوگی کو تلاش کر سکتے ہو؟"

"پوری کوشش کروں گا حضور!"

"ان کے کسی قابل اعتماد جوگی کا اعتماد بہت کام آ سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں ان کے لئے نذرانہ بھیجیں اس سے پہلے ہم جاننا چاہیں گے کہ وہ قبول فرما لیں گے"۔

"بندہ آپ کی طرف سے ایک بار نذرانہ پیش کر چکا ہے جو انہوں نے قبول فرما لیا تھا"۔

"ہم یہ سن کر خوش ہیں ہم ایک ہزار اشرفی کا اضافہ کروا رہے ہیں، یہ ہماری طرف سے پیش کر دیں اور دعا

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کی ہماری درخواست ان تک پہنچا دیں"۔

بھوانی داس نے ایک بار پھر مغل رکوع دہرا دیا۔

"اب تم جا سکتے ہو اپنے معاملات نپٹا لیں اور کل صبح روانہ ہو جائیں"۔ آدینہ بیگ نے نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔

بھوانی داس نے فرشی سلام کیا اور الٹے پاؤں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

*

بابا خان ولی سے ملاقات کے دوسرے ہی روز خواجہ مرزا خان نے مغلانی بیگم کو اس کی والدہ وردانہ بیگم کی حویلی میں منتقل کر دیا۔ زوال پذیر دور میں بیگم پورہ آباد ہوا تو نواب عبدالصمد خاں کی نسل کے امرائے لاہور نے وہاں باغ لگوائے، محل بنوائے تو بیگم پورہ اہم آبادی بن گئی۔ قلعہ نما حویلیاں تعمیر کروا کر ساری آبادی کو حصار بند کر دیا تھا۔ اس لئے بیگم پورہ بہت محفوظ آبادی سمجھی جاتی تھی۔ مغلانی بیگم کو وہاں منتقل کر کے خواجہ مرزا خان نے اس کی نگرانی کے لئے فوج متعین کر دی اور حویلی کے گرد پہریداری کے لئے خواجہ سعید کے لشکر کے خصوصی دستے متعین کر دیئے۔ مغلانی بیگم کے گھریلو ملازمین کے علاوہ کسی کو حویلی کے اندر آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مغلانی بیگم کی سلطنت کی حدود حویلی کی دیواروں تک محدود ہو گئیں۔ ان کی رعایا میں گھریلو ملازم ہی رہ گئے تھے۔ اکثر ملازمین پابندیوں کے خوف اور کچھ خواجہ مرزا خان کی خوشنودی کی خاطر بیگم کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ طہماس خاں خواجہ قاضی کی فوج کے ساتھ سکھوں کے خلاف لڑنے چلا گیا تھا۔ اب پنجاب کا حاکم خواجہ مرزا خان تھا اور اس کے خواب حاکم کی خوشنودگی سے پورے ہو سکتے تھے۔ مغلانی بیگم نے اس قید میں بھی حاکمانہ انداز برقرار رکھے۔ اس کے ملازموں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ پنجاب کے امراء اور جاگیرداروں کی عرضداشت اور مغل دربار کے امراء کی کوششوں سے مغل بادشاہ نے خواجہ مرزا خان کے نام پنجاب کی سند حکومت جاری کر دی اور عماد الملک اپنی ساس کی کچھ مدد نہ کر سکا۔ مغلانی بیگم نے قندھار سے جو تعلق قائم کر رکھا تھا مغل بادشاہ کو اس کا رنج تھا اس کی خواہش اور کوشش تھی کہ پنجاب پر ایک بار پھر شاہجہان آباد کی حاکمیت قائم ہو جائے۔ خواجہ مرزا خاں کے لئے سند سے یہ خواہش پوری ہو گئی اور پنجاب ایک بار پھر مغل سلطنت کے ماتحت آ گیا۔

سند حکومت حاصل کرنے کے بعد خواجہ مرزا خان نے سکھوں کے خلاف مہم شروع کی اور بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ اس نے ثابت کر دیا کہ خواجہ برادران سکھوں کی شورش دبانے اور پنجاب میں امن بحال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بابا خان ولی نے اسے یقین دہانی کرائی تھی کہ اگر وہ مسلم رعایا اور پنجاب کے تحفظ میں کامیاب ہو گئے تو ابدالی پنجاب کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود اسے مغلانی بیگم کی طرف سے ہمہ وقت خدشہ لگا رہتا تھا وہ اس کی جرأت اور صلاحیتوں سے آگاہ تھا اور کوئی خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مغلانی بیگم خاموش نہیں بیٹھے گی مگر کرے گی کیا، اسے اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ وردانہ بیگم کی حویلی میں قید کرنے کے بعد خواجہ نے مغلانی بیگم کے ذاتی ملازمین کو خریدنے کی کوشش کی تاکہ ان کے ذریعے حویلی کے حالات معلوم ہوتے رہیں مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ بھکاری خان نے مشورہ دیا کہ طہماس خان کو اس کام پر لگایا جائے۔

خواجہ مرزا خان نے طہماس خان کو خواجہ قاضی کی فوج سے واپس بلا لیا۔ اس کی صلاحیتوں کی تعریف کی اور ترقی کے خواب دکھا کر مغلانی بیگم کی جاسوسی کا فریضہ سونپ دیا۔

(جاری ہے)

داستان ایک عامل کی

اس نے پھنکارتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں ناگن ہوں ناگن زہریلی ناگن، سادھو، پجاری، جوگی سب مجھ سے بچ کر رہتے ہیں"۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اور گہری ہوگئی مجھے اس سے خوف محسوس ہونے لگا

قسط 9 ☆ ------------ 0314-4652230, 0303-9801291 ------------ محمد افضل رحمانی

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تم؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''رجو ''ہاں، رکھّے! میں تمہارے ساتھ جانے کے لئے آئی ہوں''۔

''لیکن میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں''۔

''مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں بس مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے''۔

''دیکھ رجو! میں تمہیں ایک مشورہ دیتا ہوں''۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی یہاں سے واپس چلی جاؤ، میں تو ابھی اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتا تمہیں کیا رکھوں گا، ویسے تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟''

''رکھّے! صحیح بات کروں؟'' اس نے کہا۔ ''دیکھ رکھّے میں ایک غریب باپ کی بیٹی ہوں جو تیرے پھوپھا ماجے پہلوان کا ملازم ہے''۔

''یہ تو مجھے پتہ ہے''۔

''میں ڈیرے پر اکثر آتی جاتی رہتی تھی''۔ رجو نے کہا۔ ''مجھے تیری جوانی، حُسن اور بے پناہ طاقت نے تیرا دیوانہ بنا دیا تھا لیکن میں سمجھتی تھی کہ تیرا اور میرا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ تُو چوہدریوں کا بیٹا اور میں ٹھہری بشیرے کمی کمین کی بیٹی۔ میں ہمیشہ موقعے کی تاک میں رہتی تھی لیکن اپنی حیثیت دیکھ کر تم سے بات کرنے کی جرأت نہیں پڑتی تھی لیکن آج جب میں نے تیرے ساتھ پیش آنے والے حالات دیکھے تو سمجھی کہ اب تُو میرے جیسا ہو گیا ہے ویسے بھی سکھ وسدیاں دا تے ہر کوئی ساتھی ہندا اے دکھیاں دا ساتھ دیئے تے مزہ فیر آوندا اے''۔

''میں تم جیسا کیسے ہو گیا؟'' میں نے کہا۔ ''میرا باپ، پھوپھا، پھپھو تو سب مجھے چھوڑ گئے مجھے تو اب زمین بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے لیکن تمہارا تو سب کچھ ہے''۔

''نہیں رکھّے! اب میرا بھی کوئی نہیں ہے''۔ رجو نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''میں صرف تیرے لئے سب کو چھوڑ کر آ گئی ہوں اب مجھے بھی کوئی قبول نہیں کرے گا کیونکہ نوجوان بیٹی جب ایک دفعہ گھر سے نکل آئے تو پھر اسے کوئی بھی گلے لگانے کو تیار نہیں ہوتا، سوائے موت کے''۔

''اور اگر میں تمہیں ساتھ لے جانے سے انکار کر دوں تو؟'' میں نے اسے آزمانے کے لئے پوچھا۔

''تو اس کا بالکل آسان حل ہے''۔ یہ کہہ کر اس نے ایک لمبا چاقو گٹھری سے باہر نکالا اور کہنے لگی۔ ''اس کو پیٹ میں گھونپنا کوئی مشکل نہیں...... تُو انکار کر کے دیکھ ابھی تیرے سامنے رجو تڑپتی ہوئی جان دے دے گی اور رکھّے! یہ بھی یاد رکھ کہ میں کمان سے چھٹا ہوا تیر ہوں یا بھینس کے تھنوں سے نکلا ہوا دودھ، اب میری واپسی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اب مجھے صرف تُو پناہ دے سکتا ہے یا پھر قبر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے''۔

نذیرا! حقیقت یہ تھی کہ رجو کا ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی تھا اور یہ تو میں جانتا تھا کہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کی کوئی جائے پناہ نہیں ہوتی، وہ باپ اور بھائیوں کی غیرت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ رجو نے مجھے ایک اور آزمائش میں ڈال لیا تھا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا لیکن ہم چلتے جا رہے تھے، میں کوشش کے باوجود کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

''رکھّے! مجھے پتہ ہے تُو نے صبح سے کچھ کھایا نہیں ہے''۔ رجو نے چلتے چلتے کہا۔

''لے، اس گٹھری میں چاول اور السی کی بنی ہوئی پنیاں ہیں ان میں سے ایک دو کھا لے اور دو جوڑے میرے کپڑے ہیں اور بیس روپے بھی''۔

رجو کے یاد دلانے سے میری بھوک چمک اٹھی ورنہ تو مجھے بھوک، پیاس کا احساس تک نہیں رہا تھا، میں نے ایک پنی کھائی لیکن وہ تو اونٹ کے منہ میں زیرہ بھی نہیں تھی۔ پھر دوسری پھر تیسری حتیٰ کہ میں ساری پنیاں

کھا گیا۔ رجو گودڑی میں لعل تھی، اٹھتی جوانی، کھلتا رنگ، تیکھے نقش بھی دل کو بھاتا تھا لیکن غربت نے اس کی جوانی کو گہنا دیا تھا۔ جب پیٹ میں غذا گئی تو میری شیطانی سوچ آہستہ آہستہ مجھ پر غالب آنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے رجو تپتے ہوئے صحرا میں ایک سایہ دار درخت ہو یا سوتے میں حسین خواب۔

''ٹھیک ہے رجو! اگر تم صرف میرے لئے گھر بار، ماں باپ سب چھوڑ آئی ہو تو جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا میں تیرا خیال رکھوں گا''۔ میں نے اسے تسلی دینے کے لئے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں سبز باغ نہیں دکھاؤں گا کیونکہ میرا اپنا مستقبل کوئی نہیں ہے۔ تمہیں اگر کوئی پریشانی آئی اس کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔ ہاں جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا میں تیرے ساتھ ہوں''۔

''ٹھیک ہے رکھّے! تیرے ساتھ ہوتے ہوئے میں ہر پریشانی پر قابو پا لوں گی''۔ رجو نے خوش ہو کر کہا۔ ''اگر تیرے لئے میری جان بھی چلی گئی تو میں جان دے دوں گی''۔

میں نے رجو کا ہاتھ پکڑ لیا، میرے جسم میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ رات کا وقت، ایک جوان لڑکی کا ساتھ مجھے وقتی طور پر گزرا ہوا قیامت خیز حادثہ گویا بھول گیا۔ نذیرا! تُو یقین کرتا رجو میرے لئے درد کی دوا بن گئی۔ ہم تیزی سے چلتے جا رہے تھے۔ ہماری کوئی منزل نہیں تھی۔ رات کے اندھیرے میں راستے کا بھی کوئی علم نہیں تھا۔ جب بھی ہمارے راستے میں کوئی فصل کا کھیت آ جاتا تو ہم راستہ کاٹ دیتے اور پھر آگے بڑھ جاتے۔ آدھی رات کے قریب رجو تھک گئی لیکن مجھے تھکاوٹ کا کوئی احساس نہیں تھا۔ میرا جسم کسرت کی وجہ سے لوہے کا بن چکا تھا، میں بے پناہ طاقت کا مالک تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور رجو کو کمر سے پکڑ کر اپنے کندھے پر بٹھا لیا اور جیسے وہ کوئی چھوٹی سی گڑیا ہو۔ اب میری رفتار پہلے سے بھی تیز ہو گئی۔ پہلے رجو کی وجہ سے میں آہستہ چل رہا تھا کیونکہ وہ چلنے میں میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ چلتے چلتے مجھے اس وقت رکنا پڑا جب راستے میں ایک بڑی نہر آ گئی، میں نے رجو کو کندھے سے اتارا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ پل کا کوئی پتہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف ہے اور کتنی دور ہے''۔

''دیکھ رکھّے! اب تُو آرام کر لے''۔ رجو نے مجھے مشورہ دیا۔ ''ہم گاؤں سے کافی دور آ گئے ہیں، اب اگر کسی نے ہمارا پیچھا بھی کیا تو ہم تک نہیں پہنچ سکتا''۔

''ٹھیک ہے رجو! ادھر آ جا''۔ میں نے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا اور پٹڑی سے ذرا ہٹ کر ایک ہموار کھیت میں جس پر کسی نے سہاگہ چلایا ہوا تھا، آ گئے۔ رجو نے اپنی چادر سر سے اتاری اور زمین پر بچھا دی، ہم لیٹ گئے۔ میں نے رجو سے کہا تم بے فکر ہو کر سو جا۔ میرا سونا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ میں ہمیشہ گہری نیند سوتا تھا اور یہ دوسرا موقعہ تھا کہ میں رات کا بقیہ حصہ گناہ کی وادیوں میں بھٹکتا پھرا۔

پو پھٹی تو ہم پٹڑی پر آ گئے اور اندازے سے ایک طرف چلنے لگے۔ ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ ہمیں پل نظر آ گیا۔ پل زیادہ دور نہیں تھا، وہاں تک پہنچتے پہنچتے صبح کا اجالا ہو گیا۔ دن نکلنے میں بس تھوڑی ہی دیر باقی تھی جب ہم پل پار کرنے لگے تو دو آدمی پیدل اور ایک عورت گھوڑی پر سوار ہمیں پل کے درمیان ملے۔ میں نے دیکھا عورت رجو کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی حالانکہ رجو نے منہ چادر میں چھپا رکھا تھا۔

''رجو! تم کہاں جا رہی ہو؟'' یکدم اس عورت نے آواز لگائی۔ ''اور یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟''

میں چوکنا ہو گیا۔

''رکھّے! یہ میری چچی ہے اور اس کے ساتھ میرا چچا بھی ہے اور دوسرا آدمی پتہ نہیں کون ہے''۔ رجو نے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آہستہ لیکن جلدی سے کہا۔

''رجو! تم گھبراؤ مت یہ ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے۔ تُو اس طرف کو بھاگ''۔

میں نے اسے اشارے سے راستہ بتاتے ہوئے کہا۔ رجو بھاگ نکلی۔

''یہ تیرے بھائی کی عزت خاک میں ملا کر اس لڑکے کے ساتھ اُدھل گئی ہے''۔ رجو کی چچی نے للکار کر اپنے خاوند سے کہا۔ ''بھاگ اور پکڑ لے اس بے غیرت کو اور اس کی بوٹیاں کر دے''۔ وہ گھوڑی سے اتر کر شور مچا رہی تھی۔

اس سے پیشتر کہ اس کا چچا اس کے پیچھے بھاگتا میں نے اس کے قریب ہو کر ایک زوردار ڈنڈ لگایا وہ قلابازیاں کھاتا ہوا پل سے لڑھک کر قریبی کھیت میں جا گرا۔ دوسرا آدمی میری طرف بڑھا، میں نے اُسے باہرلی (کشتی کا داؤ) ماری وہ گیند کی طرح اُچھلتا اور دور جا گرا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں سنبھلے اور پھر میری طرف بڑھنے لگے۔ جب میرے قریب آئے تو میں نے ایک ہاتھ میں ان میں سے ایک کی گردن پکڑی اور دوسرے ہاتھ میں دوسرے کی اور پھر زور سے دونوں کے سر آپس میں ٹکرا دیئے۔ وہ دونوں زمین پر گرے اور بے سدھ ہو گئے۔ عورت گالیاں پہ گالیاں بکے جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ مدد کے لئے پکار بھی رہی تھی۔ میں نے اس کے قریب ہو کر ایک زناٹے دار تھپڑ اُس کے منہ پر مارا، وہ لٹو کی طرح گھومی اور پھر پٹ سے زمین پر گر گئی۔ میں نے جلدی سے اس کا زیور اتارا، دونوں آدمیوں کی جیبوں سے روپوں کی تھیلیاں نکالیں، جست لگا کر گھوڑی پر سوار ہوا اور گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔ رجو کافی دور نکل گئی تھی، میں نے جلدی ہی اسے جا لیا۔ گھوڑی اس کے قریب کر کے ذرا سا جھکا اور اس کو کلاوے میں لے کر اپنے آگے بٹھا لیا۔ میں اچھا گھڑ سوار تھا، گھوڑی کی باگ اٹھائی، دونوں ایڑیاں زور سے گھوڑی کی وکھیوں میں ماریں گھوڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

اچانک گھوڑی نے ناخن لیا اور بھاگتی ہوئی زمین پر گر پڑی۔ جب گھوڑی ناخن لیتی ہے تو آگے کی طرف گرتی ہے۔ رجو چونکہ آگے بیٹھی ہوئی تھی وہ دور جا گری اُسے معمولی چوٹیں آئیں لیکن جب میں گرا تو گھوڑی قلابازی کھاتی ہوئی میرے اوپر گری جس کی وجہ سے میری پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں بازی ہار چکا تھا۔

''رجو! اب میں بیکار ہو گیا ہوں''۔ میں نے رجو سے کہا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ تُو اب بھی واپس چلی جا۔ میں اب تمہاری حفاظت کرنے کے قابل نہیں رہا''۔

رجو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ زار و قطار رو رہی تھی پھر کہنے لگی۔ ''نہیں رکھتے! میں واپس نہیں جاؤں گی، تیرے ساتھ ہی مروں گی اور تیرے ساتھ ہی جیوں گی''۔

''رجو! میری بات سمجھ جا اور جلدی کر، واپس چلی جا''۔ میں نے درد میں ڈوبی آواز میں کہا۔

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پانچ گھڑ سوار تیزی سے ہماری طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ ان کے پاس برچھیاں اور کلہاڑیاں تھیں، میں نے انہیں پہچان لیا۔ ان میں ایک رجو کا والد بشیرا تھا اور دوسرے گاؤں کے لوگ تھے۔ بشیرا گھوڑی سے اترا اور اس سے پیشتر کہ دوسرے لوگ اسے پکڑتے یا سمجھاتے اس نے برچھی کا لمبا پھل رجو کے پیٹ میں اتار دیا۔ رجو نے ایک دلدوز چیخ ماری اور پھر زمین پر گر کر تڑپنے لگی اور ذرا دیر بعد ٹھنڈی ہو گئی۔ دوسرے لوگ خاموش کھڑے وحشت زدہ نظروں سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔

''دیکھو بھائیو! کسی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی میری لڑکی تھی میں نے جو مناسب سمجھا اس کے ساتھ کیا''۔ بشیرے نے کہا اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ ''رکھتے! مجھے پتہ ہے کہ اس میں تیرا کوئی قصور نہیں، ویسے بھی میں ماجے پہلوان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تُو ایسا کر زیور اور روپے جو تُو نے میرے بھائی اور بھاوج سے لئے ہیں، وہ واپس کر دے اور گھوڑی بھی''۔

میں اگر ٹھیک ہوتا تو حتی الوسع ان کا مقابلہ کرتا لیکن اس وقت میں معذور تھا، میں نے زیور اور روپے اسے واپس کر دیئے اور انہوں نے رجو کی لاش کو گھوڑی پہ لادا اور واپس چل دیئے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ بشیرے نے رجو کی لاش نہر میں بہا دی تھی اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔

قارئین کرام! حقیقت یہ ہے کہ نذیر سے یہ واقعہ سن کر میں پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے نذیر کو روک کر بڑے دکھ سے کہا نذیر ایسا کیوں ہوتا ہے، یہ کوئی ایک واقعہ ہی نہیں بے شمار ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ میرے دماغ میں بار بار یہ سوچ آئی کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ قصور کس کا ہوتا ہے؟ سر جو قصوروار تھی یا بشیرا یا رکھتا؟ آپ بھی سوچیں اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ میرے خیال کے مطابق قصوروار رجو تھی کیونکہ اس وقت کے قانون نے کچھ ہی عرصے کے بعد بشیرے کو بَری کر دیا تھا لیکن دوسری طرف بشیرا اپنے جگر کے ٹکڑے کو قتل کر کے جلد ہی موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ وہ آخری دم تک رجو کے لئے آنسو بہاتا رہا۔ اس کی بیوی کے بقول اکثر دفعہ رات کو سوتے میں چیخ مار کر اٹھ جاتا تھا اور پھر اس کے منہ سے یہی الفاظ نکلتے۔ ہائے میری رجو۔ رجو نے وقتی جذبات کی رَو میں بہہ کر بشیرے کی عزت خاک میں ملا دی اور بشیرا باقی ماندہ زندگی گاؤں کے لوگوں اور اپنی برادری کے سامنے آنکھ نہ اٹھا سکا لیکن اس کے ساتھ ساتھ رجو کی موت کا دکھ اسے دیمک کی طرح چاٹ گیا۔ گویا وہ دوہری اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا جبکہ رجو صرف ایک اذیت میں مبتلا ہوئی۔

میرے نزدیک عورت کے ساتھ یہی ایک مسئلہ ہے کہ اس کے ساتھ کئی لوگوں کی عزت و ناموس وابستہ ہوتی ہے اگر وہ بیٹی ہے تو باپ کی عزت و ناموس اس کے ساتھ پیوست ہے۔ اگر بہن ہے تو بھائی کی اور اگر بیوی ہے تو خاوند کی، ماں ہے تو خاوند، بھائی اور بیٹے کی وہ ایک پتنگ کی مانند ہے۔ وہ صرف اسی صورت میں اڑ سکتی ہے کہ اس کی ڈور کسی کے ہاتھ میں ہو۔ کٹی ہوئی پتنگ لوٹ لی جاتی ہے یا پھاڑ دی جاتی ہے۔ یہ بات اگر عورت کی سمجھ میں آ جائے تو عورت معاشرے میں اپنے اصل روپ میں آ جائے گی ورنہ کٹی ہوئی پتنگوں کا حشر ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

اِک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نہ پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

عورت بے شک پردہ دار بھی ہو اور تعلیم یافتہ بھی لیکن اس کی حفاظت پردے اور تعلیم سے بھی نہیں ہو سکتی۔ اس کی حفاظت صرف اور صرف مرد ہی کر سکتا ہے۔ مرد خواہ بھائی کے روپ میں ہو، باپ یا خاوند کے روپ میں علامہ صاحب کہتے ہیں جس قوم نے اس حقیقت کو نہ سمجھا اس کا زوال بہت جلد ہو گا۔ اب عورت کی بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ اپنی ڈور کسی کے ہاتھ میں پکڑا کر بلندیوں تک اڑنا چاہتی ہے یا کٹی ہوئی پتنگ کی طرح لوٹنے والوں کے رحم و کرم پر جینا چاہتی ہے۔

بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر گوہر بننے کے لئے صدف کی آغوش ضروری ہے۔ جب تک قطرۂ نیساں صدف کی آغوش میں نہیں رہے گا کبھی گوہر نہیں بن سکتا۔ علامہ مرحوم نے کس نرالے انداز میں عورت کو پردے میں رہنے کی تلقین کی ہے۔

عورت کی سادہ لوحی کہوں یا کم عقلی، جہالت کہوں یا خودفریبی یہ شیطانی ذہن کے مردوں کی نفسیات سمجھنے سے قاصر ہے شاید اسی لئے آسکر وائلڈ نے کہا تھا۔ "عورتیں تصویر ہوتی ہیں اور مرد معمہ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ عورت کا واقعی کیا مطلب ہے، تو اس کی طرف دیکھو۔ اس کی سنو نہیں اور کسی نے یوں کہا۔ "عورت محبت کرنے کی چیز ہے، سمجھنے کی نہیں اور مرد سمجھنے کی چیز ہے محبت کرنے کی نہیں"۔ جب عورت نے مرد کو سمجھنے کی کوشش نہ کی تو پھر مہذب یورپ نے مہذب فحاشی کو رواج دیا۔ فحش و گناہ کی نئی نئی تعبیریں کی گئیں۔ اخلاق کو اضافی شے کہا گیا علانیہ بحثیں ہونے لگیں کہ عفت کس بلا کا نام ہے، تقویٰ کس کو کہتے ہیں جو چیز نکاح سے جائز ہو جاتی ہے وہ بغیر نکاح کے کیوں جائز نہیں؟ جب ہاتھ ملانا کوئی جرم نہیں تو جسم ملانا کیوں جرم ہے؟ اچھائی اور برائی کا اپنا کوئی وجود نہیں دونوں ہمارے اپنے ہی فکر کا پرتو ہیں۔ فرانسیسی افسانہ نگاروں کی نوجوان نسل نے ان نظریوں کی اشاعت کے لئے اپنا سارا زور بیان صرف کر ڈالا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ڈورڈ ساں ایک فرانسیسی ادیبہ ہوئی ہے جس نے جنسی تعلقات کی رنگا رنگی پر زور دیا ہے۔ الغرض پہلی عالمی جنگ (1914-1918) میں یورپ نے اخلاقی قدروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تمام یورپی ملکوں سے فرانس بازی لے گیا۔ فرانسیسی اکابر کا ایک ہی نعرہ تھا۔ "بچے جنو اور جناؤ"۔ نکاح کی ضرورت نہیں۔ کنواری یا بیوہ جو عورت بھی وطن کے لئے رحم کو رضا کارانہ پیش کرتی ہے وہ عزت کی مستحق ہے۔ ان عورتوں کو ام الوطن کا خطاب دیا گیا۔ ایک فرانسیسی قائد لکھتا ہے۔

پچھلے پچیس سالوں میں ہم کو اتنی کامیابی ہوئی ہے کہ حرامی بچہ حلالی بچے کا ہم رتبہ ہو گیا ہے۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ صرف پہلی ہی قسم (یعنی حرامی) کے بچے پیدا ہوا کریں تا کہ تقابل کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔

اسی نظریے نے اُن کے معاشرے کا ستیاناس کر دیا۔ خاندانی نظام درہم برہم ہو گیا۔ اب کئی ہوئی پتنگیں یورپ کے آسمان پر دندناتی پھر رہی ہیں اور لوٹنے والے ان کا جو حشر کر رہے ہیں خدا کی پناہ۔ اب وہاں عورت نہیں بوچڑ خانہ ہے۔ جہاں عورت قتل ہوتی ہے اور اس کا گوشت بکتا ہے لیکن اسلام کی نظر میں صحیح عورت ڈولی میں نکلتی اور کفن میں جاتی ہے۔ وہ ماں کی کوکھ سے قبر کی گود تک ایک ستر ہوئی ہے۔

ہندو جوگی

درد کی شدت سے میرا بُرا حال ہو گیا تھا۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر رجو کا جوان خون زمین چوس چکی تھی اور اب کوے رجو کے جمے ہوئے خون کے لوتھڑوں سے اپنی چونچیں بھر رہے تھے۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ کوؤں کو رجو کا خون چوسنے سے منع کر سکتا۔ اس کی دلدوز چیخ جس میں انتہائی وحشت بھی شامل تھی ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ رجو نے میرے پیار میں اپنی جان دے دی تھی لیکن میں اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ یہ دوسری لڑکی تھی جو میری وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ ابھی میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ ایک دیو ہیکل آدمی جس نے گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ جلد ہی وہ میرے قریب آ گیا اور مجھے نمسکار کیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا اور پھر بڑے ہمدردانہ لہجے میں

بولا۔ بالک کیا پریشانی ہے؟

"اللہ لوکو! میری پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے"۔ میں نے کہا۔ "میں گھوڑی سے گرا ہوں"۔

"گھوڑی کدھر ہے؟" اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"گھوڑی بھاگ گئی ہے"۔ میں نے جھوٹ بولا۔

"دیکھو بالک! چنتا کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے"۔ اس نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم جیسا سندر جوان میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ تمہارے جسم میں وافر چربی اور ہڈیوں میں کافی گودا ہے۔ ہڈی جڑنے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے"۔

اس نے اپنے تھیلے سے کچھ شیشیاں نکالیں اور میری پنڈلی پر تیل کی مانند کوئی چیز لگائی۔ حیرت انگیز حد تک میری درد کم ہو گئی پھر اس نے میری پنڈلی پر ہاتھ پھیرا اور ہڈی کے دونوں کناروں کو ایک دوسرے کی سیدھ میں کر کے مستطیل لکڑیاں اوپر رکھ کر پنڈلی کو مضبوطی سے کپڑے کی چوڑی پٹی سے باندھ دیا اور پھر مطمئن ہو کر کہنے لگا۔ بس اب تم ٹھیک ہو گئے ہو۔ پرنتو تمہیں کچھ دنوں کے لئے آرام کرنا ہو گا۔ بالک! تمہارا نام کیا ہے؟

"اللہ لوکو! میرا نام اللہ رکھا ہے"۔

"کون سے گاؤں میں رہتے ہو؟"

"میرا گاؤں یہاں سے کافی دور ہے"۔

"کوئی بات نہیں بالک! ہم تمہیں جس طرح بھی ہو سکا تمہارے گاؤں پہنچا دیں گے"۔

"نہیں مہاراج!" میں نے فوراً کہا۔ "میں گاؤں نہیں جانا چاہتا"۔

"کیوں بالک؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔ "ان حالات میں تمہیں نگہداشت کی ضرورت ہے"۔

"لیکن مم مم......" میں کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں ہاں کھل کر بات کرو"۔

"دیکھو اللہ لوکو! میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے"۔

"اوہ ہو، تمہارے والد اور والدہ دنیا سے پدھار چکے ہیں؟"

"نہیں سب زندہ ہیں لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"بس اللہ لوکو! یہ لمبی کہانی ہے"۔ میں نے کہا۔

"کیا مجھے بتا سکتے ہو؟" اس نے متجسس انداز میں کہا۔ "دیکھو میں جان گیا ہوں کہ تم مسلمان ہو لیکن میں دھرم کو بیچ میں نہیں لاؤں گا۔ پنڈت پجاری دھرم کی بچی جھوٹی باتوں سے بہت بلند ہوتے ہیں"۔

اور نذیر! پھر میں نے ہندو جوگی کو تمام حالات سنا دیئے۔ جوگی کا رنگ قندھاری انار کی طرح ہو گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ وہ اتنا جذباتی کیوں ہو گیا تھا۔

"جیون اس دھرتی پر سب سے سندر چیز کا نام ہے"۔ پھر اس نے شیطانی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "اور اگر اس کی سندرتا (خوبصورتی) میں کسی من پسند کنیا (لڑکی) کا پریم (پیار) بھی مل جائے پھر منش کے لئے یہ دھرتی بھی سورگ سمان بن جاتی ہے۔ تو نے اس لڑکی کو واپس کیوں جانے دیا؟"

"اللہ لوکو! وہ لڑکی اب اس دنیا میں نہیں ہے"۔

"کیوں کیا ہوا اُسے؟" جوگی نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"یہ خون دیکھ رہے ہو؟" میں نے رجو کے جمے ہوئے خون کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ اسی لڑکی کا ہے، اس کے باپ نے اسے پریم کی سزا اس کے پیٹ میں برچھی مار کر دی ہے"۔

"ہے بھگوان!" جوگی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ "اس نے پاپ کیا ہے۔ پاپ لیکن نہیں پاپ

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اور پُن کا فیصلہ تو صرف دیوتا ہی کر سکتے ہیں لیکن پرکی آتما کو نشٹ کر دینے کی تو کسی دھرم میں بھی آ گیا نہیں ہے۔ خیر چھوڑ ان باتوں کو ادھر گور (غور) سے میری آنکھوں میں دیکھ"۔ میں نے غیر اختیاری طور پر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور مجھے لگا ان آنکھوں نے مجھے جکڑ لیا ہے۔

"ستور کھے اب تم ٹھیک ہو تمہاری ہڈی جڑ گئی ہے اور تم درد محسوس نہیں کر رہے ہو"۔ اس کی بلند اور گھمبیر آواز مجھے سنائی دی۔ "اب تم آرام سے سو جاؤ۔ اب تمہارے شریر میں کوئی کھوٹ نہیں ہے"۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دماغ میں کوئی گدگدی کر رہا ہے اور میرے جسم میں برقی رو دوڑ گئی ہے اور پھر مجھے اس وقت ہوش آیا جب میں ایک کمرے میں ایک آرام دہ پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں دیے کی مدھم لو ہلکے زرد رنگ کی روشنی بکھیرنے کی جدوجہد میں اپنی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی کہ یک دم کسی نے اپنا گداز ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا اور پھر سریلی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"جوان اٹھنے کی کوشش نہ کرو تم زخمی ہو۔ گرو جی کہہ گئے ہیں کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ ہاں البتہ تم پلنگ پر بیٹھ سکتے ہو۔ زخمی ٹانگ کو ہلانے کی کوشش نہ کرنا"۔ اور پھر نرم نازک ہاتھ میری گردن کے نیچے چلا گیا اور مجھے سہارا دے کر اوپر اٹھا دیا۔ پھر وہ میری پائنتی کی طرف کھڑی ہو گئی۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا وہ ساڑھی میں ملبوس ایک حسین لڑکی تھی لیکن مدھم روشنی میں اس کے خدوخال واضح دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ تاہم اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ لڑکی کوئی انمول ہیرا ہے۔

"تم کون ہو؟" میں نے غنودگی کے عالم میں پوچھا۔

"میں لڑکی ہوں انسان کی اولاد"۔

"تمہارا نام؟"

"میرا نام راج کور ہے"۔ اس نے کہا۔ "میں تمہاری داسی ہوں اور تمہاری سہائتا کے لئے مہاراج نے میری ڈیوٹی لگائی ہے"۔

"مہاراج کہاں ہیں؟"

"وہ صبح تک آ جائیں گے"۔ اس نے کہا۔ "بھوجن تیار ہے، میرا خیال ہے پہلے تم بھوجن کھا لو پھر باتیں کریں گے"۔

بھوجن کا سن کر میری بھوک چمک اٹھی۔ میں نے رات کو چاول اور السی کی پنیاں کھائی تھیں جو رجو گھر سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ ہاں کھانا لے آؤ، مجھے زور کی بھوک لگی ہوئی ہے۔ میں نے کہا تو وہ ذرا سا مسکرائی اور پھر ایک بڑے تھال میں بہت ساری چوری جس میں وافر گھی ڈالا گیا تھا لے کر آئی اور میری دونوں رانوں پر رکھ دیا۔ چوری میری پسندیدہ خوراک تھی، میں نے بڑی رغبت اور مزے لے لے کر سارا تھال خالی کر دیا اور بچا ہوا گھی ایک دو گھونٹوں میں پیٹ میں ڈال دیا۔

"جوان چوری اور لاؤں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں بس میں سیر ہو گیا ہوں"۔

"اچھا، ٹھیک ہے لیکن گرم گرم دودھ پی لو اس سے تمہارے شریر میں جان آ جائے گی"۔ اس نے کہا اور ایک پیتل کی گڑوی میں دودھ لے کر آئی اور مجھے ایک بڑے چھنے میں ڈال کر پکڑا دیا اور پھر میں نے آخری چھنے تک میٹھا اور خالص دودھ پیا کہ پھوپھا ماجے کی بھوری بھینس کی دھاریں یاد آ گئیں۔ چوری اور دودھ نے میرے جسم میں توانائی کی لہر دوڑا۔ اب میں بہکنے لگا تھا۔ میرا جی چاہا اس لڑکی سے باتیں کروں، پیار بھری باتیں۔ مجھے لڑکی کا نام بھول گیا تھا۔ ابھی میں اسے آواز دینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ دوسرے کمرے سے نکل کر میرے پاس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کی پیالی تھی۔ اس نے

پیالی زمین پر رکھی اور پھر دیا لے کر میرے قریب آ گئی۔

"جوان تم دیا پکڑو، میں ایک دوائی تمہاری پنڈلی پر لگا دوں"۔

میں نے دیا پکڑ لیا اور اس نے پیالی میں روئی کا ایک پھایا بھگو کر میری ٹوٹی ہوئی پنڈلی پر پھیرنا شروع کر دیا۔ وہ گھی کی مانند کوئی سیال تھا اور نیم گرم تھا۔ مجھے اس سے بے حد سکون ملا۔ دیئے کی روشنی میں میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ گویا چاند کا ایک ٹکڑا تھا۔ موٹی آنکھیں، لمبی پلکیں، تیکھی ناک، گلابی ہونٹ، لال گلابی رخسار دیئے کی زرد روشنی میں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی پری ہے۔

"دیکھو لڑکی! میں تمہارا نام بھول گیا ہوں"۔ میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، تم مجھے صرف لڑکی کہہ سکتے ہو"۔ اس کے ساتھ ہی وہ تھوڑا سا مسکرائی۔ اس کے اوپری دو دانتوں کے درمیان تھوڑا سا خلا تھا، اس میں سے ایسی روشنی پھوٹ رہی تھی کہ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

"لڑکی کیا تم اس گھر میں اکیلی رہتی ہو؟"

"نہیں گرو جی میرے ساتھ رہتے ہیں"۔

"گرو جی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"میں ان کی داسی ہوں"۔

"کیا مطلب؟"

"تم داسی کا مطلب نہیں سمجھتے؟"

"نہیں، مجھے پتہ نہیں ہے"۔

"مورکھ! میں ایک دیوداسی ہوں"۔ اس نے کہا۔ "میرے فرائض میں سے ہے کہ دیوتاؤں اور مہان پجاریوں کی ہر آگیا کا پالن کروں، ان کی سیوا کرنا میرا دھرم ہے"۔

"یہ پجاری اور دیوتا کیا ہوتے ہیں؟"

"تم نہیں سمجھ سکو گے، اس بحث کو چھوڑو"۔ اس نے مختصراً کہا۔ "تمہاری سیوا کر کے ہم دیوتاؤں کی آشا کے خلاف کر رہے ہیں لیکن مہاراج کا حکم ٹالنا بھی ایک قسم کا پاپ ہی ہے۔ اب تم سونے کی کوشش کرو"۔

"لیکن جوگی کہاں چلا گیا اور وہ کب آئے گا؟"

"دیکھو جوان! ایسے نہیں بولتے"۔ اس مجھے ٹوک کر کہا۔ "ان کا شبھ نام لو مہاراج کہو۔ ان کی ہتک کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔ بے شک ہم نے دیوتاؤں کی نافرمانی کی ہے۔ وہ چاہتے تو ہمارا کریا کرم بھی کر سکتے تھے لیکن ان کا ہمیں شما کر دینا اُن کے بڑے پن کا ثبوت ہے"۔

"دیکھ لڑکی مجھے تیری باتوں کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی"۔ میں نے الجھتے ہوئے کہا۔ "تو کیا کہنا چاہتی ہے۔ میں بالکل بھی نہیں سمجھ پا رہا"۔

"ابھی کہا ہے نا کہ اب تو سو جا"۔

"لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی"۔

"کیا تمہیں درد ہو رہی ہے؟"

"نہیں درد تو نہیں ہو رہی لیکن پتہ نہیں میرا دل کیوں چاہتا ہے کہ تم سے باتیں کروں"۔

"تمہارا دل کیوں چاہتا ہے؟"

"اس لئے کہ تم ایک بہت ہی سندر لڑکی ہو"۔ میں نے دل کی بات کہہ دی۔

"لیکن میرے اس سندرتے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا"۔

"کیوں؟" میں نے بات بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"اس لئے کہ میں کنیا نہیں بلکہ ایک ناگن ہوں"۔

"ناگن!" میں نے سوالیہ طور پر جلدی سے کہا۔

"ہاں ناگن، جوگی مہاراج نے اپنی بین کی سحر انگیز لے سے مجھے قید کر رکھا ہے"۔ اس نے پُراسرارانہ کہا۔ "کہو تو اپنے اصلی روپ میں تمہارے سامنے آؤں"۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

''ہاں، آؤ''۔ میں نے ڈرے بغیر کہا۔

وہ زور سے ہنسی ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے منہ سے پھول جھڑنے لگے ہوں۔ اس کے سامنے والے دانتوں کے خلا سے روشنی کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ دیئے کی ملگجی سی روشنی میں اس کی شخصیت پُر اسرار سی ہوگئی تھی۔

''دیکھ جوان! جب تمہیں چارپائی پر ڈال کر اِدھر لائے تھے تو تم سوئے ہوئے تھے''۔ اس نے کہا۔ ''میں نے تمہارے شریر کو بڑے گور (غور) سے دیکھا تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس جیسا شریر میں نے آج تک کسی نوجوان کا نہیں دیکھا۔ پھر میری نظریں تمہارے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ تمہارا روپ دیکھ کر میرے من میں..... پرنتو چھوڑ، پاپ تو میں کر نہیں سکتی لیکن پُن بھی کرنا میرے لئے مشکل ہوگیا ہے''۔

نذیر! اس کے بعض الفاظ کی تو مجھے سمجھ ہی نہیں آتی تھی لیکن اس کا رویہ تو بالکل ہی سمجھ سے باہر ہوگیا تھا۔ اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور مجھے نمسکار کہتے ہوئے کمرے سے چل دی۔

''لڑکی سنو!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''کہو، کیا بات ہے؟''

''مجھے پیشاب آ گیا ہے کیا تم میری مدد کر سکتی ہو؟''

''ہاں کیوں، نہیں ذرا ٹھہرو گے''۔ پھر وہ جلد ہی ہاتھ میں مٹی کا ایک برتن لے کر آئی اور مجھے کہنے لگی۔

''جوان! اس میں پیشاب کر لو، تم ابھی چلنے کے قابل نہیں ہو اور دیکھو جب فارغ ہو جاؤ تو مجھے آواز دے لینا میں پیشاب باہر پھینک آؤں گی''۔

''دیکھو لڑکی! اگر میں تندرست ہوتا تو تمہیں کبھی اس قسم کی تکلیف نہ دیتا''۔ میں نے شرمندگی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے''۔ اس نے کہا۔ ''یہ بھی ایک پُن ہے اس سے آتما کو سکون ملتا ہے''۔

لیکن نذیر صحیح بات یہ تھی کہ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ لڑکی اپنے کمرے میں چلی جائے میں چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کرلے اس کی باتوں سے مجھے سکون مل رہا تھا۔

''دیکھ لڑکی تُو نے ابھی کہا تھا کہ میں لڑکی نہیں ناگن ہوں اس کا کیا مطلب ہے؟''

''یہ میں نے ٹھیک کہا ہے''۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اگر میں چاہتی تو تمہیں ڈس لیتی لیکن نہیں تم جیسا خوبصورت اور طاقتور نوجوان خال خال ہی ہوتا ہے۔ تُو دیوتا ہے اور میں تیری داسی ہوں بس اس سے آگے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کاش! میں جنم جنم سے مسلمان ہوتی''۔

''یہ خیال تمہیں کیونکر آیا؟''

''دیکھ جوان! میں مسلمانوں کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں''۔ اس نے مجھے بتایا۔ ''مجھے اس کی تعلیم دی گئی ہے۔ تم ٹھاکر نہیں پوجتے، تم دھرم کے نام پر کنیاؤں کو اُن کے فطری حق سے محروم نہیں کرتے بلکہ تمہارے دھرم میں ودھواؤں (بیوہ عورتیں) کو بھی بیاہ کی اجازت ہے بلکہ حکم ہے لیکن ہمارے دھرم میں اگر ایک رات کی سہاگن بھی ودھوا (بیوہ) ہو جائے تو وہ تمام عمر دوسرا بیاہ نہیں کر سکتی۔ نہ اچھا کپڑا پہن سکتی ہے، نہ اچھا زیور، رنگ دار کپڑے اور سرمہ لگانا بھی اسے منع ہو جاتا ہے۔ تمہارے دھرم میں ایک آدمی کو چار بیویاں کرنا جائز ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ناریاں (عورتیں) محفوظ چھتوں کے نیچے آ جائیں۔ تم لوگ اپنی بچیوں کو کسی مذہبی مرکز میں بھینٹ نہیں چڑھاتے بلکہ ان کو جگر کا ٹکڑا سمجھ کر آخری سانس تک بحفاظت رکھتے ہو۔ تمہارے دھرم میں ناری ایک قیمتی موتی ہے جسے تم ہمیشہ سنبھال کر رکھتے ہو۔ تمہارے رشی (سید الانبیاء محمد رسول اللہؐ) خود اپنی بیٹی سے رحمت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ انہوں نے

سوائے ایک کے جن عورتوں سے بیاہ کیا سب ودھوائیں (بیوہ) تھیں''۔

میں آنکھیں پھاڑے اسے تک رہا تھا، وہ بہت جذباتی ہوگئی تھی لیکن میں خود تو اپنے مذہب کے بارے کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ مجھے تو بس پہلوانی سکھائی گئی تھی اور پھر میں شیطانی راستے پر چل نکلا تھا۔ میں چاہتا تھا وہ میرے ساتھ پریم پیار کی باتیں کرے۔ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''دیکھو لڑکی! جب تم سمجھتی ہو کہ مسلمانوں کا دھرم ٹھیک ہے تو پھر اسے قبول کیوں نہیں کر لیتی''۔ میں نے سوال کیا۔

''جوان! اگر میں تمہیں کہوں کہ ہندو دھرم قبول کر لو تو؟'' اس نے جواب میں سوال کر دیا۔

''دیکھ لڑکی! گو میں پکا مسلمان نہیں ہوں لیکن میں ہندو دھرم کبھی قبول نہیں کر سکتا''۔ میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ہاں البتہ اگر تم میرا مذہب قبول کر لو تو میں تمہارے لئے جان کی بازی بھی لگانے سے دریغ نہیں کروں گا''۔

''دیکھ جوان! میں قرآن پڑھ سکتی ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''مجھے پانچ وقت کی نماز پڑھنی بھی آتی ہے، میں تمہارے مذہب کے اکثر مسائل سے واقف ہوں۔ تمہارا کوئی گرو (مولوی) بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن یہ سب میں نے دیوتاؤں کی آشیرباد کے لئے کیا ہے۔ میں جنم جنم کی ہندو ہوں میری آتما میں دیوتاؤں کا پیار رچ بس گیا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندو دھرم نے مجھے کچھ بھی نہیں دیا سوائے محرومیوں کے لیکن پتہ نہیں اس کے باوجود میں ہندو دھرم چھوڑنے کا خیال بھی نہیں کر سکتی اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں ابھی تک ہندو دھرم کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتی اور اب تو میں کسی بھی وقت دیوتاؤں کے عتاب میں آ سکتی ہوں''۔

عمل سنواریں!

جیسا عمل کرو گے ویسی ہی عادت پڑے گی۔ جیسی عادت ہوگی ویسی سیرت ہوگی اور جیسی سیرت ہوگی ویسی قسمت پاؤ گے۔

(نسیم سکینہ صدف۔ ڈسکہ)

''کیوں اس کی کیا وجہ ہے؟''

''میں نے دیوتاؤں کی مرضی کے خلاف اپنے من کی مرضی کو ترجیح دی ہے''۔ اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا''۔ میرے من کی کھوٹ سے دیوتا بے خبر تو نہیں رہ سکتے پرنتو شاید ابھی انہوں نے مجھے کچھ ڈھیل دی ہوئی ہے''۔

میں اس کی باتیں بالکل سمجھ نہیں رہا تھا وہ پھر خلا میں گھورنے لگی اب جب وہ بولی تو اس کی آواز میں مایوسی کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ دیکھ جوان! آج تُو میرا پہلا شکار ہوتا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دیوتاؤں کی آ گیا بھی یہی ہے کہ میں محروم ہی رہوں میں تمہیں دیکھ کر بہک گئی تھی۔ میں نے اپنے ہردے (دل) میں تمہیں پانے کی اِچھا کی تھی لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اپنے پاپوں کی وجہ سے ڈھیر کشٹ اٹھانا پڑے گا''۔

''دیکھ لڑکی! تُو نے جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دے مجھے تیری باتوں سے الجھن ہو رہی ہے''۔

''جوان! میں نے تو تمہیں بتا دیا میں تمہیں اب بھی کہتی ہوں کہ اپنے من میں آنے والے بُرے خیالات کو جھٹک دے''۔ اس نے مجھے تنبیہ کے انداز میں کہا۔ ''جوگی مہاراج مجھے منع کر گئے ہیں شاید انہیں تمہاری سندرتا اور جوانی پر ترس آ گیا ہے ورنہ میں تجھے ضرور ڈس لیتی میں جنم جنم کی پیاسی ہوں میرے شریر کی آگ تمہیں جلا کر بھسم کر دے گی''۔

نذیر! حقیقت یہ ہے کہ وہ لڑکی میرے لئے ایک

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

معمہ بنتی جا رہی تھی اس کا حسن ایک الاؤ تھا۔ جوانی اس کے جسم سے پھوٹی پڑ رہی تھی جی چاہتے ہوئے بھی وہ میرے قریب آنے سے کترا رہی تھی پھر وہ اچانک موضوع بدل کر بولی۔ "جوان! تُو نے کبھی کسی کنیا سے پریم کیا؟"

"پریم کیا ہوتا ہے؟" میں سوال کیا۔

"پریم کیا ہوتا ہے؟" اس نے میری طرف گھورتے ہوئے دہرایا۔ "تمہیں پریم کا پتہ بھی نہیں ہے"۔

"نہیں لڑکی! میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا"۔

"دیکھ جوان! کسی سندر ناری سے پریم کرنا تو ہر جوان کی اِچھا ہوتی ہے"۔

"لیکن ہمارے مذہب میں تو یہ گناہ ہے"۔

"ہاں مجھے پتہ ہے لیکن بیاہ کرنا تو کوئی پاپ نہیں"۔

"ہاں اب میں سمجھا حقیقت یہ ہے کہ میں نے ابھی تک کسی لڑکی سے بیاہ نہیں کیا"۔ میں نے اسے بتایا۔ ایک لڑکی نے مجھے پیشکش کی تھی لیکن اب مجھے امید نہیں ہے کہ میں اس سے بیاہ کرسکوں"۔

"کیا وہ سندر ناری تھی؟"

"ہاں"۔

"اس کا نام کیا تھا؟"

"اس کا نام شادو تھا"۔

"تُو نے کون سا دوش کیا ہے کہ اب تمہارا اس سے بیاہ نہیں ہوسکتا؟"

پھر میں نے اُسے تمام باتیں بتا دیں وہ بڑی توجہ سے میری باتیں سنتی رہی اور پھر بولی تو اس کی آواز میں ہلکی لرزش اور افسوس کے تاثرات شامل تھے۔

"دیکھ جوان! تُو نے بنتو اور رجو کے ساتھ جو کیا وہ پاپ ہے۔ اس کی تو کوئی مذہب بھی اجازت نہیں دیتا لیکن اگر میں......" پھر وہ خاموش ہوگئی۔

"لڑکی! تم خاموش کیوں ہوگئی؟"

"دیکھ جوان! میرے دھرم کے پجاری تو ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ پاپ اور پُن کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہئے"۔ اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "یہ سب اس دھرتی پر منش کے بنائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں اور منش نہیں سمجھ سکتا کہ پاپ اور پُن کیا ہوتا ہے۔ ان باتوں سے صرف دیوتا ہی واقف ہوتے ہیں۔

"دیکھو لڑکی! تم بات کھا گئی ہو، تم کچھ اور کہنے والی تھی لیکن کہہ کچھ اور دیا"۔

"کیا تُو سچ سننا چاہتا ہے؟"

"ہاں"۔

"تو پھر سن میں یہ کہنے والی تھی کہ اگر میں مہاراج کو وچن نہ دے چکی ہوتی اور واقعی میں ایک ناری ہوتی تو تجھ سے پریم ضرور کرتی"۔

"تم نے مہاراج کو کیا وچن دیا ہے؟"

"اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں ہے"۔

"اور یہ ناری ہونے کا مطلب کیا ہے؟"

"یہ میں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں کہ میں ناری نہیں ناگن ہوں"۔

"اچھا اگر تم مہاراج کو وچن نہ دے چکی ہوتی اور ناری ہوتی تو میرے ساتھ پریم کیوں کرنا چاہتی؟"

"اس لئے کہ میں نے تم جیسا سندر، مضبوط نوجوان آج تک نہیں دیکھا"۔

اب میں صحیح معنوں میں سٹپٹا گیا تھا۔ مجھے اس کی پُراسرار باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے کہا اِدھر میرے قریب آؤ۔ وہ میرے قریب آ گئی۔

"اِدھر میرے پاس بیٹھ جاؤ"۔ میں نے کہا۔

"جوان اس بات پر تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے"۔ اس

نے کہا۔ "ویسے بھی میرا تم سے دور رہنا تمہارے فائدے میں ہے"۔

"خدا کے لئے لڑکی پہیلیاں نہ بجھواؤ"۔ میں نے چڑ کر کہا۔ "آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

"میں تو کچھ بھی نہیں چاہتی"۔ اس نے کہا۔ "بس یہی چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے دور ہو اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے تم سے نفرت ہے بلکہ اس کا مطلب ہے کہ مجھے تم سے پریم ہے گہرا پریم"۔

"پریم تو قرب چاہتا ہے"۔ میں نے کہا۔ "یہ کیسا پریم ہے کہ جو دوری کو پسند کرتا ہے؟"

"سچ بتاؤں؟" اس نے کہا۔ "یہ میرا پریم ہی ہے جو مجھے تم سے دور رکھ رہا ہے ورنہ اب تک میں تمہیں ڈس چکی ہوتی"۔

"ٹھیک ہے لڑکی! اب تم چلی جاؤ اور مجھے آرام کرنے دو"۔ میں نے اکتا کر کہا۔

"میری اِچھا بھی یہی ہے اچھا نمسکار"۔

اس کے جانے کے بعد میں مختلف خیالوں میں کھو گیا۔ رجو کے ساتھ آنے والا سانحہ پھر مجھ پر مسلط ہونے لگا۔ شادو، اما، پھپھو، پھوپھا ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ پھر پتا نہیں کس وقت نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ صبح جب میں جاگا تو میں نے دیکھا کہ میری متاثرہ پنڈلی والا پاؤں کسی نے مضبوطی کے ساتھ چارپائی کی پائنتی سے باندھ رکھا ہے۔ میں نے آواز دی۔ ہے کوئی۔ وہی رات والی لڑکی بھاگتی ہوئی میرے پاس آ گئی اور میرے پاؤں کی طرف کھڑی ہوگئی۔ میری نظریں جوں ہی اس کے چہرے پر پڑیں میں پلکیں جھپکنا بھول گیا۔

"کیا تم رات والی لڑکی ہو؟"

"ہاں، کیوں تمہیں کوئی شک ہے؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

نذیر! رات رات ہوتی ہے، دن کی روشنی میں وہ لڑکی اتنی خوبصورت اور پُرکشش تھی کہ میری آنکھیں اِدھر اُدھر دیکھنا بھول گئیں۔

"گھبراؤ نہیں جوان!" میری حالت دیکھ کر لڑکی کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور کہنے لگی۔ "میں جوگی مہاراج کی آگیا کے انوسار تمہاری سیوا کر رہی ہوں۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا مہاراج کہہ گئے تھے کہ تمہارے پاؤں کو اچھی طرح سے باندھ دوں کہیں سوتے میں پنڈلی ہل نہ جائے۔ تمہارے پاؤں کو میں نے ہی باندھا ہے تم گہری نیند سوئے ہوئے تھے"۔

"کوئی بات نہیں سندری!" میں نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "کیا ابھی جوگی مہاراج نہیں آئے؟"

"بس آتے ہی ہوں گے"۔

"وہ کہاں گئے ہیں؟"

"وہ ایک جروری (ضروری) کام سے گئے ہیں، تم منہ ہاتھ دھو لو اور بھوجن کر لو پھر......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"پھر کیا؟"

"پھر کچھ بھی نہیں"۔ اس نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ وہ ناشتہ لے کر آئی دیسی گھی میں چپڑے ہوئے پراٹھے انڈہ اور کافی مقدار میں حلوہ جو گڑ سے تیار کیا گیا تھا۔

"دیکھ لڑکی اگر میں تمہیں سندری کہوں تو تمہیں بُرا محسوس تو نہیں ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں مجھے کیوں بُرا محسوس ہوگا بلکہ مجھے شانتی ہو گی۔ میرے من میں تمہارا پریم جو ہے"۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کی آنکھوں میں گہری سرخی موجود تھی جیسے پلکوں کی اوٹ میں شعلے بھڑک رہے ہوں۔ میں نے خوب سیر ہو کر ناشتہ کیا۔ اتنے میں وہ مٹی کی پیالی میں دوائی لے آئی اور بڑی ہی ملائمت سے میری پنڈلی پر لگانے لگی۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''سندری! جو سلوک تُو نے میرے ساتھ کیا ہے میں ساری زندگی نہیں بھولوں گا''۔ میں نے واقعی دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ''لیکن اگر تُو میرے ساتھ آخری نوازشیں بھی کر دیتی تو گزری ہوئی رات ایک یادگار رات بن جاتی''۔

''جوان! مجھے ایک بات کا جواب دے دے؟''

''ہاں بول''۔

''اگر کوئی زہریلی ناگن کسی منش کو ڈسنے سے انکار کر دے جب کہ اس کا وِش (زہر) اسے نشٹ کر دینے والا ہو تو منش کو اس کا شکر گزار ہونا چاہئے یا......''

''شکر گزار ہونا چاہئے''۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تو پھر تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہئے''۔ اس نے کہا۔ ''میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں ناری نہیں ہوں ایک ناگن ہوں جس نے انسانی روپ دھارا ہوا ہے''۔

''لیکن تم تو ایک سندر ناری ہو''۔ میں نے اس کے حسین سراپے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا ظاہری روپ ہے، حقیقت میں مَیں ناگن ہی ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''کیا تم کو میری بات میں کوئی کھوٹ نظر آتا ہے؟''

''نہیں تو لیکن میں کچھ سمجھ نہیں رہا''۔

''اچھا ذرا ٹھہر''۔ وہ باہر نکلی اور ایک تھالی میں کالے رنگ کے تین چار بڑے بڑے چیونٹے رکھ کر لے آئی جو اس نے کیکر کے درخت کے تنے سے پکڑے تھے پھر میرے قریب کر کے کہنے لگی۔ ''جوان! غور سے دیکھ یہ زندہ ہیں یا مُردہ؟'' چیونٹے تھالی میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ میں نے کہا یہ زندہ ہیں، پھر اس نے اُن پر تھوکا تو میری حیرانگی کی حد نہ رہی چیونٹے مر چکے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے پوچھنے لگی۔

''یہ مر کیوں گئے؟''

''مم مم...... مجھے نہیں پتہ''۔ میں نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

''میرے منہ میں زہر ہے زہر''۔ اس نے پھنکارتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں ناگن ہوں ناگن زہریلی ناگن، سادھو، پجاری، جوگی سب مجھ سے بچ کر رہتے ہیں''۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اور گہری ہو گئی مجھے اس سے خوف محسوس ہونے لگا پھر وہ باہر نکلی اور ایک پٹاری ہاتھ میں پکڑے ہوئے میرے قریب آئی۔

''جوان! یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا''۔ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دراصل میرے ناشتے کا وقت ہو گیا ہے''۔ اس نے کہا۔ ''اور اس میں میرے ناشتے کا سامان ہے''۔

''ٹھیک ہے تم ناشتہ کر لو''۔ میں نے کہا۔ وہ نیچے زمین پر بیٹھ گئی اور پھر اس نے پٹاری کا ڈھکنا اٹھایا تو دہشت کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ ایک سنہری رنگ کا بڑا سا سانپ پھن پھیلائے پھنکار رہا تھا۔

''لڑکی! پیچھے ہٹ جاؤ''۔ میں نے غیر اختیاری طور پر چیختے ہوئے کہا۔

''جوان کچھ نہیں ہوگا''۔ وہ پُرسکون لہجے میں بولی اور پھر اس نے اپنا ہاتھ سانپ کے سامنے کر دیا اور سانپ نے اس کی انگلی پر اپنے دانت گاڑھ دیئے اور پھر الٹا ہو کر اپنا زہر لڑکی کے جسم میں انڈیل دیا''۔

''دھنواد ناگ دیوتا!'' لڑکی نے آہستہ سے کہا اور دوسرے ہاتھ سے ناگ کا سر پکڑ کر انگلی سے علیحدہ کیا اور پٹاری میں رکھ کر ڈھکنے سے بند کر دیا۔ میں نے ایک جھرجھری لی اور ابھی کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

(یہ سنسنی خیز داستان جاری ہے)

سقوطِ ڈھاکہ

ایم اے جاوید
برمنگھم

اے دل نثارِ مغرب کر غور، سن خدارا!
میری زبانِ دل کا تشبیہ و استعارا

حرصِ دنی کی میں نے جب کشتیاں جلائیں
میری اذاں سے چمکا یورپ کا ہر ستارا

جب اقتدار خاطر ملت شکن ہوا میں
غرناطہ بھی گنوایا ڈھاکہ بھی میں نے ہارا

دل سے ضیاء اٹھا کر اوڑھی شب جفیوا
دل خوں ہوا سمرقند گہنا گیا بخارا

ایمان کو عمل سے کاٹا ہے سرحدوں نے
ٹوٹے عرب سے پوچھو، بے جاں عجم ہے سارا

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اے توتئ وقارب! اے دام صد غلامی!
تیری روش نے لوٹا! تیری ڈگر نے مارا

اس تیغ حق سے ڈر کر باطل کی ہے زباں پہ
دہشت گری کا طعنہ ترکِ جہاد نعرہ

مغرب کی ظلمتوں کو روشن خیال کہہ کر
ناموسِ دیں کی ذلت کرتے ہیں ہم گوارا

آلودۂ سیاست کر کے سپہ گری کو
بارود آشیاں میں کرتے ہیں ہم شرارا

اے وادئ کھوٹہ تیرا جنوں جکڑ کر
محسن کے جان و دل کا یوں قرض ہے اتارا

جاویدؔ بو رہے ہو ایمان کو عمل میں
ہم کو نہیں گوارا جا کر کہیں گزارا

❁

نوٹ: تبصرے کیلئے کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے۔

تبصرہ نگار: صلاح الدین چغتائی

درس گاہ صفہ کا نظام تعلیم و تربیت

مصنف : تفسیر عباس
پبلشرز : زاویہ پبلشرز-C-8 دربار مارکیٹ، لاہور

اگرچہ سیرت النبیؐ پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں مسلمان مصنف بھی ہیں اور غیر مسلم بھی اور ہر مصنف نے کوشش کی ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایک ایک گوشے کو امت کے سامنے بے نقاب کیا جائے۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شب و روز کے اعمال خواہ ان کا تعلق آپ کی خانگی زندگی سے ہے، عسکری زندگی سے ہے یا معاشی یا معاشرتی زندگی سے ہے غرضیکہ سیرت نگاروں نے آپ کی حیات طیبہ کو لوگوں کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے اور یہ بات واضح طور پر دنیا کے سامنے رکھ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں کس طرح واضح حقیقت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھر کا عمل تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ آپ کی حیات طیبہ کا ہر ہر لمحہ صرف مسلمان کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر انسان کے لئے زندگی گزارنے کا بہترین ذریعہ فراہم کرتا ہے لیکن "درس گاہ صفہ" کے مصنف قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے ایک ایسے پہلو پر قلم اٹھایا ہے جس پر اتنی تفصیل سے کسی سیرت نگار کی قلم نہیں چلی۔ اگرچہ یہ وہ موضوع ہے جس پر اسلام کی بنیاد قائم ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی میں تعلیم کو اسلام کی ابتدائی بنیاد قرار دیا گیا۔ جب تک مسلمان اس بنیاد کی آبیاری کرتے رہے دنیا میں ان کا ممتاز مقام رہا اور ان کا زوال بھی اس وقت

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

شروع ہوا جب ہم نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے تعلیمی نظام کو یکسر چھوڑ کر غیروں کے نظام کو اپنایا۔

اس کتاب میں مصنف نے اسلام کے اس ابتدائی تعلیمی نظام کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ کامیاب تعلیمی نظام وہی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عطا فرمایا ہے اور اس علم کے حاصل کرنے کے لئے نہ تو کوئی عمر کی قید ہے نہ دولتمند ہونے کی ضرورت ہے، نہ ہی کسی کی مشاورت کی ضرورت ہے اور اس تعلیمی اقدار کا مقابلہ ایک دینی درسگاہ اور عصری درسگاہ کے طالب علموں کے رہن سہن، اخلاق و عادات کے فرق میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

بہرحال یہ کتاب ایسا سرمایہ ہے جس سے ہر مسلمان کو استفادہ کرنا چاہئے۔ خصوصی طور پہ مدارس سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں میں یہ کتاب موجود ہو اور اساتذہ اس کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ طلباء کو اس کتاب کے پڑھنے کی ترغیب دینی چاہئے کہ ہماری نئی نسل کو اس بات کا ادراک ہو کہ اہل صفہ نے تعلیم کے لئے اپنی دنیا کی زندگی کو نظر انداز کر کے آنے والی نسلوں کے لئے ایک ایسی راہ متعین کر دی کہ ہماری زندگی کا بنیادی مقصد زندگی کی آرائش و زیبائش نہیں بلکہ زندگی میں علم حاصل کر کے لوگوں کی زندگیوں کو آلائشوں سے پاک کر کے انہیں زندگی کے اصل مقصد کی طرف لانا ہے جو کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑتا ہے۔

مصنف نے لکھتے ہوئے ربط کو اس طرح قائم رکھا ہے کہ پڑھنے والا شروع سے آخر تک مطالعہ میں غرق رہتا ہے اور پڑھنے کے بعد اس کے اندر تشنگی اور بڑھ جاتی ہے۔ میرا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ زاویہ پبلشرز کی اس سے پہلی جتنی بھی دینی موضوعات کی کتب میری نگاہ سے گزری ہیں ان میں اس کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

میں مصنف، ان کے معاونین اور ادارہ زاویہ پبلشرز والوں کو یہ کتاب لکھنے اور اشاعت کرنے پر دلی مبارکباد دیتا ہوں اور دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت ان سب کو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اپنا قرب عطا فرمائے اور کتاب مذکورہ کو قبولیت کا شرف عطا فرمائے۔

ہم نے پاکستان کیسے بنایا

مصنف : عمیر محمود صدیقی
صفحات : 608
قیمت : -/550 روپے
ناشر : زاویہ پبلشرز- دربار مارکیٹ لاہور

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے اس میں مسلمانانِ ہند کے خون سے لکھی گئی ہجرت آزادی کی سچی داستانیں شامل ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ ہر اس شخص کی داستان ہے جو بھارت سے ہجرت کے بعد خون اور آگ کے کئی دریا عبور کر کے زندہ سلامت پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ ان داستانوں کو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے تاکہ ہماری نئی نسل جو انڈیا کی فلموں اور اداکاراؤں کی دیوانی ہے اور ''امن کی آشا، پیار کی بھاشا'' کے فریب میں آ کر سرحد کو محض ایک لکیر سمجھنے لگی ہے وہ یہ جان سکے کہ یہ ملک کتنی عظیم قربانیوں کے بعد حاصل ہوا تھا۔

بعض حلقے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ان داستانوں کو سنانے کا کیا فائدہ؟ سرکاری سرپرستی میں محبت و خیرسگالی کے نام پر سکھوں سے جپھے ڈالے اور پگڑیاں بدلی جاتی ہیں۔ دانشوروں، صحافیوں، ادیبوں، شاعروں، آرٹسٹوں اور ناچنے گانے والوں کے تبادلے ہوتے ہیں۔ بھارت کے ساتھ تجارت بڑھانے پر زور دیا جاتا ہے اور 1947

میں کھینچی گئی ''لکیر'' مٹانے کی باتیں کرتے ہیں۔

دنیا کی کسی قوم نے آزادی کے لئے اتنی بڑی قربانی نہیں دی جتنی برصغیر کے مسلمانوں نے دی ہے۔ محترم عمیر محمود صدیقی صاحب نے بڑی محنت سے شمع آزادی پر نثار ہونے والے پروانوں کا حال لکھا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ نوجوان اپنی تاریخ کو مت بھولیں ورنہ تاریخ اپنے آپ کو دہرایا کرتی ہے اور اگر ہم تاریخ سے سبق نہ سیکھیں گے تو تاریخ ہمیں دوسروں کے لئے باعثِ عبرت بنا دے گی۔

کتاب بڑے عمدہ طریقے سے پیش کی گئی ہے اور اس کتاب کو سکولوں، کالجوں کی لائبریریوں کے لئے اور ہر گھر میں بچوں کے لئے پڑھانا وقت کی ضرورت ہے۔

فوائد الفواد

ملفوظات حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

مرتب : حضرت میر حسن سنجریؒ
مترجم : خواجہ حسن ثانی نظامی دہلویؒ
صفحات : 528
قیمت : -/450 روپے
ناشر : زاویہ پبلشرز- دربار مارکیٹ لاہور

برصغیر پاک و ہند جو کبھی ظلمتوں کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور بت پرستی عام تھی، اس سرزمین پر اسلام کی روشنی پھیلانے کا سہرا بزرگان دین کے سر ہے جو مختلف ادوار میں یہاں آئے اور دین حق کا پرچم بلند کیا۔ انہی جید بزرگان میں ایک بڑا نام سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء، محبوب الٰہی قدس رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ آپ کی ذات گرامی ہندوستان کی روحانی اور تہذیبی تاریخ میں ایک ایسی جامع کمالات شخصیت ہے کہ ایسی دل آویز ہستیاں تاریخ بشریت میں خال خال ہی پیدا ہوئی ہیں۔ آپ ایک صوفی باصفا ہی نہیں تھے جنہوں نے تصوف اسلامی کی تمام خوبیوں کو اپنی سیرت کے آئینے میں دکھا دیا بلکہ ایک نکتہ رس فقیہہ، محدث، مفسر، محقق اور ادبیات عربی و فارسی کے تبحر عالم، شاعر اور تاریخ و سیر پہ گہری نظر رکھنے والے نہایت وسیع المطالعہ اور باخبر انسان تھے۔ ان کے حالات و ملفوظات آج بھی عوام الناس کی رہنمائی کے لئے مؤثر ترین ہیں۔

اس کتاب کے گزشتہ سوا سو برس سے لاتعداد ایڈیشن عربی و فارسی میں چھپ چکے ہیں۔ اصل کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اسے محترم خواجہ حسن نظامی دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اُردو زبان کے قالب میں ڈھالا ہے تاکہ ہر خاص و عام یکساں طور پر ان ملفوظات سے مستفید ہو سکے۔

یہ کتاب پانچ جلدوں پر پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد 34 مجلسوں، دوسری 38 مجلسوں، تیسری 17 مجلسوں، چوتھی 67 مجلسوں اور پانچویں 32 مجلسوں پر مشتمل ہے۔

مختصر یہ برصغیر میں مسلم تمدن، تہذیب و ثقافت کی صورت گری کرنے والی ایک اہم اور عظیم المرتبت روحانی شخصیت کے ملفوظات، تعلیماتِ تصوف کی دل میں اتر جانے والی تشریح، مُردہ قلوب کے احیاء اور تزکیہ کا مؤثر ذریعہ ایک انتہائی معتبر مجموعہ ہے جسے اولیاء و عارفین نے ہمیشہ حرز جاں بنائے رکھا۔

تجھ بن ذات ادھوری ہے

شاعر : کامی شاہ
صفحات : 272
قیمت : 200 روپے
ناشر : ق پبلی کیشنز- ڈیرہ اسمٰعیل خان

ادبی حلقوں میں کامی شاہ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی ابتدائی شہرت ان کے شاہکار افسانے ہیں جن میں کامی نے منٹو کی طرح بے باک موضوعات کو

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

چتا ہے لیکن زبان منٹو کی طرح کھلی ڈلی نہیں بلکہ مظہرالاسلام کی طرح علامتی استعمال کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ پردے والی بات کو پردے میں بھی کہا جاسکتا ہے۔ یوں مصنف نے افسانے میں ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ ہمیں ان کے افسانوی مجموعے کا انتظار تھا لیکن وہ بنیادی طور پر شاعر ہے اس لئے کامی نے اپنی پہلی کتاب کے طور پر اپنی شاعری ''تجھ بن ذات ادھوری ہے'' کے نام سے پیش کرنا بہتر سمجھا۔ اس کتاب میں کامی شاہ نے غزل، نظم، مفرد، ثلاثی اور قطعات وغیرہ پر مشتمل تمام شعری تجربات کو یکجا کر دیا ہے۔

کراچی کے نوجوان شعراء میں وہ تجریدیت کے نمائندے کے طور پر مشہور ہے۔ انہوں نے جہاں غزل میں نامانوس، جدید اور عجیب وغریب قوافی اور خیالات استعمال کئے ہیں وہاں نظم میں بھی ان کے تجربات کم نہیں۔ ان کی بعض نظمیں ایک دو لائنوں حتیٰ کہ ایک دو لفظوں پر مشتمل بھی ہیں۔ کامی شاہ نے آزاد، جدید اور معریٰ میں بھی منفرد تجربات کئے ہیں۔ ان کی بعض نظمیں اگر اختصار اور جامعیت کی مظہر ہیں تو بعض میں خیالات کا اتنا ہجوم ہے کہ اسے طوفان بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان کے خیالات میں جہاں جدت، روانی اور تسلسل پایا جاتا ہے وہاں کہیں کہیں تکرار بھی ہے۔ شاید اس کی وجہ ان کی زودگوئی ہے یا انہوں نے زور دینے کے لئے ایک ہی بات بار بار مختلف انداز میں کہنے کی کوشش کی ہے۔

بہرحال کامی شاہ کے تجربات نہ صرف منفرد ہیں بلکہ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ انہوں نے افسانوں کی طرح اپنی شاعری میں بھی علامتوں کا استعمال کیا ہے لیکن اس سے کہیں کہیں ان کی شاعری بوجھل ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جہاں وہ اپنا کوئی فلسفہ بیان کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ اندر سے فلسفی ہے اور جون ایلیا کی فلسفیانہ شاعری سے متاثر بھی۔ اس کی شاعری میں Nostalegia کی گونج بہت شدید ہے اور وہ اکثر یاسیت طاری کر دیتی ہے اور یہ عین فطری ہے اور ہمارے ماحول اور حالات کی دین ہے اور کوئی بھی حساس آدمی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جب ہر طرف الم کے سائے ہوں تو کوئی بھی ایماندار فنکار ان سے کان کیسے بند کرسکتا ہے لیکن وہ صرف نوحہ حالات ہی نہیں لکھتا بلکہ بہتری کے امکانات بھی پیش کرتا ہے اور یہی اس کی حقیقت پسندی اور تعمیری شخصیت کی دلیل ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ محبت سے بالکل عاری ہے۔ وہ تو سراپا محبت ہے اور اس کی شاعری میں رومان بھی جابجا بکھرا ہوا ہے لیکن کامی کی شاعری پہ رومان سے زیادہ مقصدیت غالب ہے اور ان کی جواں عمری کو دیکھتے ہوئے یہ ذرا عجیب سی بات لگتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یا تو وہ جوان ہوا ہی نہیں یا جوانی سے فوراً بڑھاپے کی طرف آ گیا ہے۔ کامی شاہ کی شاعری کے نمونے کے طور پر ایک غزل قارئین کی نذر کی جاتی ہے۔

بھوک پر اعتبار مت کرنا
تم پرندے شکار مت کرنا
شام اُداسی کا استعارہ ہے
شام کو اختیار مت کرنا
خود جلانا کوئی دیا گھر میں
چاند پر انحصار مت کرنا
کرچیاں انگلیاں چبا لیں گی
زخم اب کے شمار مت کرنا
یہ کوئی راز رکھ نہیں سکتی
آنکھ پر اعتبار مت کرنا

تبصرہ: (خادم حسین مجاہد)

چند روزہ زندگی کے لئے

حرام کی کمائی کرنے والوں اور اس پر پلنے والی اولادوں کا عبرت ناک حال۔ آنکھ والوں کے لئے سامانِ عبرت!

☆ فرزانہ نگہت

''تم ہی بتاؤ ایک سپروائزر کی تنخواہ ہی کتنی ہوتی ہے؟ اس میں چھ سات بچوں کی فیسوں، کپڑوں لتوں آمدورفت کا خرچ اور دال روٹی کا خرچ پورا ہوسکتا ہے؟ اوپر کی آمدنی نہ ہوتو ہم نری تنخواہ میں پانچ دن بھی گزارانہ کرسکیں۔ یہ ہماری مجبوری ہے بتاؤ کیا کریں؟ تمہارے خالو کی تین تین نوکریاں بھی ہمارے گھر کا خرچ نہیں چلاسکیں''۔

انور خالہ کے عذر گناہ بدتر از گناہ پر میں نے اس روشن اور کھلے ہوادار کمرے میں آراستہ شاندار قیمتی صوفوں، ایرانی قالین، شیشے کی سطح والی میزوں، بیش قیمت ریشمی پردوں اور آرائشی اشیاء پر نظر ڈالی۔ چینل کے بڑے سے رنگا رنگ نگ جڑے فرشی گلدان پر تو میری نظریں جم کر رہ گئیں۔

''ہم صرف اتنا ہی لے رہے ہیں کہ گھر کی دال روٹی چل سکے۔ تن ڈھانکنے کو کپڑے مل سکیں، بچوں کی فیسوں کتابوں کا اور آمدورفت کا خرچ نکل آئے۔ بجلی، پانی، گیس کے بل دے سکیں۔ رشتے داروں میں عزت بنی رہے، اس سے زیادہ کا ہمیں لالچ نہیں۔ سفید پوشی کا بھرم رکھا ہوا ہے، یہی کافی ہے''۔

''ٹھیک کہتی ہیں آپ''۔ میں بولی۔ کسی کے گھر میں بیٹھ کر اسے کچھ کہنا کہاں مناسب ہوتا۔

''ہمارے ایک دو بچے تھے تو خالی تنخواہ میں گزارا

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

ہو جاتا تھا۔ پھر اور بچے بھی آنے لگے، خرچ بڑھنے لگا، تنخواہ کم پڑنے لگی، دال روٹی چلانی مشکل ہو گئی تو ہمیں مجبوراً یہ راہ اختیار کرنی پڑی اور بھلا ہم کیا کرتے؟ تمہارے خالو نے ایک چھوڑ دو جگہوں پر ملازمتیں کرنی شروع کیں پھر بھی ہمارا خرچ پورا نہ ہو سکا۔ اب شکر ہے اچھا کھا پہن رہے ہیں۔ بچے اچھے سکولوں کالجوں میں پڑھ رہے ہیں۔ خاندان میں عزت بنی ہوئی ہے۔ اب تو فرزانہ شبانہ کے رشتے بھی آنے شروع ہو گئے ہیں۔ بس یہ ذرا ایف اے بی اے کر لیں پھر ان کی شادیاں کر دیں گے"۔

اسی وقت دروازے کا دبیز حریری پردہ ہٹا کر ان کی چھوٹی بیٹی نویں جماعت کی طالبہ تبسم چائے کی ٹرالی لئے اندر داخل ہو گئی۔ امیرانہ ٹھاٹ باٹ کے باوجود انور خالہ نے یہ بات اچھی کر رکھی تھی کہ اپنی بیٹیوں کو فیشن پرست اور آزاد خیال نہ بننے دیا تھا۔ وہ نماز روزہ کی پابند بھی تھیں۔ لباس بھی پُر وقار پہنتی تھیں، برقعے بھی لیتی تھیں۔

"السلام علیکم باجی!" کمرے میں داخل ہوتے ہی تبسم نے مجھے سلام کیا اور چائے کے لوازمات سے لدی ٹرالی ہمارے سامنے کھڑی کر دی۔

میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ "کیسی ہو تبسم!"

"اللہ کا شکر ہے، آپ تو بہت دنوں بعد آئیں"۔

وہ میرے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔

انور خالہ اپنی جگہ سے اٹھ گئیں۔

"تبسم تم ذرا باجی کی خاطر تواضع کرو۔ میں آپا کو فون کر آؤں"۔

میں حیرت زدہ رہ گئی۔ انہوں نے گھر میں فون بھی لگوا لیا تھا۔ (یہ اس زمانے کی بات ہے جب گھر میں فون لگوانے پر بیس ہزار روپے لگ جایا کرتے تھے۔ یہ اُس وقت خاصی بڑی رقم ہوتی تھی)

"تبسم! کب لگوایا ہے تم لوگوں نے فون؟"

"ہفتہ بھر ہو گیا ہے۔ اب بڑا مزہ آنے لگا ہے باجی! اب مجھے اپنی سہیلیوں سے ملنے ان کے گھر دور دور نہیں جانا پڑتا۔ میں گھر بیٹھے بیٹھے ان سے باتیں کر لیتی ہوں۔ ہاں باجی! اب حمزہ بھائی جان نے موٹر سائیکل لے لیا ہے۔ وہ اب اس پر کالج آتے جاتے ہیں۔ ابا جان کہہ رہے تھے کہ وہ اس سال زاہد بھائی کو بھی موٹر سائیکل لے دیں گے۔ ان کا کالج ذرا دور ہے"۔

اب ظاہر تھا میری حیرت دوچند ہونی ہی تھی۔

"حمزہ نے نیا موٹر سائیکل لیا ہے کیا؟"

"ہاں باجی! بالکل نیا ہونڈا"۔ اس نے قیمت بتائی۔ "اور باجی کل ابو جان وی سی آر خرید کر لائے ہیں نیشنل کا۔ حمزہ بھائی آج بھارتی اور انگریزی فلموں کے بہت سے کیسٹ خرید کر لائیں گے۔ پھر ہم وی سی آر پہ یہ فلمیں دیکھا کریں گے"۔ وہ اپنے بچپن کے بھولپن میں اپنے گھر آئی نت نئی دوسری چیزوں کے بارے میں بتانے لگی۔ نیکون کا کیمرہ، الیکٹرک کیتل، الیکٹرک نائف، سینڈوچ میکر اور جانے کیا کیا۔

انور خالہ تو گویا ٹیلی فون سے چپک کر رہ گئی تھیں۔

میں چائے سے فارغ ہونے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

"اچھا بھئی میں تو چلتی ہوں۔ اپنی امی سے کہہ دینا اور کسی دن تم بھی ضرور ان کے ساتھ ہمارے گھر آنا"۔

اپنے غریبانہ سے گھر پہنچ کر میں نے بے مقصد ہی اس کا چکر لگایا۔ تین چھوٹے چھوٹے کمرے جن میں ایک بیٹھک تھی جس میں چار معمولی سی کرسیاں ایک میز اور ایک تخت پوش بچھا تھا۔ جس کی باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر رضائی کے کپڑے سے بنائے ہوئے پردے پڑے تھے۔ اس کا فرش ننگا تھا۔ دیواریں بالکل خالی تھیں۔ اس میں زرد روشنی کا ایک بلب جلتا تھا۔ باقی دو

کمروں میں دو دو چارپائیاں اور دو چھوٹی میزیں رکھی تھیں۔ باورچی خانہ اتنا چھوٹا سا تھا کہ اس میں بمشکل ہی پیڑھی پر بیٹھ کر چولہے پر کچھ پکایا جا سکتا تھا۔ یہی حال غسل خانے کا تھا جس میں ایک بالٹی اور ایک چوکی بھی بمشکل ہی سما پاتی تھیں۔ سٹور نہ ہونے کی وجہ سے صندوق اور دوسری چیزیں ایک کمرے میں رکھے ہوئے تھے۔ مختصر سا برآمدہ مختصر سا صحن جس میں کوئٹہ کی ٹھٹھرا دینے والی سردیوں میں دھوپ تھوڑی ہی دیر کے لئے اپنی خوشگوار حدت بکھیر جاتی تھی۔ یہ ایک بے حد سادہ اور غریبانہ سا گھر تھا لیکن اس میں والد کی کم مگر حلال کمائی نے ایسا بابرکت ماحول پیدا کر رکھا تھا کہ ہم بہن بھائی (والدہ انتقال کر چکی تھیں) دال روٹی کھا کر موٹے جھوٹے کپڑے پہن کر بھی بے حد خوش اور مطمئن رہتے۔ ہماری زبانیں ہر قسم کے شکوہ شکایتوں سے ناآشنا اللہ کی شکر گزار رہتیں۔ ہاں ہمارے درمیان ایسی باتیں ضرور ہوا کرتیں کہ کبھی نہ کبھی ہمارے حالات ضرور بدل جائیں گے۔ ہمیں بھی خوشحالی اور فارغ البالی نصیب ہوگی۔

انور خالہ کا خاندان ہمارے سامنے ہی بہاولپور سے ٹرانسفر ہو کر کوئٹہ پہنچا تھا اور ہمارے گھر کے سامنے ایک معمولی سے دو کمروں کے کوارٹر میں فروکش ہوا تھا۔ ان کے شوہر بٹ صاحب ایک سرکاری ادارے میں سپروائزر تھے۔ ان کے چھوٹے بڑے سات بچے تھے۔ جن کو انہوں نے آتے ہی سرکاری سکولوں میں داخل کروا دیا تھا۔ جب میرا انور خالہ سے میل جول بڑھا تو میں نے انہیں بے حد خوش مزاج ملنسار اور ہمدرد طبیعت کی خاتون پایا۔ ان کے بچے بھی شائستہ اور تمیز دار تھے۔ معلوم ہوتا تھا ان کا تعلق اچھے اور مہذب خاندان سے تھا۔ ایک دوسرے کے گھر میں آمد و رفت نے ہمارے خاندانوں کے درمیان جلد ہی دوستانہ روابط استوار کر دیئے۔ انور خالہ کا گھر یوں تو خوب صاف ستھرا حسن سلیقگی کا نمونہ دکھائی دیتا تھا لیکن

اس میں غربت کے مہیب سائے ہر دم رقصاں دکھائی دیتے۔ ڈھنگ کے برتن، ڈھنگ کا فرنیچر تو درکنار، بچوں کے اور خود ان کے تن پر بھی ڈھنگ کے لباس بھی نہ ہوتے۔ انور خالہ کو اپنے شوہر کی قلیل تنخواہ اور خرچ پورا نہ ہونے کا ہر دم گلہ رہتا۔ اپنی کم مائیگی بلکہ بدقسمتی کے شکوے ہر دم ان کی نوک زبان پر رہتے۔ میں انہیں حوصلے ہمت کی تلقین کرتی۔ حلال رزق کی خوبیاں گنواتی۔ بڑے بڑے انبیاء و اولیاء کی مثالیں دیتی کہ وہ کیسے انتہائی غربت و ناداری میں بھی اللہ کے شکر گزار بندے بنے رہتے تھے مگر ان کے شکوے شکایتیں کم نہ ہوتے تھے۔

پھر جانے کیسے ان کے حالات بدلنا شروع ہو گئے۔ ان سب کے جسموں پر عمدہ لباس آ گئے۔ گھر میں عمدہ برتن اور فرنیچر دکھائی دینے لگا۔ خاطر تواضع کے لئے نری چائے یا کبھی کبھار نمک پاروں یا سستے بدمزہ بسکٹوں کی جگہ رنگارنگ مشروبات عمدہ کیک پیسٹریاں اور سموسے پیش کئے جانے لگے۔ انور خالہ کی سونی کلائیاں سونے کی چوڑیوں سے بھر گئیں۔ کانوں میں جھمکے اور گلے میں جڑاؤ لاکٹ جھلملانے لگے۔ ہاتھوں میں ہر وقت تین تین انگوٹھیاں دکھائی دینے لگیں۔ پھر انہوں نے اپنے سب بچوں کو سرکاری یا "خیراتی" سکولوں سے نکال کر نہایت مہنگے اونچے درجے کے نجی سکولوں میں داخل کروا دیا۔ بٹ صاحب جو پہلے بوسیدہ پرانی سائیکل کھڑکھڑاتے ہوئے دفتر جایا کرتے تھے اب نئی چمچماتی موٹر سائیکل پر آنے جانے لگے۔ پھر ایک دن سنا گیا کہ وہ لوگ اپنا وہ تنگ و تاریک سا سرکاری کوارٹر چھوڑ کر ایک نسبتاً بڑے اور کشادہ سے کرائے کے مکان میں منتقل ہو رہے ہیں۔ وہ مکان اس جگہ سے دور نہیں تھا اس لئے مجھے امید تھی کہ ان لوگوں کے وہاں چلے جانے کے بعد بھی ان سے میل جول قائم رہے گا۔

ان لوگوں کے اس نئے گھر میں منتقل ہونے کے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بعد جب میں پہلی مرتبہ انور خالہ سے ملنے گئی تو ان لوگوں کا رہن سہن اور طور وطرائق دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ وہ کرائے کا مکان ایک بڑا سا بنگلہ تھا۔ اس کے باہر ہرا بھرا صحن تھا۔ اس میں پورٹیکو بھی تھا۔ تمام گھر کی سجاوٹ نہایت دیدہ زیب اور حیران کن تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ ایک معمولی سے سپروائزر کا گھر ہو سکتا تھا۔ رہن سہن کی تبدیلی کے ساتھ ہی میں نے افراد خانہ کے رویوں میں بھی تبدیلی محسوس کی۔ ان میں اب کچھ غرور اور امیرانہ سرد مہری کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی۔ انور خالہ کے تو رنگ ڈھنگ ہی بدل چکے تھے۔ ان میں ایک طرح کی ''بیگماتی شان'' پیدا ہو گئی تھی۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اب گھر کے کام کاج کے لئے دو نوکرانیاں رکھ لی تھیں۔ وہ خود صرف ناشتہ اور کھانا ہی بنایا کرتی تھیں۔ یوں ان کے پاس گھومنے پھرنے اور بازاروں کے چکر لگانے کے لئے کافی وقت نکل آتا تھا۔ اس وقت میں جو ان کی اس پُراسرار سی امیری کے راز سے ہنوز ناواقف چلی آ رہی تھی، پوچھ بیٹھی تھی۔

''آپ کے گھر میں بہت خوش حالی دکھائی دینے لگی ہے، کیا آپ کو کوئی وراثتی جائیداد مل گئی ہے؟''

اس پر وہ بے ساختہ ہنس دی تھیں۔ پھر انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا تھا اس نے مجھے شدید دکھ ہی نہ پہنچایا تھا بلکہ مجھے خاصے خوف میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔ ناشکرے پن اور بے قناعتی کی زندگی نے انہیں کس گناہ کی راہ دکھا دی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔

ہمارے ابا جان کی وہی بندھی ٹکی آمدنی تھی اور حالات کی وہی یکسانیت لیکن انور خالہ کے حالات بڑی تیزی سے بدلتے چلے گئے۔ وہ لوگ امیر سے امیر تر ہوتے گئے۔ ان کے گھر دولت کی ریل پیل رہنے لگی۔ بٹ صاحب کی ترقی ہو گئی۔ وہ ایس ڈی او بن گئے۔ انہوں نے اب موٹر سائیکل چھوڑ کار خرید لی اور اس کے لئے ایک ڈرائیور بھی رکھ لیا۔ اب انور خالہ ہر جگہ بڑی شان سے کار میں آنے جانے لگیں۔ ان کے ہر بیٹے کے پاس نئی موٹر سائیکل آ گئی۔ وہ اونچے درجے کے ہوٹلوں اور کلبوں میں جانے لگے۔ ان کے اونچے درجے کے لوگوں سے مراسم ہو گئے۔ انور خالہ نے اب ہمارے گھر آنا بہت کم کر دیا تھا۔ وہ زیادہ تر بازاروں کے چکر لگانے، خریداریاں کرنے یا گھر میں دعوتیں پارٹیاں کرنے میں مصروف رہنے لگی تھیں۔ ان میں مجھے بھی اکثر شرکت کا موقع ملتا تھا۔ یہ دعوتیں پارٹیاں ہوتی کیا تھیں؟ دولت و تفاخر کی بھونڈی سی نمائشیں۔ جن میں خوب مسرفانہ طور پر روپیہ پیسہ لٹایا گیا ہوتا تھا۔ اب وہ لوگ ہر سال سردیاں گزارنے کراچی جانے لگے تھے۔ سنا گیا تھا کہ وہاں بٹ صاحب نے ایک پوش علاقے میں کوٹھی خرید لی تھی جس کی حفاظت ایک چوکیدار اور مالی کے سپرد تھی۔ وہاں رہتے ہوئے یہ لوگ مہینے دو مہینے خوب سیر و تفریح کرتے گھومتے پھرتے پھر مارچ میں جب بچوں کے سکول کالج کھل جاتے تو کوٹھی چوکیدار اور مالی کے سپرد کر کے کوئٹہ واپس آ جاتے۔

پھر بٹ صاحب کی ٹرانسفر رحیم یار خان ہو گئی۔ ہم نے حسب توفیق ان لوگوں کی الوداعی دعوت کی۔ خط و کتابت کے وعدے وعید کئے۔ آئندہ ملاقات کی امید ظاہر کی۔ جدائی پر آبدیدہ ہوئے پھر وہ لوگ کوئٹہ سے رخصت ہو گئے لیکن جانے کے بعد عرصہ دراز تک ان لوگوں کی طرف سے کوئی خط نہ پہنچا نہ کسی قسم کی اطلاع موصول ہوئی۔ ملاقات کی بھی کوئی سبیل نہ بن سکی۔ یہاں تک کہ پندرہ بیس سال گزر گئے۔ والد انتقال کر گئے۔ ہم بہن بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں، ہم کوئٹہ ہی میں بس گئے۔ اپنی مصروفیات میں گم ہمیں اب ماضی کی یادیں کم ہی ستاتی تھیں۔

پھر ایک دن جب میں گھر کے کام کاج میں مصروف تھی تو چھوٹا بھائی یوسف کچھ مسرور کچھ حیرت زدہ سا اندر چلا آیا۔

''باجی! دیکھیں یہ کون آیا ہے؟'' اس نے اپنے پیچھے اشارہ کیا۔

اس دراز قد دبلے پتلے سوکھے سے چہرے والے نیم گنجے گھٹیا سے کپڑوں میں ملبوس لڑکے کو پہلے تو میں پہچان ہی نہ سکی پھر ایک دم ہی میرے منہ سے نکلا ''خاور!''

''السلام علیکم باجی!'' اس نے کچھ شرماتے ہچکچاتے مجھے سلام کیا۔

مجھے حیرتوں اور بے یقینیوں کے دھچکوں پر دھچکے لگ رہے تھے۔ ہر دم قیمتی لباسوں چھچھاتے قیمتی جوتوں میں ملبوس خوشبوؤں میں بسے قیمتی گھڑی اور سونے کی انگوٹھیاں پہنے نئی وضع سے بال ترشوائے شہزادوں جیسی شان والے خاور کی یہ خستہ حالی، انور خالہ کے اس لاڈلے پیارے بیٹے کی یہ حالت!

''خاور! تمہاری یہ حالت؟''

اس کے سوکھے ہوئے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

موقع کی نزاکت کے پیش نظر میں نے اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور اسے اندر نشست گاہ میں لے آئی۔ میرے ذہن میں بے شمار سوالات مچل رہے تھے لیکن میں نے اس سے فوری طور پر کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور اسے یوسف کے ساتھ بیٹھا چھوڑ کر خود چائے کا اہتمام کرنے کچن میں چلی آئی۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا اور شرمندہ شرمندہ سا تھا۔ وہ بمشکل ہی کچھ کھا پی سکا۔ پھر جب ناؤ نوش کا سلسلہ ختم ہوا تو میرے ذہن میں مچلتے سوالات میری زبان پر آ گئے۔

آنکھوں سے میری اس لئے لالی نہیں جاتی
یادوں سے کوئی رات جو خالی نہیں جاتی
اب عمر ہے نہ موسم نہ وہ راستے کہ وہ پلٹ آئے
اس دل کی مگر خام خیالی نہیں جاتی
مانگے اگر تو جان بھی، ہنس کر تجھے دے دیں
تیری تو کوئی بات بھی ٹالی نہیں جاتی
آئے کوئی آ کے یہ درد سنبھالے
ہم سے تو یہ جاگیر سنبھالی نہیں جاتی

''کیوں خاور! تم یہاں کوئٹہ میں کیا کر رہے ہو؟ تم لوگ تو رحیم یار خان چلے گئے تھے''۔

''ہاں باجی!'' اس نے گہری سانس لی۔ ''وہاں جانا ہمارے حق میں اچھا ثابت نہیں ہوا لیکن ابا جان کی ملازمت کا معاملہ تھا۔ وہاں ابا جان کا جو افسر اعلیٰ تھا۔ وہ بڑا سخت گیر اور ماتحتوں پر کڑی نظر رکھنے والا تھا۔ نہ خود لیتا تھا نہ کسی کو لینے دیتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابا جان کی صرف تنخواہ ہی رہ گئی۔ باقی ذرائع آمدنی سب مسدود ہو گئے۔ ہمیں امیرانہ رہن سہن کی عادت پڑ چکی تھی۔ سوکھی تنخواہ میں ہماری ضروریات کہاں پوری ہو سکتی تھیں۔ اس لئے ابا جان نے یہ کیا کہ پہلے کراچی والی کوٹھی بیچ دی۔ اس کے بعد لاہور میں خریدی ہوئی زمین بھی فروخت کر دی۔ اس وقت تک حمزہ بھائی تعلیم مکمل کر چکے تھے انہیں جلد ہی کراچی میں ملازمت مل گئی اور وہ وہاں چلے گئے۔ شبانہ، فرزانہ اور تبسم کی شادیاں ہو گئیں۔ ابا زاہد بھائی میں اور چھوٹا بھائی ساغر باقی رہ گئے تھے۔ زاہد بھائی کی سرگرمیاں بڑی پُراسرار قسم کی تھیں۔ وہ کئی کئی دن گھر سے غائب رہتے۔ جب آتے تو دن رات سوئے رہتے۔ پوچھنے پر بھی کچھ نہ بتاتے۔ پھر ایک دن وہ ہمیشہ کے لئے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

گھر سے نکل گئے۔ بڑی تلاش کے باوجود ان کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اس دوران ابا جان ریٹائرڈ ہو گئے۔ ہمارے معاشی حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ گھر کا تمام قیمتی سامان بک چکا تھا، امی کا تمام زیور بھی فروخت ہو چکا تھا۔

ابا جان کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہم اپنے آبائی شہر لاہور چلے آئے اور تاج پورہ میں کرائے کے ایک مکان میں رہنے لگے۔ وہاں ابا جان کو ایک عجیب سی بیماری لاحق ہو گئی، ان کا سر چکراتا اور وہ بے ہوش ہو کر گر جاتے۔ ان کا جب میڈیکل چیک اپ کروایا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کے سر میں رسولی ہے۔ اس بھیانک خبر نے ہمیں لرزا دیا۔ ہم نے ان کا علاج شروع کیا۔ ان کے دماغ کا آپریشن ہوا۔ یعنی کھوپڑی کی ہڈی کاٹ کر رسولی نکالی گئی لیکن ابا جان پھر بھی ٹھیک نہ ہو سکے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد انتقال کر گئے۔ بڑی اذیت اور تکلیف سے فوت ہوئے ابا جان......'' اس نے رک کر آنکھوں سے آنسو پونچھے۔

میں اور یوسف شدید دکھ اور صدمے سے گنگ تھے۔

''حمزہ اس موقع پر کہاں تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''حمزہ بھائی......'' اس نے ہچکی سی لی۔ ''کراچی میں انہیں جو ملازمت ملی تھی وہ سمگلروں کے ایک گروہ کی تھی۔ انہیں اپنا مال خلیجی ریاستوں میں لانے لے جانے کے لئے انہی جیسے پڑھے لکھے مہذب اور خوبرو نوجوان کی تلاش تھی۔ معلوم نہیں حمزہ بھائی کے ان سے کب روابط استوار ہوئے اور وہ ان کے آلۂ کار بن گئے۔ وہ اس وقت دبئی کی جیل میں ہیں، جانے انہیں وہاں سے کب رہائی نصیب ہو گی''۔

''اور ساغر، وہ کیا کرتا ہے؟''

''وہ تو باجی! نہ زندوں میں ہے نہ مُردوں میں۔ بُری صحبت میں بیٹھ بیٹھ کر اسے ہیروئن کی لت پڑ گئی۔ اس کی حالت اب بے حد بگڑ چکی ہے۔ باجی! علاج معالجہ سمجھانا بجھانا سب اس پر بے کار ثابت ہوا ہے۔ وہ اب تھوڑے ہی عرصہ کا مہمان ہے''۔

میرا دم گھٹنے لگا۔

''اور انور خالہ، تمہاری امی ان کا کیا حال ہے؟''

''انہیں چند سال ہوئے دائیں پہلو پر فالج ہوا تھا۔ ان کے جسم کا یہ حصہ بالکل بے کار ہو چکا ہے۔ وہ زیادہ تر بستر پر پڑی رہتی ہیں۔ ان کی یادداشت بھی اب کام نہیں کرتی۔ شبانہ اور اس کے بچے ان کی خبر گیری کر رہے ہیں''۔

''شبانہ کیا لاہور میں رہتی ہے، کتنے بچے ہیں اس کے، اس کے شوہر کیا کام کرتے ہیں؟''

''شبانہ کو طلاق ہو چکی ہے باجی! سات آٹھ سال ہوئے۔ وہ اپنے تین بچوں کے ساتھ امی کے پاس رہتی ہے اور گزران کے لئے ایک سکول میں نوکری کر رہی ہے''۔

مجھے شدید دھچکا سا لگا۔

''طلاق ہو گئی، یہ تو بہت بُرا ہوا، بے حد بُرا اور افسوس ناک اور فرزانہ، تبسم؟''

اس کے چہرے پر شدید رنج و ملال کی گھٹائیں چھا گئیں۔

''فرزانہ کی شادی ابا جان نے بغیر کسی چھان بین کے ایک بڑے امیر کبیر گھرانے میں کر دی تھی۔ سنا تھا کہ اس لڑکے کا ابوظہبی میں بڑا وسیع کاروبار ہے۔ شادی کے بعد وہ فرزانہ کو اپنے ساتھ ابوظہبی لے گیا۔ اس کے بعد وہ سارا خاندان ہی غائب ہو گیا۔ بڑی چھان بین اور دوڑ بھاگ کے بعد پتہ چلا کہ وہ لوگ مرد عورتیں سب دراصل انسانوں کے سمگلر تھے۔ وہ لوگوں کو شادی کے جھانسے دے کر خوبصورت لڑکیاں پھانستے اور انہیں عرب شیخوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے۔ میری معصوم فرشتہ سیرت بہن بھی جانے اس وقت کس عرب شیخ کی کنیز بنی ہوئی

ہے''۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔

میں بھی اپنے آنسو نہ روک سکی۔ فرزانہ جیسی خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی کا یہ انجام واقعی بے حد دردناک اور لرزہ خیز تھا۔

''اور تبسم؟'' میں نے کچھ ڈرتے ڈرتے استفسار کیا۔

''اللہ کا شکر ہے کہ وہ اپنے گھر میں خوش اور آرام سے ہے۔ اس کا شوہر مذہبی رجحان رکھنے والا بے حد نیک اور شریف آدمی ہے۔ ان کے چار بچے ہیں، وہ لاہور میں رہتے ہیں اور بڑی خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ دعا کیجئے باجی میری یہ بہن اپنے ماں باپ کے گناہوں کے سائے سے محفوظ رہے''۔

''آمین!'' میں نے دل کی انتہائی گہرائیوں سے کہا۔

پھر اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ وہ لاہور میں پھلوں کے ایک آڑھتی کی دکان پر ملازم تھا اور اس کے کسی کام کے سلسلے میں کوئٹہ پہنچا ہوا تھا۔ وہاں اس کی اتفاقاً یوسف سے ملاقات ہو گئی تھی۔ شوقِ شہزادگی نے اسے تعلیم پوری کرنے کا موقع نہ دیا تھا۔ اس لئے اسے کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہ مل سکی تھی۔

ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جو حرام کی کمائی سے تمام عمر بڑے مزے اور ٹھاٹ سے رہتے ہیں اور دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ ان پر آخر اللہ کی گرفت کیوں نہیں ہوتی۔ یہ نمونۂ عبرت کیوں نہیں بنتے؟ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں اللہ دنیا میں سزا دیتا اور نمونۂ عبرت بناتا ہے کہ لوگ انہیں دیکھیں، سبق لیں، اپنی اصلاح کریں۔ آخرت میں تو اللہ کی گرفت سے اور مواخذے سے کوئی نہ بچ سکے گا خواہ اسے دنیا میں سزا ملی ہو یا نہ ملی ہو۔

O

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

طب و صحت

مریض دوائی منگوانے کے لئے اپنا حوالہ نمبر ضرور لکھا کریں
رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازماً لکھیں

دستِ شفاء

لکنت اور ہکلاہٹ قابلِ علاج ہے

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
ڈی۔ ایچ۔ ایم ایس (DH.Ms)
ممبر پیرامیڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب
ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن
شعبہ طب و نفسیات

سب سے پہلے تو میں اپنے معزز قارئین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح شدت کے ساتھ وہ میرے مضامین اور کیسوں کا انتظار کرتے ہیں اور جس طرح انہوں نے پذیرائی دی وہ بہت ہی قابلِ تعریف ہے اور جو شخص بھی بطور مریض ہمارے پاس آتا ہے ہم اسے مریض سے زیادہ اپنا فیملی ممبر سمجھتے ہیں اور اسی طریقے سے برتاؤ کرتے ہیں اور یہاں آ کر سب لوگوں کو ایک اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح نہ ہی ہم دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں بلکہ اپنے ہی محدود وسائل کے اندر رہ کر حسبِ توفیق خلقِ خدا کی خدمت کرتے ہیں۔ ہم اس کام کو مزید بڑھانا چاہتے ہیں جس کے لئے ہمیں آپ کی طرف سے اخلاقی مدد اور گائیڈ لائن چاہئے۔

(1) اوّل ہمیں دوسرے شہروں کے مریضوں کی مشکلات کا اندازہ ہے اور ہر بندے کا لاہور آنا محال ہے جو اصحاب دیگر شہروں میں کسی کم خرچ، بلا کرایہ (یا کم کرائے والی جگہ) کا بتا سکیں ان کی مہربانی ہو گی۔ فی الحال اسلام آباد، راولپنڈی، گجرات، گوجرانوالہ، فیصل آباد، شیخوپورہ میں شروع کریں گے بعد میں دیگر شہر یا علاقے۔ اگر کوئی ڈاکٹر صاحبان یا حکیم صاحبان جن کا کلینک ہو، وہ بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔

(2) اگر کسی صاحب کے ذہن میں کوئی اچھا پلان ہو تو وہ بھی مجھے ''حکایت'' کے ایڈریس پر لکھ کر ارسال فرمائیں۔

(3) اگر کسی صاحب کے پاس کوئی آزمودہ کار نسخہ ہو تو وہ بھی بھیج سکتا ہے ہم (آزمائش کے بعد) اس کو اسی کے نام سے رسالے میں شائع کریں گے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ہماری قوم بے حد ذہین اور لائق ہے مگر افسوس اس کی قابلیتوں کا کوئی اعتراف نہیں کرتا۔

(4) ہم یہ چاہتے ہیں کہ قابل ڈاکٹروں و حکیموں کے آزمودہ نسخہ جات اور میرے اپنے سب کو ملا کر اکٹھا شائع کر دیں۔ جو اصحاب شرکت کرنا چاہیں وہ مجھے ان فون نمبرز 0321-7612717، 0312-6625066 پر بتا سکتے ہیں۔

(5) میں اپنے قارئین اور ملنے والوں سے ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ اگر مجھے فون کرنا ہو تو (صبح 12 بجے سے 2 بجے) یا رات (7 سے 9 تک) کر سکتے ہیں۔ مگر پہلے اپنا تعارف بتا کر بات شروع کیا کریں اور صرف ضروری باتوں کے لئے رابطہ کریں فضول اور بے کار باتوں یا MSG سے پرہیز کریں اور آنے سے ایک دن قبل ٹائم ضرور طے کر لیں۔ شکریہ!

آج اتوار ہے اور میں ایک سنڈے میگزین پڑھ رہا ہوں اس میں میڈیسن اور علاج کے بارے میں بہت سے اشتہارات ہیں جو کہ بہت ہی دلکش (Attractive) ہیں۔ اگر آپ کسی میڈیکل سٹور پر جائیں تو وہاں بھی ماسمے سے لے کر طاقت کی ادویات تک کے بہت خوش کن اشتہارات ہوتے ہیں۔ آپ کو بھی ان لوگوں سے واسطہ کبھی نہ کبھی ضرور پڑا ہوگا۔ میں ان کو 100 فیصد تو غلط نہیں کہتا ہے مگر ایک بات ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان میں 5 فیصد بھی حقیقت ہو تو پاکستان میں کوئی بندہ مریض نہ رہے اگر یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لیں مگر بعد میں مجھ سے کوئی گلا یا شکایت نہ کریں۔ اگر آپ کی دولت محنت سے کمائی ہوئی ہے تو پھر میری باتوں پر صدقِ دل سے غور کریں ورنہ پھر آپ کی مرضی ہے جو دل میں آئے کریں۔

مگر میں آپ کو اپنے دو مریضوں کا حال ضرور بتانا چاہوں گا جو کہ کسی جنسی معاملے میں میرے پاس آئے ان کا معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کے عضو مخصوص کی حالت بے حد خراب ہے اور اب علیحدہ ہوا کہ ہوا، وجہ یہ تھی کہ کسی جگہ سے کوئی تیز آئل (جو کہ عموماً بقول ان معالجوں کے رگوں کی خرابی یا گندہ پانی نکالنے کے لئے) کسی نے استعمال کرایا اور اب وہ دونوں زندگی بھر کے لئے معذور ہو گئے۔ آپ سے گذارش ہے کہ ایسی خطرناک اور واہیات اشیاء سے پرہیز کریں۔ ایک تیسرے مریض کا واقعہ بھی یقیناً باعث عبرت ہے وہ ایک 55 سالہ شخص نارووال کا تھا مجھ سے کئی امراض ہے کا علاج کروایا۔ پھر جنسی طاقت کے لالچ میں آ کر راولپنڈی کے ایک حکیم صاحب سے دوا لی! رات کو دوا کھائی مگر دن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ خدا ہی جانے کیا زہریلی چیز تھی کہ اس نے اندر جا کر آگ لگا دی اور سب اندرونی اعضاء جل گئے اور وہ صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خدا سب کو انجام بد سے بچائے۔

قارئین کرام! ان سب حالات اور واقعات بتانے کا مقصد کیا ہے صرف یہ کہ علاج کا کوئی سسٹم یا طریقہ ہوتا ہے اس کے لئے آپ کسی اچھے معالج سے رجوع کریں اور صرف دلکش اشتہارات یا غلط قسم کے لوگوں کے بہکاوے میں نہ آئیں کیونکہ زندگی اور صحت بار بار نہیں ملتی۔

چند ماہ قبل ماہنامہ ''حکایت'' میں فشکس کا ایک کیس شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد تین کیس ہمارے پاس اسی نوعیت کے آئے اور شفایاب ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کیس تو مزید بگڑ کر گنگرین میں بدل چکا تھا۔ وہ بھی رُوبہ صحت ہے اور جونہی 60 فیصد سے زیادہ ٹھیک ہو گا آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا ان شاء اللہ۔

اس ماہ جو کیس ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں وہ ڈسٹرکٹ شیخوپورہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اس ماہ چونکہ ہمارے ریکارڈ کے مطابق کوئی کیس تسلی بخش حد (کم از کم 60 سے 70 فیصد) تک ٹھیک نہیں

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہوا تھا اس لئے میں خاصا اپ سیٹ تھا کہ اپنے معزز قارئین کے لئے کیا کروں۔ اسی ادھیڑ بن میں 18 نومبر آ گیا۔ میری ایک بیٹی کی شادی شیخوپورہ میں ہوئی ہے۔ اس کا چند دن قبل فون آیا کہ میں اسے ملوں۔ 19 نومبر کو ٹائم نکال کر میں اسے ملنے گیا۔ بچوں کو بھی ملا اور تقریباً 2 گھنٹے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا۔ واپس آنے کا ٹائم ہوا تو بچی نے کہا کہ ابو جی اس ماہ میں نے ماہنامہ "حکایت" دست شفاء کے لئے ایک کیس لکھا ہے وہ آپ کو دے رہی ہوں۔ مگر آپ ID (شناخت ضرور بدل لینا کہیں قارئین یہ نہ سمجھیں کہ یہ کیس خاندانی ملی بھگت سے دے رہے ہیں۔ پہلے تو میں نے ہاں کر دی مگر جب کیس پڑھا اور باقی پہلوؤں پر غور کیا تو فیصلہ کیا کہ پہلے کی طرح ہمیں اب بھی سچ ہی لکھنا چاہئے کیونکہ جو حسن اور اثر سچائی میں ہے وہ ملاوٹی چیزوں میں نہیں۔ امید ہے کہ قارئین میری اس بات سے اتفاق کریں گے۔ اب میں یہ کیس یونہی الفاظ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

میں ایک ایم اے پاس ہاؤس وائس ہوں۔ 2 بیٹے اور ایک بیٹی۔ تمام فیملیز کی طرح میرے بچے بھی بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی مسئلے کو کا شکار رہتے ہیں جو کہ ایک قدرتی امر ہے اور اگر یہ انسانی طاقت سے باہر نہ ہو تو ہم اس کو حل بھی کر سکتے ہیں۔

"حکایت" کے بہت پرانے قارئین میں ہمارا نام بھی شامل ہے۔ "مشتبہ کے قلم سے"، "میم الف"، "صابر حسین راجپوت"، "احمد یار خان"، "ایڈیٹوریل"، "دیوانگی" اور بانی حکایت عنایت اللہ مرحوم کی تقریباً 80 فیصد تحریریں پڑھ چکی ہوں۔ "حکایت" جیسے سنجیدہ مزاج ڈائجسٹ کو ہمارے گھر میں متعارف کرانے کا سہرا میرے والد محترم ڈاکٹر رانا محمد اقبال کے سر ہے۔ ان کی لائبریری میں "حکایت" کا تقریباً ہر شمارہ موجود تھا۔ پھر تاریخ، طب، نباتات، قیافہ شناسی، دست شناسی اور ہومیو پیتھک کتب کی کافی کھیپ تھی۔ میرے پاس شادی سے پہلے تو ٹائم ہی ٹائم تھا لہٰذا ان کی تمام Cellectionb کو نہ صرف پڑھا بلکہ چاٹ لیا۔

"حکایت" میں دست شفا کے کیس بھی پڑھے مگر خود بھی جلد ہی کسی ایسے تجربے سے گزروں گی یہ معلوم نہیں تھا۔ اوائل مئی کی شام میری بیٹی اور بیٹا دونوں کھیل رہے تھے کہ میں نے ایک عجیب بات نوٹ کی۔ میرا بیٹا جو بہت پیاری پیاری باتیں کرتا تھا۔ 3 سال کا ہو گیا تھا۔ خود ہی نئے نئے فقرے بنا کر بات کو ادا کرتا تھا۔ اب وہ بار بار لفظ "L" پر اٹک رہا تھا۔ Laptop کہنا چاہتا رہا تھا مگر "L" پر اٹک رہا تھا۔ بار بار کوشش کے باوجود لفظ کہہ نہیں پاتا تھا۔

اگلے دن میرے ساتھ دکان پر چپس لینے گیا تو "Lays" کے "L" پر ہی رہ گیا اور ٹھیک ٹھاک شرمندہ ہو گیا۔ دو دن گزرے تو "N" پر بھی اٹک گیا پھر "M" کی باری آئی اور پھر تین ہفتوں کے اندر وہ اتنا ہکلاہٹ کا شکار ہوا کہ میرے خاوند نے بھی نوٹ کر لیا۔ میری ساس نے بھی ذکر کیا کہ اسے کیا ہوا۔ میں نے فوراً اس کے لئے سوچنا شروع کیا کہ کیا کروں۔ پہلے گھر میں موجود ایک مقوی اعصاب و دماغ خمیرہ ذہن میں آیا وہ میں استعمال کرتی تھی۔ (یعنی کہ میرا آزمودہ) وہ بیٹے کو بہت باقاعدگی سے دینا شروع کیا۔ ساتھ گری بادام بھگو کے کھلانا شروع کی۔ خوراک بڑھا دی۔ اسے بات بات پر اس خامی کی طرف توجہ نہیں دلائی گئی۔ اس طرح بچہ اپنا اعتماد کھو دیتا ہے۔ اپنی بیٹی کو فوراً یہ سمجھایا کہ اگر آپ کا بھائی کوئی لفظ ٹھیک نہ بولے تو آپ نے اس پر ہنسنا نہیں۔ یہی چیز اپنے دیگر افراد خانہ سے بھی کہہ ڈالی۔ میرے تمام فیملی ممبرز نے میرا بہت ساتھ دیا۔ بچے کا اعتماد گرنے نہیں دیا۔ جون کے دو ہفتے گزر گئے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اپنی کوشش جاری رکھی۔ بیٹا جب کوئی لفظ ادا نہ کر پاتا تو یا شرمندہ ہو کر چپ ہو جاتا یا جارحانہ ہو کر گھر کی کوئی چیز

سلونا توڑ دیتا۔ اسے بہت مشکل سے سنبھالتی اور ٹھنڈا کرتی۔ اپنے خاوند سے بات کی تو وہ بیٹے کو شہر کے ایک بہت ہی اچھے اور مہنگے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب بہت تجربہ کار اور سمجھدار تھے۔ FRCS کی ڈگری تھی ان کے پاس انہوں نے دوائیاں لکھ دیں میں نے میڈیسن کا پہلا کورس مکمل کروایا۔ خمیرے وغیرہ چھوڑ دیئے۔ اللہ پاک سے دعا بہت کرتی تھی کیونکہ لکنت سے شخصیت پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ دوائیاں ختم ہو گئیں مگر بیٹے کو فائدہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے نسخہ دوبارہ لکھا۔ میں بڑی پابندی سے تمام ادویات دیتی رہی ماہ رمضان گزر گیا، عید گزر گئی مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" والی صورت حال بن گئی۔

عید پر میری کزن مجھے ملی تو اس نے بھی نوٹ کیا اور مجھے ایک۔ بہت ہی اچھی ایلو پیتھک میڈیسن کا بتایا جو کہ ایک ایسے ہی ایک کیس میں 99 فیصد تک اچھا Result دے چکی تھی۔ وہ بھی بیٹے کو استعمال کروائی مگر تمام حربے بے سود رہے۔

خاوند نے ڈاکٹر بدلنے کا مشورہ دیا مگر اس سے پہلے میرا پروگرام بچوں کو ان کے ننھیال لے جانے کا بن گیا۔ بیٹی کی گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں اس لئے جلدی سے وہاں چلی گئی تاکہ سکول شروع ہونے سے پہلے واپس آ جاؤں۔ اب میں بیٹے کو کوئی بھی میڈیسن نہیں دے رہی تھی۔ صرف اللہ سے دعا اور اس وسیلہ کی تلاش کر رہی تھی جو بیٹے کو اس مسئلے سے نجات دلا دے۔

ابو کی طرف گئی تو وہاں "حکایت" اگست کا شمارہ موجود تھا۔ ابو سے پوچھا کہ کوئی نیا کیس چھپا ہے "دست شفاء" میں اور یہ کہ ان کی پریکٹس کیسی چل رہی ہے۔ باتوں باتوں میں ایک دم یاد آیا کہ یہ "چراغ تلے اندھیرا" والی بات ہوئی، ابو جان مجھے سعودی عرب والے اور UAE والے کیسوں کا بتا رہے تھے جیسے ہی وہ چپ ہوئے میں

آخری سلام

1958ء اور 1971ء کے مارشل لا کو پاکستان کے دولخت ہونے کا سبب، پاک فوج کی عوام سے دوری کا باعث اور اس کی صفوں میں کردار کے بحران کا محرک گردانتے ہوئے انہوں نے اپنے حلف کے تقاضوں کے عین مطابق ملک میں ایک اور فتنی اور عمودی انتشار کے ممکنہ آغاز جنرل ضیاء الحق کے تیسرے مارشل لا کے خلاف مسلح افواج کے اندر سے ہی مزاحمت کی عدیم المثال روایت ڈالنے کی جرأت روا رکھی۔ اس ناقابل یقین، انوکھے اور منفرد "جرم وفا" میں وہ جس دوام کے مستحق ٹھہرے۔ ادھر جمہوریت کی بحالی کے لئے ضمیر کی آواز بلند رکھنے کے جرم میں حاکم وقت جنرل ضیاء نے انہیں تین سال بنا مقدمہ سندھ کی جیلوں میں اسیر کئے رکھا۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

شروع ہو گئی۔ بیٹے کا مسئلہ اور علاج میں ناکامی سب کہہ دیا۔انہوں نے پوری توجہ سے ساری صورت حال سن کر کچھ سوال کئے اور پھر دو دن بعد مجھے میڈیسن تیار کر کے دے دی۔ میں نے فوراً میڈیسن شروع کروا دی۔اس دوران اور بعد میں کوئی اور دوائی بالکل شروع نہیں کروائی۔ 95فیصد میڈیسن ختم ہو چکی تھی مگر بیٹے صاحب کی صورت حال جوں کی توں تھی۔ اب مجھے پھر فکر ہونا شروع ہوئی سوچا جو میڈیسن رہ گئی ہے اُسے چھوڑ دوں مگر پھر سوچا کہ کیوں چھوڑ دوں؟ مجھے مکمل دوائیاں استعمال کرانی چاہئیں۔آخر پیسوں کی آئی ہے؟ میں خود کو بچوں کی طرح بہلا رہی تھی اور باقی کی میڈیسن بھی بیٹے کو دیتی رہی۔

بیٹے کے ابو شام کو آفس سے آنے والے تھے۔ان کا SMS آیا تھا کہ کھانا میرے آنے سے پہلے تیار کر دو بہت بھوک لگی ہے۔ بیٹی کے اکتوبر میں فرسٹ ٹرم کے پیپرز ہونے والے تھے اسے لکھنے کا کام دے کر جلدی سے کچن میں گھس گئی۔ گرمی ختم ہو رہی تھی، موسم بہتر ہو رہا تھا، چولہا اب بُرا نہیں لگتا تھا۔ چاول کا تڑکا تیار کیا کہ اچانک بنی کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی کہ ماما بھائی کو روکیں وہ میری کتابیں چھین رہا ہے اور لکھنے نہیں دے رہا۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ بیٹے کو روکوں کہ اس دوران وہ اپنی بہن سے سخت خفا ہو گیا کہ ماما کو شکایت کیوں لگائی وہ غصے میں زور زور سے اپنی بہن سے بولنے لگا اور اسے دھمکیاں دینے لگا کہ دادی جان کو آنے دو ان کو بتاؤں گا۔ بابا کو آنے دو ان کو بھی بتاؤں گا۔ مجھے بک دو، کاپی دو، پنسل سے لکھنے دو، کلر کرنے کے لئے شارپنر بھی لینا ہے اور ربڑ (Erasor) بھی لے کے دو"۔

میرے تیزی سے چلتے ہاتھ رک گئے میں نے کفگیر روک دیا پانی کی ٹونٹی کو بند کیا، چولہے کی آنچ کم کی، بیٹے کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ اپنی بہن کے خوب لتے لے رہا تھا اور اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ میں بہت غور سے اس کو بولتے ہوئے سنتی رہی۔

"آپ چپ کر کے کیوں کھڑی ہیں؟" بیٹی نے مجھے کہا۔ "بھائی کو منع کریں تا مجھے تنگ نہ کرے"۔

اسے میں کیا بتاتی کہ میں چپ کر کے کیوں کھڑی تھی۔ پھر باقی میڈیسن خوشی خوشی ختم کروائی۔

اکتوبر کا دوسرا ہفتہ گزر گیا مزید بہتری آئی۔ تیسرا ہفتہ گزر گیا مزید بہتری ہوتی گئی بنی کے فرسٹ ٹرم کے بعد اسے پھر وعدہ کے مطابق نانو کے گھر لے گئی۔ وہاں ابو جان کو بیٹے کی Recovery کا بتایا کہ بہت افاقہ ہے۔ انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور مجھے مبارک دی اور مزید کچھ عرصہ میڈیسن استعمال کرنے کو کہا۔ جب میں دست شفا کے کیس پڑھتی تھی تو صرف پڑھتی ہی تھی خود (Involve) نہیں ہوتی تھی۔ اب دل جمعی کے ساتھ پڑھوں گی۔ پہلے ابو کے مریضوں کو جلد صحت یاب ہونے کی دعا دیتی تھی اور ابو جان کے Cases کو کامیاب ہونے کی بھی۔ اب خود محسوس کرتی ہوں کہ کوئی مریض صحت یاب ہو جائے تو مریض اور ڈاکٹر دونوں کو کتنی خوشی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب (ابو جان) کو اللہ پاک صحت و زندگی سے نوازے اور وہ ہمیشہ وسیلہ شفا بنتے رہیں۔ آمین!

آخر میں دیگر مریضوں سے التماس ہے کہ جو احتیاطیں ان کو بتائی جائیں ان پر اچھی طرح عمل کیا کریں تا کہ جلد شفایابی ہو اور جب کوئی مریض تندرست ہو تو اس کی اطلاع ضرور دیں۔

☼

ادارہ ہذا نے بلڈ پریشر، دمہ، ہکلاہٹ، ذہنی ٹینشن اور جوڑوں کے درد کے کورس تیار کیے ہیں۔خواہشمند حضرات رابطہ کریں۔
عارف محمود۔فون:0323-4329344

انا کا قیدی

جھوٹی انا کے پجاری کا فسانۂ عبرت۔اس کی محبت اس کی انا کی بھینٹ چڑھ گئی۔

☆ ---------- ریاض عاقب کوہلر-03455883954, Email:aqibkohlar@gmail.com

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"آنٹی کہاں ہیں جی؟" وہ ہاتھ میں ڈونگا پکڑے میرے کمرے میں داخل ہو کر امی جان کا پوچھ رہی تھی۔

"محترمہ!...... نہ تو یہ امی جان کا کمرہ ہے اور نہ کچن کہ تم یہاں امی جان کو تلاش کرتی پھر رہی ہو؟"

اس نے معصومیت سے کہا۔ "آپ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا...... اس لیے چلی آئی۔ سوری معافی چاہتی ہوں۔"

"معافی مانگنے کے بہانے مت تماشا کرو...... اور اب براہ مہربانی تشریف لے جائیں۔" میں اسے ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

وہ سر جھکائے باہر نکل گئی۔ وہ ہمارے پڑوسی انکل احسن مجید کی بڑی بیٹی تھی۔ سائرہ نام تھا۔ مجھ سے محبت کی دعوے دار تھی اور کبھی اظہار کی جرأت نہیں کر پائی تھی۔ مجھے بھی پسند تھی مگر جانے کیوں مجھے اسے ستانے میں مزہ آتا تھا۔ اس کے ہر کام میں کیڑے نکالنا، اس کو ہر وقت طنز و تشنیع کا نشانہ بنانا، اس کی کسی بات کو بھی درخور اعتناء نہ سمجھنا میری عادت ثانیہ تھی۔ اور وہ بھی عجیب مٹی کی بنی تھی کہ میری ہر خواہش، ہر تمنا، ہر بات پر عمل پیرا ہونا شاید اس کا مذہب تھا۔

☆..........☆

"جمیلہ!...... یہ کیا واہیات کلر پہنا ہوا ہے؟" میں نے چھوٹی بہن جمیلہ کے گلابی لباس پر طنز کیا۔ "عورتوں کو صرف کالا لباس جچتا ہے سمجھیں؟"

جمیلہ کہاں چپ رہنے والی تھی جھٹ بولی۔ "بھیا یہ رعب اپنی ہونے والی جورو پر جھاڑنا۔ میرا جو جی چاہے گا پہنوں گی۔"

وہ جمیلہ کی گہری سہیلی تھی اور اس وقت بھی اسے ملنے آئی ہوئی تھی۔ زرد رنگ کے لباس میں سرسوں کے پھول کی مانند کھلی ہوئی، سورج مکھی کے پھول کی جڑواں بہن لگ رہی تھی۔ میری بات پر تبصرہ کیے بغیر خاموش بیٹھی رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہو۔ شام کو جب دوبارہ جمیلہ سے ملنے آئی تو کالے لباس میں تھی اور اس کے بعد میں نے اسے ہمیشہ کالے لباس میں ہی دیکھا۔

"امی جان! کبھی کسٹرڈ بھی بنے گا اس گھر میں؟" کھانے کے بعد میں نے حسب عادت واویلا کیا۔

"اے لڑکے باؤلا ہوا ہے کیا...... رات میٹھے میں کسٹرڈ ہی تو بنا تھا؟ اتنی جلدی بھول گیا۔" امی جان نے سخت برا مناتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ نہیں جانتی تھیں کہ میں یہ کسے سنا رہا ہوں۔ سائرہ، جمیلہ کے پاس اس کمرے میں موجود تھی اور ناممکن تھا کہ اس نے میری باتوں پر کان نہ لگائے ہوں۔

"دن کو بھی بن جاتا تو کیا ہم غریب ہو جاتے" میری تکرار جاری رہی۔

"یہ کبھی نہیں سدھرے گا؟" امی جان بڑبڑاتے ہوئے کچن میں گھس گئی۔

م کو کسٹرڈ کا ڈونگا امی جان کے حوالے کر ہوئے وہ کہہ رہی تھی......

"آنٹی! آج امی جان نے کسٹرڈ بنایا اور کہا بہن کو بھی دے آؤ۔"

"شکریہ بیٹی! ادھر فریج میں رکھ دو، میں خود بتا گی تھی ثاقب مدہوتی . کبھی بنانا یاد رہتا کبھی بھول جاتا ہے۔ اور جس دن بھول جائے آسمان اٹھا لیتا ہے۔"

ڈونگا فریج میں رکھ کر وہ جمیلہ کے کمرے میں گئی اور اس کے بعد ہر دوسرے دن انکل احسن کے کسٹرڈ بننے لگا جس میں سے ایک ڈونگا ہمارے گھر لازماً آتا۔ دونوں گھروں تعلقات اتنے اچھے اس بات کو امی جان یا ہمارے گھر کے کسی دوسرے فر

اہمیت نہیں دی تھی۔

☆..........☆

"زہر لگتی ہے مجھے عورتوں کے ہاتھ پر مہندی۔" جمیلہ کو اپنی بھانجی اقصیٰ کے ہاتھوں پر مہندی کے ڈیزائن بناتے دیکھ کر میں تبصرہ کرنے سے باز نہ آسکا۔

اقصیٰ نے معصومیت سے پوچھا۔ "کیوں ماموں؟ ابو جان تو کہتے ہیں عورتوں کے ہاتھوں پر مہندی اچھی لگتی ہے۔"

"بس مجھے اچھی نہیں لگتی گڑیا۔" یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی جمیلہ سے مہندی لگوانے کے لیے آئی تھی کیونکہ جمیلہ کو اس کام میں کافی مہارت حاصل تھی۔ میں جب دوبارہ لباس بدل کر باہر نکلا تو وہ بغیر مہندی لگوائے واپس جا رہی تھی۔

"سائرہ......! تم کہاں چل دیں؟" جمیلہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "مہندی نہیں لگوانی؟"

"باجی! کل لگوا لوں گی ابھی مجھے ایک کام یاد آ گیا ہے۔" کہتے ہوئے وہ ہمارے گھر سے نکل گئی اور پھر وہ کل کبھی نہ آسکی۔ وہ یونہی کرتی، ہمیشہ میرے منہ سے نکلے الفاظ اس کے لیے حرف آخر ہوتے تھے۔ اور میں نے کبھی بھی براہ راست اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ بس کسی بھی تیسرے بندے کی عادت، لباس وغیرہ کو ٹوک دیتا اور وہ جھٹ اس پر عمل پیرا ہو جاتی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا وہ میری پسند کے سانچے میں ڈھلتی گئی۔ میں نے لپ اسٹک پر ناک بھوں چڑھائی اس کے گلاب کی پنکھڑیوں سے ہونٹ سرخی سے محروم ہو گئے۔ سرمے کو پسندیدہ کہا، اس کی بھوری آنکھیں سرمے کی آماجگاہ بن گئیں۔ کانچ کی چوڑیوں کو اچھا کہا گندمی رنگت کی ریشمی کلائیاں کانچ کی ہتھکڑیوں سے سج گئیں۔ میں نے کہا......

"جمیلہ!...... کبھی پراندہ بھی باندھ لیا کرو۔" اور سائرہ کے کالے بال پراندے کی گرفت میں آ گئے۔ اس سب کے باوجود اس نے کبھی اقرار محبت نہیں کیا تھا۔ کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے تم اچھے لگتے ہو۔ کبھی محبت بھرا خط نہیں لکھا تھا۔ اور میں منتظر تھا کہ وہ اظہار کرے۔ کہے......

"ثاقب! آئی لو یو۔ میں تم بن نہیں رہ سکتی۔ مجھے اپنا لو۔ اپنے ابو کو ہمارے گھر بھیج دو نا؟ پلیز میرے اچھے ثاقب۔" مگر میرا یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ میں اپنی انا کے خول میں سمٹ گیا۔ اس سے بے اعتنائی برتنے لگا، وہ گھر آتی، میں باہر نکل جاتا۔ وہ کسی سوال پوچھنے کے بہانے میرے قریب آتی اور میں......

"میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔" کہہ کر اسے دھتکار دیتا۔

ابو جان ہر ماہ کے آخر میں پوری فیملی کو پکنک کے لیے لے جاتے۔ ایک دن اس نے بھی ہمارے ساتھ جانے کے لیے گھر سے اجازت مانگی جو آسانی سے مل گئی، مگر اس دن میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے گھر رک گیا۔ میں اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے کتنی قابل نفرت ہے۔ اور یہی وہ طریقہ تھا جس سے وہ میرے قدموں میں جھک جاتی۔ محبت کی بھیک مانگتی، میری انا کو تسکین ملتی اور اس کے بعد میں اسے اپنانے میں دیر نہ لگاتا۔ آخر مجھے بھی تو وہ بہت عزیز تھی۔ مگر اپنی ساری چاہت، بے پایاں محبت کے باوجود وہ میری یہ شرط پوری کرنے میں ناکام رہی۔ اس کی ہر ادا، ہر حرکت، ہر اشارہ چیخ چیخ کر مجھے یقین دلاتا......

"ثاقب میں تیری ہوں، کیا تجھے میری آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھنی نہیں آتی؟ کیا تجھے میری حرکات و سکنات سے پتا نہیں چلتا؟ ضروری تو نہیں کہ میں چاہت کے اظہار کے لیے الفاظ کا سہارا لوں۔ تم کیوں نہیں سمجھتے شرم و حیا عورت کا دوسرا نام ہے۔ محبت ہونے کے باوجود عورت اظہار کی قدرت سے محروم ہوتی ہے۔ میں کیسے کہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے؟ کیا میرا ہر عمل میرے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

احساسات کا ترجمان نہیں ہے؟ ثاقب! تم مرد ہو اظہار کی جرأت سے لبریز، تجھے کوئی شرم مانع نہیں ہے۔ پلیز مجھے ٹوٹنے سے بچالو۔ صرف ایک بار پہل کرلو، میں اپنا پندار، اپنی انا اور خود کو تیرے قدموں میں نچھاور کر دوں گی، کسی آزمائش سے نہیں گھبراؤں گی۔ ہر امتحان میں سرخ رو ہو کر دکھاؤں گی۔"

مگر میں پتھر بن گیا۔ میری انا کا خول دن بدن مضبوط ہوتا گیا۔ میں جھکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر وہ چاہت کی دعوے دار تھی تو اسے اظہار کرنا چاہیے تھا۔ حالانکہ سوچا جائے تو اسے جھکنا نہیں کہتے، اگر وہ چاہت کی دعوے دار تھی تو یہ جرم تو مجھ سے بھی سرزد ہوا تھا۔ اور پھر ایک دن میری انا نے عجیب رنگ دکھایا۔ اس دن ابو جان نے شادی کے موضوع پر مجھ سے مشورہ کیا تھا۔

"ثاقب بیٹے! احسن صاحب، بہت اچھے، عمدہ اور زبردست شخصیت کے مالک ہیں۔ اور ان کی بیٹی سائرہ مجھے جمیلہ کی طرح ہی عزیز ہے۔"

"تو...... ابو جان؟" میں جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

"تو یہ کہ وہ اس قابل ہے کہ اسے بہو بنا کر میں فخر کرسکوں۔" ابو جان نے واضح الفاظ میں عندیہ دیا۔

"ابو جان!...... آپ جانتے ہیں میری تعلیم ادھوری ہے۔ میں جب تک اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا یہ مناسب نہیں ہوگا۔"

"صرف منگنی سے شاید تمہارے تعلیمی کیریئر پر کوئی فرق نہ پڑے؟"

"یقیناً آپ صحیح کہہ رہے ہیں، مگر میں اس قسم کی کوئی ایکٹیویٹی افورڈ نہیں کرسکتا۔"

ابو جان نے دبے لفظوں میں مجھے تنبیہ کی۔ "بیٹا! دیر کرنے سے ایک اچھا رشتا ہمارے ہاتھ سے جا سکتا ہے۔ احسن بھائی ایک دو مرتبہ باتوں باتوں میں اشارہ کر چکے ہیں۔ بیٹی کے باپ ہیں واضح طور پر تو نہیں کہہ سکتے نا؟"

"وہ واضح الفاظ میں کہے گا۔ اور خود چل کر آئے گا۔ اپنی لاڈلی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو یقیناً اسے گوارا نہیں ہوں گے؟" میں دماغ میں ابھری سوچ کو الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکا اور بات بناتے ہوئے بولا۔

"پاپا!...... ہمیں رشتوں کی کمی تو نہیں ہے؟"

"او کے بیٹا!...... جیسے تمہاری مرضی۔" بجھے دل سے کہہ کر ابو جان وہاں سے اٹھ گئے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ سائرہ کے شکست تسلیم کرنے سے پہلے، رشتے کی بات کرنا میری خودداری کے لیے تازیانہ تھا۔ میں ہار تسلیم نہیں کرسکتا تھا۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹی تھی، گویا میرے ہاتھوں ہی میں پلی بڑھی تھی اور خود سے چھوٹی لڑکی سے دب جانا مجھے کیسے گوارا ہوسکتا تھا۔

ابو جان کے بعد امی جان نے بھی اس موضوع پر مجھ سے بات کی مگر میں انھیں بھی ٹال گیا۔ جب امی جان مجھ سے رائے لے رہی تھیں اس وقت جمیلہ بھی وہاں موجود تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ ساری بات سائرہ کو بتا دے گی اس وجہ سے میں نے کچھ زیادہ ہی سخت الفاظ میں امی جان کو منگنی سے منع کر دیا۔

دوسرے دن میرے انکار کا اثر اس کے چہرے پہ ثبت تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہزاروں شکوے کروٹیں لے رہے تھے۔ چہرہ حسرت و یاس کی تصویر بنا ہوا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ٹوٹ چکی ہے۔ اور اب جلد ہی اپنی شکست کا باضابطہ اعلان کرنے کے لیے اسے میرے پاس آنا ہے۔ اور میرا اندازہ درست نکلا۔

وہ اتوار کا دن تھا امتحانات سے فارغ ہو کر میں کچھ پُرسکون سا تھا۔ اس لیے دن چڑھے تک سوتا رہا۔ ناشتا بھی نیند کی نذر ہوگیا تھا۔ اٹھ کر میں نے شاور لیا اور گرما گرم چائے سے لطف اندوز ہونے لگا جو جمیلہ وہاں رکھ گئی

تھی۔ اسے اتوار کے دن میرا دیر تک سونا بہت برا لگتا تھا۔ مگر چھوٹی ہونے کے ناطے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹا کر سائرہ نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ اب وہ مجھ سے پوچھ ہی کر کمرے میں داخل ہوتی تھی۔

"جی آجائیں۔" میں بے نیازی سے بولا۔

"السلام علیکم!......" کمرے میں داخل ہو کر اس نے سلام کیا اور خاموشی سے کھڑے ہو کر ہاتھ مروڑنے لگی۔

"وعلیکم سلام!" سلام کا جواب دے کر میں اپنے لیے تھرماس سے چائے کا دوسرا کپ بھرنے لگا۔

چند لمحے بعد بھی وہ کچھ نہ بولی تو میں نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"جی فرمائیں؟" حالانکہ اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر اپنی شکست کا اعلان کر رہی تھیں۔ وہ ہار چکی تھی۔ اس کے اعصاب میرے پے در پے حملوں کی تاب نہیں لا سکے تھے۔ اس کی ریزہ ریزہ انا مجھے اپنے قدموں میں بکھری نظر آئی۔

"وہ جی!...... آنٹی گھر میں نہیں تھیں ...... اور...... اور میں نے جمیلہ باجی کو ساتھ لے جانا ہے۔ سوچا آپ سے اجازت لے لوں۔"

میں جانتا تھا وہ صریحاً جھوٹ بول رہی ہے۔ امی گھر میں موجود تھیں۔ وہ اظہار محبت کے لیے آئی تھی مگر اظہار کی جرأت نہیں کر پائی تھی۔ میں نے اس کا جھوٹ ظاہر کرنا ضروری نہ سمجھا اور بولا۔

"تو لے جاؤ جمیلہ کو...... اس سے پہلے وہ تمہارے گھر کب اجازت مانگ کر جاتی ہے؟"

"شاید وہ شام تک نہ آسکے۔" اس کے لہجے میں دکھ کی جھلک تھی۔

"ٹھیک ہے بتا دوں گا امی جان کو۔" میں نے بے پروائی سے کندھے اچکے۔ پھر اسے وہیں کھڑے دیکھ کر

طاہرہ

قیمت: 120 روپے

یہ ناول بیٹی کے جہیز میں شامل ہونا چاہئے۔

خاکی وردی لال لہو

دو حصے قیمت: 270 روپے

اس کہانی میں آپ پاکستان کی سیاست اور معاشرت کے ڈھکے چھپے گوشوں کو بے نقاب ہوتا دیکھیں گے۔

اب بڑے سائز میں خوبصورت رنگین ٹائٹل کے ساتھ گتے کی مضبوط جلد میں پیش کی جا رہی ہیں۔

بی آر بی بہتی رہے گی

محترم عنایت اللہ کی جنگی وقائع نگاری کا شاہکار۔ ایک بہادر جرأت مند اور وطن پرست قوم کا افسانہ جو افسانہ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔

ایجنٹ حضرات اور قارئین کتاب منگوانے کے لئے خط لکھیں آدھا ڈاک خرچ ہم دیں گے

مکتبہ داستان

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پوچھا۔ ’’اور کچھ؟‘‘

’’وہ اصل میں آج ہمارے گھر کچھ مہمان آرہے ہیں نا؟‘‘ وہ جانے پر آمادہ نظر نہ آئی۔ میں جانتا تھا وہ آج اپنی انا اور خودداری ہار کر ہی اس کمرے سے نکلے گی۔

’’پہلے کبھی نہیں آئے آپ کے ہاں مہمان؟‘‘

’’اس قسم کے تو نہیں آئے۔‘‘ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

’’کیوں؟...... ان کے سینگ ہیں کیا؟‘‘ میں نے استہزائی انداز میں پوچھا۔

’’میرے چاچا ہیں جی...... گاؤں میں رہتے ہیں۔‘‘

’’مجھے تمہارے چچا۔ سے کیا لینا؟‘‘ میں نے منہ بنایا۔

’’ان کا بڑا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ اس کے رشتے کے لیے آرہے ہیں۔‘‘ میرے لہجے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

میرے جی میں آیا ایک زوردار قہقہہ لگاؤں۔ وہ اپنے چچا کے کندھے پر بندوق رکھ کر فائر کرنا چاہ رہی تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ میں اس کی ساری چالبازیوں سے واقف ہوں۔ میرے جذبات کو جاننا اس کے بس سے باہر تھا۔

’’اچھی بات ہے نا؟...... ایک ڈاکٹر کا رشتہ قسمت والی لڑکیوں کو ملتا ہے۔‘‘ اس کا دل توڑنے میں میں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔

اچانک اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔ مجھے لگا وہ جھپٹ کر میرا گریبان پکڑے گی اور چیخ چیخ کر پوچھے گی......

’’ظالم اور کس طرح اظہار کروں...... کتنا نیچے گرانا چاہتے ہو؟‘‘ مگر میں بے حس بن کر اس کی بھوری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس کا غصہ بتدریج غم میں ڈھلا اور آنکھوں کے کٹورے چھلکنے کو بے تاب ہو گئے۔ ایک کرب آمیز سسکی لے کر وہ مڑی اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

مجھے احساس ہوا کہ کچھ غلط ہو گیا ہے، میرے لب اسے روکنے کے لیے ہلے۔ تاکہ اس سے تفصیل پوچھوں آیا وہ سچ کہہ رہی تھی یا جھوٹ۔ بس بہت ہو گیا تھا۔ وہ عورت ذات ہو کر اس حد تک آ سکتی تھی تو مجھے ایک قدم بڑھ کر اسے تھام لینا چاہیے تھا۔ مگر افسوس اس وقت میری آواز نے ساتھ نہ دیا۔ لب ہلے مگر بے آواز۔ میری انا اب تک زندہ تھی۔ میری مغرور سوچ نے کہا......

’’یہ اظہار نہیں تنبیہ ہے، دھمکی ہے، کہ اگر میں نے اظہار نہ کیا، اپنے والدین کو نہ بھیجا تو وہ کسی اور سے شادی کر لے گی۔ اگر مجھے اس کی ضرورت نہیں تو اسے بھی میری ضرورت نہیں۔ بھاڑ میں جاؤں میں، اس کے لیے ڈاکٹر کا رشتہ بھی آ سکتا ہے۔‘‘

ان تلخ سوچوں نے میرے ہونٹ سی دیے۔ اور اس سے پہلے کہ میں اس بارے مزید مغز کھپائی کرتا موبائل فون کی ٹون نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ میرے دوست مظہر اقبال کی کال تھی۔

’’جی مظہر؟‘‘ میں نے کال ریسیو کی۔

’’ثاقب کے بچے!...... یاد نہیں ہے آج حسن ابدال جانا ہے۔‘‘ وہ سخت غصے میں تھا۔

’’اوہ...... سوری۔‘‘ مجھے ایک دم اپنے دوست قیوم کی شادی یاد آ گئی۔ وہ ہمارا ہم عمر اور کلاس فیلو تھا۔ ساتویں کلاس تک وہ ہمارے گاؤں میں ہی پلا بڑھا تھا۔ مگر اس کے بعد وہ فیملی سمیت حسن ابدال شفٹ ہو گئے تھے۔ لیکن یہ معمولی فاصلے ہماری دوستی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے تھے۔ ہمارا رابطہ پہلے دن کی طرح قائم تھا۔ موبائل فون نے یوں بھی فاصلوں کو سمیٹ لیا ہے۔

’’سوری کے بچے!...... جلدی آؤ میں لاری اڈے پر تیرا منتظر ہوں۔‘‘

میں نے جلدی جلدی بیگ میں دو تین جوڑے کپڑے اور ایک دو ضرورت کی چیزیں رکھیں اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہمیں وہاں دو تین دن لگ جانے تھے۔ ابو جان سے میں پہلے ہی اجازت لے چکا تھا۔ امی جان کو مطلع کر کے میں گھر سے نکل آیا۔ مظہر بے چینی سے میرا منتظر تھا۔

حسن ابدال ویگن اڈے پر قیوم ہمیں ریسیو کرنے پہنچا ہوا تھا۔ اگلا پورا ہفتہ شادی کے ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ شادی کی تقریبات میں سب سے منفرد منظر مجھے دلہن کی رخصتی کا لگا۔ والدین کے گھر سے رخصت ہوتے وقت ماں باپ اور بہن بھائیوں کے گلے لگ کر رونا خوشی اور دکھ کا عجیب امتزاج تھا۔ میرے ذہن میں سائرہ کا خیال در آیا۔

’’شاید وہ بھی میری دلہن بنتے وقت یونہی آنسو بہائے۔‘‘ یہ سوچ میرے لبوں پر مسکراہٹ لے آئی۔ اس کے ساتھ مجھے اس سے آخری ملاقات یاد آ گئی۔

’’ان کا بڑا بیٹا ڈاکٹر ہے۔‘‘ میری یادداشت نے اس کے الفاظ دہرائے۔

’’ڈاکٹرنی صاحبہ!...... ہاں یہی خطاب ٹھیک رہے گا شادی کے بعد...... ناک میں دم نہ کر دیا ڈاکٹر کا نام لے کر تو میرا نام بھی ثاقب نہیں۔‘‘ اور پھر اسی دم میں نے فیصلہ کر لیا کہ جاتے ہی اسے اپنا آپ سونپ دوں گا۔ ساری شکایتوں کا مداوا کر دوں گا۔ پکنک اور آؤٹنگ پر بھی لے جاؤں گا۔ اس سے زیادہ ایک حیا والی کو آزمانا مناسب نہیں تھا۔ اور یقیناً ابو جان اور امی جان نے بھی میرے اس فیصلے کو سراہنا تھا۔

ہم شام ڈھلے ہی گاؤں واپس پہنچ سکے تھے۔ مظہر کو الوداع کہہ کر میں اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ دروازہ عشاء کی نماز کے بعد ہی کنڈی کیا جاتا تھا اس لیے مجھے دستک دینے کی ضرورت نہ پڑی۔ گھر میں داخل ہوتے وقت مجھے عجیب سا احساس ہوا جیسے کوئی بھی موجود نہ ہو۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے امی جان کو آواز دی۔

’’امی جان!...... میں آ گیا ہوں۔‘‘ عجیب رشتہ ہے ماں کا بھی، اولاد جتنی بھی بڑی ہو جائے ماں کی شفقت کی محتاج رہتی ہے۔ مگر میری پکار کے جواب میں ابو جان کمرے سے نکلے۔

’’ٹھیک ہے بیٹا!...... تمہاری امی اور جمیلہ احسن صاحب کے گھر گئی ہوئی ہیں۔‘‘

’’اس وقت؟‘‘ مجھے حیرانی ہوئی۔ مگر ابو جان میرے سوال سے پہلے اپنے کمرے میں غائب ہو چکے تھے۔ میں سر جھٹکتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

عشاء کی اذان کے بعد امی جان اور جمیلہ بھی واپس آ گئیں۔ اس وقت میں ڈرائنگ روم میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا۔ انھیں گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر میں طنز سے باز نہ رہ سکا۔

’’بڑے سیر سپاٹے ہو رہے ہیں؟‘‘

’’خود دوست کی شادی کے لیے حسن ابدال ہفتہ گزار آیا ہے اور ہمیں پاس پڑوس میں جا کر سہیلی کی شادی میں شمولیت پر طعنے دیئے جا رہے ہیں۔‘‘ جمیلہ حسب عادت چپ نہیں رہی تھی۔ البتہ امی جان نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

’’کون سی سہیلی؟‘‘ میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔

’’جناب!...... میری ایک ہی سہیلی ہے۔ سائرہ احسن مجید۔‘‘

’’کیا......؟‘‘ مجھے لگا میری سانس رک رہی ہے۔ دل اتنی شدت سے دھڑکا کہ سینے سے باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میرے چہرے پر وحشت بھرے آثار نمودار ہوئے۔ امی جان کمرے میں جا چکی تھیں اور جمیلہ ٹی وی سکرین کی جانب متوجہ تھی اس لیے میرے تاثرات سے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بے خبر رہی۔ البتہ میرے "کیا؟" پر اسے حیرانی ضرور ہوئی تھی۔

"آپ کو پتا نہیں ہے؟" پھر اچانک اسے یاد آیا کہ میں تو ہفتہ بھر سے غائب ہوں۔ "ہاں آپ تو شاید اس دن دوست کی شادی میں چلے گئے تھے نا؟...... بس جس دن آپ گئے اسی دن اس کے کزن کا رشتا آ گیا۔ بڑی پس و پیش کے بعد انکل نے ہاں کی کیونکہ اس کا بھائی "جھٹ منگنی پٹ دیاہ" پر زور دے رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے ایم بی بی ایس حال ہی میں مکمل کیا ہے۔ آئی سپیشلسٹ ہے۔ اور اسی ہفتے اس نے لندن کے لیے روانہ ہونا ہے۔ اور وہاں کی ثقافت ایسی نہیں کہ کوئی شریف لڑکا بھی وہاں پارسا رہ سکے۔ بجائے اس کے کہ اس کا بیٹا وہاں سے کوئی بدیسی دلہن ساتھ لے آتا، باپ نے دیسی دلہن کا انتظام کر دیا۔ یقین کرو بڑی نصیبوں والی ہے میری سہیلی۔ حالانکہ بڑی جھجک کی تھی انکل احسن نے۔ ویسے ان کی ہچکچاہٹ کی اصل وجہ تو تم تھے کیونکہ وہ غریب اب تک اس آس میں تھے کہ ہم سائرہ کا رشتہ مانگ لیں گے۔ اور گھر کی بات گھر میں رہے گی۔ مگر جب ابو جان نے بھی اتنے عمدہ رشتے کی طرف داری کی تو انھیں مجبوراً ماننا پڑا۔ گو چچا باپ جیسا ہی ہوتا ہے مگر اپنے گھر سے تو دور ہو جائے گی نا سائرہ ......" جمیلہ اور بھی بہت کچھ بتاتی رہی مگر میرے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ اگر وہ ٹی وی سکرین کی جانب متوجہ نہ ہوتی تو میرا وحشت زدہ چہرہ دیکھ کر ضرور ششدر رہ جاتی۔

میں اسے بولتا چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ حیرانی کا اظہار کیے بغیر ٹی وی کی طرف متوجہ رہی۔ اس کے خیال کے مطابق میں اس کی سہیلی کو ناپسند کرتا تھا۔ کمرے میں گھستے ہی ضبط کا لاوہ پھوٹ پڑا اور گرم سیال میرا چہرہ بھگونے لگا۔ میری ضد اور ہٹ دھرمی نے یہ دن دکھایا تھا۔

"سائرہ!......" میں نے سسکی بھری۔

تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ سے یوں چھوٹ جائے گا
اگر ہم کو خبر ہوتی اسے زنجیر کر لیتے

میرے آنسو بہتے رہے مگر رونے سے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہو سکا۔ میں نے اٹھ کر الماری کھولی اس کے ایک خانے میں ان تحائف کا ڈھیر لگا تھا جو میں اس کی ہر سالگرہ پر خرید کر الماری کی زینت بنا دیتا۔ میرا ارادہ تھا کہ جس دن وہ اظہار محبت کرے گی یہ تمام اٹھا کر اس کے حوالے کروں گا۔ گو وہ میرے ان عزائم سے بے خبر تھی اور اس کے نزدیک میں نے کبھی بھی اسے تحفہ دینا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود میری ہر سالگرہ پر وہ بڑے پیار سے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتی۔ اس کے تمام تحفے میں نے سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کی دی ہوئی گھڑی ہمیشہ میری کلائی کی زینت بنی رہتی مگر گھر کے اندر میں اسے آستین میں چھپائے رکھتا کہ وہ دیکھ نہ لے۔ اس کا دیا ہوا قیمتی فاؤنٹین پین میں صرف ڈائری لکھنے کے لیے استعمال کرتا۔ اس نے رومانی ناولوں کا سیٹ بھی مجھے گفٹ کیا تھا۔ ہر ناول میں دو تین بار پڑھ چکا تھا۔ اس کا موبائل میں نے سنبھال کر رکھا تھا کہ اسے پہلی کال اس موبائل فون سے کروں گا۔ میں نے اس کا دیا ہوا کریم کلر کا سوٹ سلوا لیا تھا۔ یہ میں نے پہلی ملاقات کے لیے رکھا ہوا تھا۔

میرے سارے خواب، سارے ارادے، سارے عزائم انا کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ اس نے کئی بار ڈھکے چھپے اور واضح انداز میں مجھے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا تھا مگر ناکام رہی تھی۔ میں نے کچھ زیادہ ہی انتظار کرایا تھا اسے۔

جمیلہ کھانے کا پوچھنے آئی میں نے بہانہ کر دیا۔

"دل نہیں چاہ رہا...... لیٹ کھایا تھا۔" وہ خاموشی سے واپس مڑ گئی۔

ساری رات میں نے انگاروں پر لوٹتے گزاری۔ کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ اگلے دن اس کی برات

کوئی مرض لاعلاج نہیں (القرآن)

سوائے موت کے

ماہنامہ "حکایت" کے شعبہ "دست شفاء" کے مستند و ماہر ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ) کی جدید تحقیقات اور ماہرانہ خدمات سے مستفید ہوں اور پرانے، ضدی اور لاعلاج امراض، خصوصاً درج ذیل امراض کے تیز ترین اور بے ضرر علاج کے لئے رجوع فرمائیں:

- پولیو
- الرجی
- ذہنی معذور بچے
- یادداشت کی خرابیاں
- ہاتھوں کی جلد کی خرابیاں
- ہائی بلڈ پریشر
- ناک و گلے کے غدود کا بڑھ جانا
- اعضاء کی بے حسی یا کنٹرول نہ ہونا
- پھیپھڑوں کے امراض
- احساسِ کمتری، جھجک
- مردانہ، زنانہ امراض
- اعضاء کا پیدائشی (یا بعد میں) ٹیڑھا پن

رابطہ کے لئے

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ) 0321-7612717 0312-6625086

عارف محمود 0323-4329344

بالمشافہ ملاقات کے لئے پہلے وقت لیں۔

دست شفاء حکایت 26 پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نے آنا تھا میں کمرے سے باہر نہ نکلا۔ پھر میری سماعتوں میں شہنائی کی آواز گونجی۔ شاید برات پہنچ گئی تھی۔

''بھیا!...... کسی انسان سے اتنی نفرت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ اب تو وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر، اس محلے سے جانے والی ہے۔ جاتے جاتے تو اسے مل لو۔ کیا سوچے گی وہ۔ پھر انکل احسن مجید کو کتنا دکھ ہوگا۔ دونوں گھروں کے اتنے قریبی تعلقات ہیں اور آپ دو قدم بھی چل کر نہیں جا سکتے۔'' جمیلہ نے اپنی رو میں کہتے ہوئے میرے اوپر سے کمبل کھینچ لیا۔ مگر میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی گھبرا گئی۔ میری آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔

''بھیا کیا ہوا؟...... خیر تو ہے؟'' اس نے میرا جلتا ماتھا چھوا۔ ''اف!...... آپ کو تو بہت تیز بخار ہے، پلیز لیٹے رہیے۔''

''نہیں میں جاؤں گا۔'' میں ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ اپنی زندگی جہنم بنانے والا میں خود تھا۔ اب چوروں کی طرح منہ چھپانے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

''بھیا!...... اتنا بھی ضروری نہیں ہے، پہلے آپ کی اپنی صحت ہے۔'' جمیلہ مجھے روکنے پر مصر ہوئی۔

''کہا جو ہے؟...... جاؤں گا۔'' میں دھاڑا۔ اور وہ کان دبائے باہر نکل گئی۔ میں چپل پہن کر باہر نکل آیا۔ وہ کپڑے جو میں نے اسے خوش آمدید کہنے کے لیے سنبھال رکھے تھے اسے الوداع کہنے کے لیے پہننے پڑ گئے تھے۔

انکل احسن کے گھر کے دروازے پر ایک سجی سجائی کار کھڑی تھی۔ میں ان کے گھر میں داخل ہو کر تھوڑا سا آگے بڑھا تھا کہ اسی وقت اسے کمرے سے باہر لایا گیا۔ سرخ جوڑے میں وہ کوئی اپسرا دکھائی دے رہی تھی۔ جس دن میں نے کالے لباس کو پسندیدہ قرار دیا تھا اس کے بعد پہلا موقع تھا کہ وہ کسی اور لباس میں نظر آئی تھی۔ روایتی دلہنوں کے برعکس اس نے گھونگھٹ اٹھایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بالکل نارمل دکھائی دے رہے تھے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر سے رخصت ہو رہی ہے۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔ مجھے لگا میں گر پڑوں گا۔ اس کا ہر بڑھتا قدم گویا میرے بدن سے روح نکال کر لے جا رہا تھا۔ اور پھر مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ اشکوں کا سیلاب پلکوں کا پشتہ توڑ کر بہہ نکلا۔ اس کی نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔ وہ ٹھٹک کر رکی۔ اس کی آنکھوں میں پہلے حیرانی اور پھر کرب بھرے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس کے ساتھ اچانک اس کے حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور وہ اپنی آنسو بہاتی والدہ سے لپٹ گئی۔ شاید میری آنکھوں سے بہتا پانی مجھے رسوا کر دیتا مگر اس کی لرزہ خیز چیخ و پکار نے سب کو اس کی طرف متوجہ کر دیا اور میرے آنسوؤں کی لاج رہ گئی۔ اس پر پہلی بار میری خاموش محبت کا راز افشا ہوا تھا۔ یہ راز اس کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا۔ وہاں سے کار تک وہ جس طرح بلکتے، مچلتے اور تڑپتے ہوئے پہنچی وہ ہر آنکھ کو اشک بار کر گیا۔ کار کے اندر بیٹھنے سے پہلے اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا اور میں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ انا اور خودداری کا دعوے دار محبت کی دیوی سے معافی کا خواستگار تھا۔ جب تک وہ میری جانب دیکھتی رہی میرے ہاتھ بندھے رہے۔ وقت جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ پہلی بار اس کے سامنے میری ریسٹ واچ آستین سے باہر نکلی تھی۔ گاڑی کے روانہ ہوتے ہی کسی نے میرے بندھے ہاتھوں کو جدا کیا۔ میں نے چونک کر دیکھا وہ جمیلہ تھی میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔

''چلو بھیا گھر چلتے ہیں۔'' اور میں بھاری قدموں سے گھر کی جانب چل پڑا۔

❁

بے خودی میں صنم......

کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ تین کپتان اور ایک میجر
بیس ہزار لوگوں کی موجودگی میں ناچ بھی سکتے ہیں۔

☆ -- احمد عدنان طارق

میری عمر اکاون برس ہے اور اللہ کے فضل سے بلڈ پریشر کے علاوہ مجھے کوئی اور بیماری لاحق نہیں ہے۔ بلڈ پریشر مجھے آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے ہوا۔ میرے سر میں ایک دن شدید درد تھا اور میں گھر لیٹا ہوا تھا کہ میری چھوٹی بہن میرے پاس آئی اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کیا ہوا ہے؟ تو میں نے اسے بتایا کہ میرے آدھے سر میں درد ہے اور میرے خیال سے اسے درد شقیقہ کہتے ہیں۔ تو اس نے مجھے تنبیہ کی کہ میں اس زعم میں مبتلا نہ رہوں بلکہ میں اپنا بلڈ پریشر چیک کرواؤں۔ میں نے اس کی نصیحت پر عمل کیا اور کوئی چار گھنٹے ٹھہر کر اپنے محلے کے ڈاکٹر صاحب جو میرے ایف ایس سی کے کلاس فیلو اور دوست بھی ہیں، سے جا کر اپنا بلڈ پریشر چیک کروایا تو وہ اپنی مخصوص جگہ سے سرکا ہوا تھا۔

اس بیماری کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ ایک دفعہ بلڈ پریشر اپنی جگہ سے ڈسٹرب ہو جائے تو پھر یہ بیماری آپ کی عمر کے ساتھ چلتی ہے۔ اور آپ کو احتیاط کے ساتھ ساتھ دوائی بھی مستقل کھانا پڑتی ہے۔ سو تب سے آج تک میں صبح شام ایک ایک گولی بلڈ پریشر کے لئے کھا رہا ہوں۔ پولیس افسران کو یہ مرض ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن میں نے ورزش اور خوراک میں ہمیشہ ایک تناسب رکھا۔ لہٰذا میرے لئے یہ حیرانی والی بات تھی۔ جب ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ آپ کا بلڈ پریشر ڈسٹرب ہے۔ میں ان دنوں ایس۔ ایچ۔ او سول لائن فیصل آباد تعینات تھا۔ سول لائن تھانہ فیصل آباد کا سب سے مصروف تھانہ ہے۔ اس تھانہ کی حدود میں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد واقع ہے۔ اقبال سٹیڈیم بھی اس تھانہ کی حدود میں ہے۔ تمام پولیس کے بڑے افسران کی کوٹھیاں اس تھانہ میں ہیں۔ ان دنوں افضل ساہی صاحب ایم۔ این۔ اے تھے اور سپیکر قومی اسمبلی تھے۔ اگر SHO کو کوئی اور کام نہ بھی ہوتا تو وہ ریسٹ ہاؤس میں آ کر ٹھہرتے جو شومئی قسمت سول لائن کے ایریا میں ہی قائم کرتا تھا۔ لہٰذا نہ بھی افضل ساہی صاحب کا دل پیکری

Scanned by BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کے دور میں گھر جانے کو کیا اور نہ ہم کبھی ویک اینڈ پر گھر گئے۔ ہر ہفتے کی رات جب دوسرے سرکاری افسران ویک اینڈ پر چھٹی کے لئے گھر جانے کی تیاری میں ہوتے۔ ایس ایچ او سول لائن اقبال سٹیڈیم کے ارد گرد ون ویلنگ روکنے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہوتا۔ اس کے علاوہ ان دنوں فیصل آباد میں سونیا ناز کیس پر ڈی آئی جی صاحب اور SSP انوسٹی گیشن صاحب کی آپس میں بہت چپقلش چل رہی تھی۔ سونیا ناز کیس میری پوسٹنگ سے ایک سال پہلے رونما ہوا تھا۔ لیکن اس کی تپش میرے دور میں بھی کئی پولیس افسران کو جلا رہی تھی۔ میں کیونکہ SHO سول لائن تھا اس لئے کسی نہ کسی طرح دونوں طرف کی جلی کٹی دو وقت مجھے سنی پڑتی تھیں۔

اب ذرا سوچیے آج تک ہم سنتے آئے تھے کہ غیر حاضری اس بات سے تصور کی جاتی ہے کہ اگر SHO تھانہ میں حاضر نہ ہو لیکن سول لائن میں پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ SHO اس وقت بھی غیر حاضر تصور کیا جا سکتا ہے جب وہ تھانہ میں کسی کام کی غرض سے آیا ہو۔ یہ تھا سول لائن میں مصروفیت کا عالم۔ میں نے ان دنوں اپنے آپ کو کئی حصوں میں بٹا ہوا دیکھا۔ میرے دائیں ہاتھ میں وائرلیس رہتی جس کے لئے میرا دائیاں کان اور منہ حاضر رہتا۔ دایاں کان سننے اور دھیان کے لئے اور منہ جواب دینے کے لئے ۔ اسی طرح بایاں ہاتھ موبائل فون کے لئے مصروف ہوتا اور بایاں کان اسے سننے کے لئے۔ ان دنوں سخت گرمیاں تھیں۔ صبح سات بجے وردی پہن کر رات دو بجے تک وردی میں رہنا ہوتا تھا۔ سرکاری گاڑی میں جھلسا دینے والی گرمی برداشت کرتے رہنا۔ شہر میں تارکول کی سڑکوں کی گرمی۔ بے تحاشہ ٹریفک کا بہاؤ۔ کہیں سائے کا نہ ملنا۔ اگر کوئی ایمر جنسی کال آئے اور غور سے نہ سنی جا سکے تو کہنیوں سے ڈرائیور کو اشارہ کرتا کہ دائیں یا بائیں مڑنا ہے۔ ایمر جنسی کالز کی تو بات ہی چھوڑیں ذرا اندازہ لگائیے ایس ایچ او سول لائن کو کتنے افسران کال کر سکتے ہیں۔ گنیئے اور سر دھنیے۔ ڈی آئی جی صاحب، DPO صاحب ، ایس ایس پی آپریشن، ایس ایس پی انوسٹی گیشن ، ایس پی ٹاؤن، ڈی ایس پی، ریج کرائم کے افسران۔ ان سب کی سرکاری ڈیوٹیوں کے علاوہ اگر ان افسران کے گھروں کی ٹونٹیاں بھی خراب ہوتی ہیں تو وہ بھی ٹھیک کروانا ایس ایچ او سول لائن کا کام ہے۔

ان دنوں ڈی آئی جی صاحب جن کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتا کی کال مجھے آئی اور پریشر ہارن کی موجودگی میں مجھے سمجھ نہ آئی کہ گاڑی کہاں کھڑی کر کے تسلی سے ان کی بات سن سکوں۔ وہ فون پر پوچھتے کہ SHO صاحب یہ زرعی یونیورسٹی میں کیا ہوا ہے اب ذرا اندازہ کیجئے اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔ ذرا زرعی یونیورسٹی کا حجم دیکھیے وہ کتنی وسیع و عریض ہے اس میں کتنے سٹوڈنٹ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کے کیا کیا مسائل ہو سکتے ہیں۔ لیکن خدا کی مہربانی سے پتا ہی تھا کہ اقبال ہال کے ایک سٹوڈنٹ نے اپنے سمسٹر کے پیپر نہیں دیے۔ اور وہ کمرے سے غائب ہے۔ ڈی آئی جی صاحب سنتے کہ میں نے اس سٹوڈنٹ کا کھوج لگانے کی کیا تراکیب کی ہیں اور وہ مطمئن ہو جاتے۔ اسی طرح کبھی وہ سوال کرتے کہ ایس ایچ او صاحب یہ لاری اڈہ کا کیا مسئلہ ہے۔ مجھے پہلے بتانا بھول گیا کہ فیصل آباد کا لاری اڈہ بھی سول لائن کے ایریا میں واقع ہے۔ تو میں نے جواب دیا کہ جناب آج کل لاری اڈہ دوبارہ تعمیر ہو رہا ہے اور وہاں کے منتظم نے پچھلی ترتیب میں گڑ بڑ کر کے ایک بس گروپ کو نواز کر اس کا نمبر فرنٹ پر کر دیا ہے۔ سوال ہوتا کہ تم نے کیا کیا ہے تو میں بتاتا کہ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ اگر اس بات پر جھگڑا ہوا تو اس کے نقصان کے تم ذمہ دار ہو۔ تمہارا نام بھی FIR میں دیا جائے گا۔ تو ڈی آئی جی خوش ہو جاتے۔

بس اس ساری گفتگو کا مقصد آپ کو یہ بتانا تھا کہ خدا کے سہارے کشتی رواں دواں تھی۔ اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں تھا۔ مگر شروع میں میں نے جو آپ کو اپنے بلڈ پریشر میں مبتلا رہنے کی وجہ بتلائی تھی وہ اب آپ کو سمجھ آ رہی ہو گی کہ سول لائن میں چھ ماہ ایس ایچ او رہنے کی وجہ سے مجھے بلڈ پریشر ہوا تھا۔ میں آج اسی تعیناتی کا ایک واقعہ آپ سے شیئر کرنے لگا ہوں۔ یہ 2005ء کا زمانہ تھا۔ فیصل آباد انتظامیہ کو خیال آیا کہ فیصل آباد شہر کو بنے پورے سو سال ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اس کے شایان شان کوئی تقریب منعقد کی جانی چاہیے۔ کئی تقریبات منعقد کی گئیں لیکن سب سے بڑی تقریب جو آٹھ دن جاری رہی تھی وہ اقبال سٹیڈیم میں منعقد ہوئی۔ آٹھ دن تک ہر رات اقبال سٹیڈیم میں میوزیکل نائٹ منائی جاتی ۔ سارے شہر کی پولیس ان میوزیکل پروگرامز پر متعین کی گئی اور ان آٹھ دنوں میں فیصل آباد کی تمام پولیس کا کام صرف اور صرف ان رنگین پروگرامز پر ڈیوٹی سرانجام دینا تھا۔ اقبال سٹیڈیم کے تمام کھلوں پر شہر کے مختلف ایس ایچ او رات بھر ڈیوٹی کرتے۔ سارا ہفتہ ڈیوٹی کے دوران جاگ جاگ کر پولیس والوں کا برا حال تھا۔ آخر ہفتہ کے چھ دن گزر گئے اور آخری دن آ گیا۔ ہر صبح رات کے پروگرام کا ہمیں روسٹر مل جاتا کہ آج کون سے فنکار اقبال سٹیڈیم میں پرفارمنس کا مظاہرہ کریں گے۔ آخری دن جب ہم نے روسٹر دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اس لسٹ میں کوئی فنکارہ نہیں تھی۔

فنکارہ خواہ کسی عمر کی بھی ہو وہ پبلک کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ہمیں امید تھی کہ کسی خاتون گلوکارہ کی عدم موجودگی سے رش بہت کم ہو گا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا یہ بتانے سے پہلے پورا ہفتہ ہم بہت اذیت سے گزرے۔ لوگ پاسز کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ وہاں MI اور دوسرے خفیہ اداروں کی بھی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔ جو اگرچہ انڈر کور ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے مگر ظاہر ہے ان کے بھی ملنے والے ہوتے ہیں۔ بہر کیف خدا کا بہت شکر تھا کہ میرا ان سب حضرات سے بڑا اچھا ورکنگ ریلیشن تھا۔ اور ہمارا کبھی ایک دوسرے سے کسی بھی بات پر اختلاف نہیں ہوا۔ اسی طرح میڈیا میرے پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے خاصا کمفر ٹیبل تھا۔ اور ان کی کوریج اور ان کی عزت میں کبھی بھی ان دنوں میں میں نے کمی نہیں آنے دی۔ روز ڈیوٹی کی وجہ سے ان تمام حضرات سے میری خاصی جان پہچان ہو چکی تھی۔ ساتویں اور آخری دن جب ہم نے روسٹر دیکھا تھا تو اس میں کوئی خاتون فنکارہ نہیں تھی۔ لیکن شام جب ہم ڈیوٹی کے لئے تیار ہو کر سٹیڈیم پہنچے تو ایک ترمیم شدہ پروگرام ہمارے سپرد ہوا اور اس میں سر فہرست نام شاہدہ منی کا تھا۔ جس کی پرفارمنس ہمیشہ بغیر بازو کی قمیص پہن کر ہوتی تھی اور وہ سٹیج پر گانا گاتے ہوئے باقاعدہ تھرکتی بھی تھیں۔ یعنی ہر وہ مصالحہ حاضر تھا جس کے لئے لوگوں نے کھنچا آنا تھا۔ کیونکہ یہ اختتامی پروگرام بھی تھا لہٰذا آج شام تمام انتظامیہ کے بڑے افسران اور شہر کے نامور لوگوں کو بمعہ اہل و عیال یہ پروگرام دیکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اور سٹیج کے سامنے کرسیوں کی اگلی دو قطاریں ان VIP فیملیز کے لئے رکھی گئی تھیں۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پروگرام کے آغاز سے ہی ہلڑ بازی شروع ہو گئی۔ دنیا کو شاہدہ منی کا پتا چلا۔ صرف شاہدہ منی ہی نہیں روسٹر میں ہندوستان سے آئے گلوکار ہنس راج ہنس بھی شامل تھے لہٰذا لوگ سٹیڈیم کی طرف امڈ پڑے۔ یوں لگتا تھا سارا شہر سٹیڈیم کی طرف ہی آ گیا ہے۔ ہم نے اسٹیڈیم کے کھلوں پہ سکیورٹی کے پیش نظر بڑی جدوجہد کی کہ لوگ انسانوں کی طرح سکیورٹی چیک کے اصولوں کے مطابق تلاشی دے کر جائیں۔ مگر بے سود، لوگوں نے دھکے مارنے شروع کر دیے۔ ہماری

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

جدوجہد کوئی گیارہ بجے رات تک جاری رہی لیکن بے بس ہونے کی وجہ سے گیٹ کھول دیے گئے۔ کیونکہ مین گیٹ تو ویسے بھی لوگوں نے توڑ ہی دیا تھا۔ اس رات کم از کم ایک محتاط اندازے کے مطابق کوئی بیس ہزار افراد سٹیڈیم میں موجود تھے۔ لوگوں کو سیٹل کر کے بٹھاتے بٹھاتے تقریباً رات بارہ بج گئے۔ میرے ڈی ایس پی صاحب جن کا نام رشید تھا میں نے زندگی میں جن ڈی ایس پی حضرات کے ساتھ نوکری کی ہے وہ ان میں سب سے زیادہ ماتحت پرور اور اچھے تھے۔ میں نے اس دن انہیں بھی انتہائی محنت سے کام کرتے دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ حالات ہمارے قابو میں آتے گئے۔ اور لوگوں کو جہاں جگہ ملتی گئی وہ وہاں سیٹ ہو کر بیٹھتے گئے۔

رات ایک بجے کے قریب ڈی ایس پی صاحب کا مجھے فون آیا کہ اب سب ٹھیک ہے آرام سے بیٹھو اور پروگرام دیکھو۔ لیکن ابھی میں ٹھیک طرح بیٹھ بھی نہیں سکا تھا کہ دوبارہ ان کا میسج آ گیا کہ سٹیج کے سامنے تین چار لڑکے واہیات قسم کا ڈانس کر رہے ہیں اور ان کا منہ سٹیج کی مخالف سمت میں VIP سیٹوں کی طرف بیٹھی خواتین کی طرف ہے۔ انہیں جا کر وہاں سے نکالو۔ میں سٹیج کی طرف چلا میرے ساتھ میرے دو گن مین طاہر اور مقصود تھے۔ جو الیٹ کی قمیضوں میں تھے جن کے اوپر No Fear لکھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میرا ڈرائیور اسلم جو میرا پرائیوٹ گن مین بھی تھا میرے پیچھے پیچھے تھے۔ ان دنوں میں پیٹرولنگ پولیس میں نئی نئی بھرتی ہوئی تھی۔ اور پیٹرولنگ میں بھرتی نئے نئے سپاہی اس ڈیوٹی پر لگائے گئے تھے۔ پیٹرولنگ کے دس بارہ جوان بھی میرے ساتھ تھے۔ میں لوگوں کے ہجوم میں سے ہوتا ہوا سٹیج کے نزدیک پہنچا تو میں نے دیکھا کہ چار نوجوان جن کی عمریں چوبیس سے اٹھائیس کے درمیان ہوں گی والہانہ جوش جذبہ سے رقص فرما رہے تھے۔ اور جس قسم کے فضول اشارے وہ سٹیج کی طرف بیک کر کے اور VIP سیٹوں کی طرف منہ کر کے کر رہے تھے وہ شائستگی کے زمرے میں ہرگز نہیں آتے تھے۔ لباس کی تراش خراش سے البتہ صاف لگ رہا تھا کہ وہ پڑھے لکھے بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھنے والے پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ ان کے جسم انتہائی کسرتی اور شکلیں انتہائی خوبرو تھیں۔ میرا پہلا تاثر ان کے بارے میں یہ ابھرا کہ تو وہ لیتے ہیں۔ اور شاید شراب کے نشے میں ہیں۔ بہرکیف میرے گن مین طاہر نے مجھ سے پہلے ایک نوجوان کے کندے پر ہاتھ رکھا تا کہ اسے روکے لیکن نوجوان نے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے پیچھے مڑ کر بغیر دیکھے میرے گن مین کو دھکا دیا۔ اب میری باری تھی میں نے آگے بڑھ کر اسے روکنا چاہا تو جس طرح وہ بے ترتیب اور بے ڈھنگے ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا اس کا بے ربط ہاتھ میری قمیص پر لگی میری نیم پلیٹ پر پڑا۔ گرمیوں کے دن تھے اور میری قمیص بالکل پتلی تھی جس پر سلور لائنڈ کی نیم پلیٹ۔ نیم پلیٹ والی جگہ سے میری قمیض پھٹی اور کمر تک پھٹتی ہی چلی گئی۔ ساری زندگی میں میرے ساتھ کبھی اس قسم کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور کہاں بیس ہزار بندوں کے سامنے قمیص کا پھٹنا۔

میرے سپاہیوں نے یہ معاملہ دیکھا تو سٹیج کی ایک سائیڈ جس سے تھوڑا راستہ پنڈال سے باہر جاتا تھا میرے سپاہی ان چاروں کو دھکیلتے ہوئے پنڈال سے باہر لے گئے۔ چار میں سے تین نوجوان ہمارے ہاتھ سے نکل گئے لیکن کسی نہ کسی طرح ایک نوجوان ہمارے ہاتھ چڑھ گیا۔ اس کی مزاحمت دیدنی تھی۔ وہ پولیس ملازمین کے ساتھ مسلسل ہاتھا پائی میں مصروف رہا۔ دس پولیس والے تھے اور ایک ہی نوجوان تھے لیکن پھر بھی وہ کے قابو نہیں آ رہا تھا۔ آخر میرے پرائیویٹ گن مین نے اس کی ٹانگوں کو جپھا مارا اور اسے نیچے گرا لیا۔ پوری دھینگا مشتی کے دوران وہ پولیس والوں سے

کی گن چھیننے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن آخرکار جب پولیس والوں نے مل ملا کر اسے قابو کر لیا۔ دو تین سپاہیوں نے اسے ٹانگوں سے پکڑا۔ کوئی ایک دو نے اس کے بازو پکڑے اور ایک سپاہی نے اس کی گردن پر اپنا گھٹنا رکھا تو اس نے پہلی دفعہ اپنا تعارف کروایا کہ اس کا نام کیپٹن ابرار ہے اور وہ فیصل آباد میں ہی تعینات ہے۔ اور اس کے ساتھ بھاگنے والوں میں سے ایک میجر اور دو کیپٹن تھے۔ سپاہیوں نے یہ سنا اور لاشعوری طور پر ان کی نگاہیں میرے ساتھ چار ہوئیں ان میں یہ سوال عیاں تھا کہ سر اب کیا کریں۔ ان کے ذہنوں میں جو گھوم رہا تھا وہ میرے ذہن میں بھی گردش کر رہا تھا لیکن فوراً سوچے بغیر میرا جواب تھا کہ Carry On۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس بات کا یقین آ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ کیپٹن بھی ہو سکتا ہے۔ کسی فوج کے کپتان سے کون توقع کر سکتا تھا کہ وہ اس طرح بیس ہزار بندوں کے سامنے ناچ بھی سکتا ہے۔ میرے کیری آن کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کو میری وردی پھاڑنے کا مزا چکھاؤ۔ اس کے آگے کیا ہوا وہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ پیٹرولنگ کے کانسٹیبلان نئے رنگروٹ تھے۔ انہیں نتائج کی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے میری قمیض پھٹنے کا بدلہ کیپٹن صاحب سے لیا اور پھر ہم کیپٹن صاحب کو ڈنڈا ڈولی کر کے باہر لے گئے۔ اتنی دیر میں اس واقعہ کا علم ڈی ایس پی صاحب کو بھی ہو گیا۔ باقی عوام دوبارہ اپنے کھیل تماشے میں مصروف ہو گئی۔ انہیں معاملے کی سنگینی کا علم نہیں ہوا۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ کسی عام آدمی کو پولیس والوں نے مارا ہے۔ ویسے بھی مار کھانے والوں کی حرکتیں ہی ایسی تھیں کہ پبلک کی نظر میں پولیس والے حق پر تھے۔

اقبال سٹیڈیم کے مین گیٹ کی انٹری پر انتظامیہ کے لئے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ہم کیپٹن صاحب کو لئے اقبال سٹیڈیم سے باہر نکلے تو ادھر سے وہ تینوں

ضرورت رشتہ

امریکن گرین کارڈ ہولڈر RUTGER یونیورسٹی سے سائیکالوجی میں گریجویشن، پابند صوم وصلوٰۃ کنواری لڑکی کے لئے لاہور کے رہائشی اہلسنت پنجابی/ اُردو سپیکنگ لڑکے کا رشتہ درکار ہے۔ لڑکا ڈاکٹر، انجینئر، فارماسسٹ یا اکاؤنٹینٹ ہو۔ سید/ راجپوت فیملی کو ترجیح دی جائے گی۔

(میرج بیورو والے رجوع نہ کریں)

خط کتاب: ماہنامہ "حکایت" - پٹیالہ گراؤنڈ لاہور (پاکستان)

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

نوجوان جو کیپٹن ابرار کے ساتھ ناچ رہے تھے وردیاں پہن کر واپس آگئے۔ اقبال سٹیڈیم سے ملحقہ نیوی والوں کا آفس ہے۔ میجر صاحب نیوی کے کوئی آفیسر تھے۔ باقی دونوں نے کپتانوں کی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی للکارا کہ تمہیں نہیں پتا کہ یہ serving کیپٹن ہیں۔ چھوڑ دو ان کو۔ باقی ملازمان کو چھوڑیں میں خود بھی اس سارے معاملے سے خائف تھا اور دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ کسی طرح بھی اس معاملے سے میری جان چھوٹ جائے۔ میں نے پولیس اور فوج کے معاملے بگڑتے اور بعد میں ان کے اثرات سن رکھے تھے۔ اس سے پہلے کہ میری گرفت کیپٹن صاحب سے ڈھیلی پڑتی میرے ڈی ایس پی صاحب وہاں پر آئے۔ اور انہوں نے میری ہمت بڑھائی اور مجھے بتایا کہ اگر میں نے اس طرح کیپٹن صاحب کو جانے دیا تو اس کے نتیجے کیا ہو سکتے ہیں۔ ڈی ایس پی صاحب کے حوصلہ بڑھانے سے میں بھی ہمت میں ہو گیا۔ ڈی ایس پی صاحب نے ڈی پی او صاحب کو کال کی۔ ڈی پی او صاحب بھی سابقہ فوجی آفیسر تھے۔ ان سے تو رابطہ نہ ہو سکا کیونکہ رات بہت ہو چکی تھی لیکن ایس پی سٹی کے ساتھ ڈی ایس پی صاحب کا رابطہ ہوا۔ خوش قسمتی سے وہ بھی سابقہ فوجی افسر تھے۔ وہ سٹیڈیم میں آنے کے لئے نکل پڑے۔ اس اثنا میں ایم آئی اور آئی بی کے لوگ بھی سٹیڈیم کے باہر ہمارے پاس آگئے تھے۔ اور میڈیا کی بھی یلغار ہو گئی۔ جب ان سب حضرات کو معاملہ کی سنگینی کا علم ہوا تو خدا نے اپنی رحمت کے دروازے مجھ پر کھولنے شروع کر دیے۔ میرے تعلقات ایم آئی اور آئی بی والوں کے ساتھ کام آئے۔ انہوں نے پوری شدت سے میری مخالفت نہیں کی۔ اور انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق گفتگو شروع کر دی۔ جو درحقیقت میری اخلاقی فتح تھی۔ پریس اور میڈیا والوں نے کمال مہربانی سے میری وردی چھننے کو ہائی الرٹ کرنا شروع کیا جب کہ جو کیپٹن صاحب کے ساتھ ہوا اس کی ساری وڈیوز ڈیلیٹ کر دیں۔

ایس پی صاحب سٹی کے آنے تک کیپٹن صاحب اور ان کے حواری بیک فٹ پر آ چکے تھے۔ ایس پی صاحب نے ان سے مذاکرات کیے جو کامیاب ہونے پر کیپٹن صاحب کو رہا کیا گیا۔ میری ان سے صلح کروائی گئی۔ رات واپس آ کر سونے کی کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مجھے علم تھا کہ اگلے کئی دن تک مجھے بچ کر رہنا ہوگا۔ کیونکہ تھانوں پر فوج کی یونٹوں کے یلغار کے بارے میں سن چکا تھا کہ کس طرح وہ دشمن ایس ایچ او کو اٹھاتے ہیں اور پھر ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ بلکہ اگلے پندرہ دن تک میں راستے بدل بدل کر تھانہ جاتا رہا اور اپنی صحیح لوکیشن کسی کو بتانے کے بارے میں گریزاں رہا۔ تب کہیں جا کر معاملات نارمل ہوئے۔ لیکن جب میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ حالات نارمل ہو رہے ہیں۔ نوشہرہ سے ایک بریگیڈیئر صاحب فیصل آباد آئے اور زرعی یونیورسٹی میں رہائش رکھ کر انکوائری کے لئے مجھے اور ڈی ایس پی صاحب کو بلایا۔ میرے گھر سفارشیوں اور دھمکیوں کی بھرمار ہو گئی۔ مجھے ڈرایا دھمکایا گیا اور منتیں بھی کی گئیں کہ میں کوئی بیان نہ دوں۔ ہو سکتا ہے میں مان جاتا لیکن ڈی ایس پی صاحب میری پشت پر کھڑے رہے اور ہم نے بہت مضبوطی سے بیانات کمیشن کے سامنے دیے۔ بریگیڈیئر صاحب انکوائری کے بعد واپس چلے گئے۔ کچھ دن کے بعد کیپٹن صاحب کے سفارشیوں نے بتایا کہ کیپٹن صاحب کا کورٹ مارشل ہوا۔ باقی بندے محکمے سے برخاست ہو گئے۔ فوج والوں کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ تین کپتان اور ایک میجر بھی ہزار لوگوں کی موجودگی میں ناچ بھی سکتے ہیں۔

●○●

عدیم الفرصت

"کاش! میری کوئی اولاد بھی نہ ہوتی"۔ بے ساختہ ماسٹر جی کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ "کتنا اچھا ہوتا جو میں یہ کتا ہی پال لیتا"۔

عبدالحفیظ بشر

روشنیوں کا شہر کراچی جو کبھی مچھیروں کی بستی ہوا کرتی تھی آج کل دنیا کے گنجان ترین شہروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کی آبادی دو کروڑ سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔

ہمارے شناسا ماسٹر علاؤالدین مدنی جو ایک سکول کے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے، انہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ عرصہ اندرون سندھ میں گزارا۔ وہ جب بھی دوران سروس اپنے سرکاری کام کاج کے سلسلہ میں کراچی آتے اور اس روشنیوں کے شہر میں گھومتے پھرتے تو ان کے دل میں ایک خواہش سی پیدا ہوتی اور برملا کہتے کہ وہ بھی جب بھی اپنی نوکری سے ریٹائر ہوئے تو اس صورت میں زندگی کے باقی ایام اس خوبصورت شہر میں گزاریں گے۔

اولاد میں ان کے ایک لڑکی تھی جو کالج جاتے ہوئے ایک روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہوئی اور انتقال کر گئی۔ ایک لڑکا جس کا نام رفیع الدین مدنی تھا، اس نے پیٹرو کیمیکلز میں ایم ایس سی کر رکھی تھی اور وہ اسی شعبے میں پی ایچ ڈی کرنے امریکہ جانے کا خواہشمند تھا۔ ان کی بیوی جس کا نام رقیہ بانو تھا، وہ ایک سکول کی ریٹائر ٹیچر تھی اور ایک عرصہ سے ذیابیطس جیسے موذی مرض کا شکار تھی۔

وقت کا پنچھی اپنی مخصوص رفتار سے اڑتا رہا اور تقریباً دو سال بعد ماسٹر علاؤالدین مدنی صاحب کی ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا اور وہ نوکری سے فارغ ہو گئے۔

ان کا اکلوتا بیٹا رفیع الدین مدنی ان کی شادی کے تقریباً تین چار سال بعد بڑی منت مرادوں سے پیدا ہوا تھا اور انہیں ایسا محسوس ہوا کہ سارے جہان کی خوشیاں ان کے گھر میں آ گئی ہیں۔ میاں بیوی کی زندگی جو اداسی اور ویرانی کے سیاہ بادل اور اندھیرے چھائے رہتے تھے، رفیع کے جنم سے سب ختم ہو گئے اور ان کا گھر بچے کی پیدائش سے روشن روشن ہو گیا۔ دونوں کی معقول آمدن تھی۔ وہ سرکاری ملازمت بھی کرتے اور ساتھ ساتھ بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتے۔ وہ اتنا کچھ کما لیتے تھے کہ اپنے ہونے والے بیٹے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے بہت کچھ تھا۔ وہ اس کو اچھی سے اچھی تعلیم دلوانے کے حق میں تھے۔ انہوں نے اپنی بچت سے ایک چھ سات مرلے کا مکان بھی تعمیر کروا رکھا تھا۔

میاں بیوی کی ضرورتیں محدود تھیں۔ انہوں نے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

بے حد سادہ اور اعتدال بھری زندگی گزاری تھی۔ علم و ادب سے تعلق تھا۔ انسان جب اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کی ایک حد مقرر کر لیتا ہے تو پھر اس صورت میں ہزاروں مشکلیں اور تکالیف خود بخود اس سے دور بھاگ جاتی ہیں۔ وہ بڑی حد تک اپنی زندگی سے مطمئن حال تھے۔ ان کی نظریں ہر وقت اپنے بیٹے پر مرکوز رہتیں۔

اسی دوران ان کے بیٹے رفیع الدین کو امریکہ کی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے داخلہ مل گیا جس کے لئے سات سے آٹھ لاکھ روپوں کی ضرورت تھی۔ اپنے بیٹے کے مستقبل کے لئے باپ نے مکان کو فروخت کر دیا اور بیٹے کو امریکہ مزید تعلیم کے حصول کی خاطر بھیج دیا۔ خود انہوں نے کراچی میں رہائش اختیار کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ جلد ہی وہ کراچی آ گئے اور اپنے کسی رشتہ دار کی وساطت سے انہوں نے ایک عام سی کالونی میں کرائے کا مکان لیا۔ اپنے آپ کو مصروف رکھنے اور آمدن کا ذریعہ بنانے کے لئے میاں بیوی نے اپنے مکان میں ہی ٹیوشن کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دن کو ماسٹر صاحب کی بیوی بچیوں کو ٹیوشن پڑھاتی اور سہ پہر شام کو خود ماسٹر صاحب بچوں کو پڑھاتے۔ دونوں بڑھاپے کی دہلیز پر تھے۔ ماسٹر صاحب کی بیوی ذیابیطس اور جگر کے عارضے میں مبتلا تھی۔ ماسٹر علاؤالدین بھی اپنی عمر کے پیشِ نظر گردوں کے دائمی مرض میں مبتلا تھا۔

دونوں میاں بیوی پابندی سے علاج معالجہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ ہر مشکل کا بڑی خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کا عزم کیے ہوئے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ جب ان کا بیٹا اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس وطن آئے گا تو پھر وہ ایک عالیشان بنگلہ خریدیں گے۔ ڈھیروں آمدن ہو گی اور آگے پیچھے ان کے نوکر چاکر کاریں ہوں گی اور ان کے تکالیف بھرے دنوں کا مداوا ہو جائے گا۔

یہ محض ان کا خیال سوچ فکر تھی اور ایک خواہش بھی۔ خواہش اکثر ادھوری سی رہتی ہے اور انسان ایک امید کے سہارے اپنی زندگی کے دن گزارتا ہے۔

دوسری طرف جب رفیع الدین کو امریکہ کے شہر نیویارک یونیورسٹی میں داخلہ ملا تو اس کا دل خوشیوں سے جھوم اٹھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ بھی امریکہ دیکھ سکے گا۔ امریکہ جانے کے بعد تعلیم تو اپنی جگہ وہ وہاں کی رنگینیوں میں کھو گیا۔ صبح کو اپنی یونیورسٹی جاتا اور شام کو اسے ایک ہوٹل میں کام کرنے کی اجازت بھی مل گئی تا کہ اس طرح اس کا جیب خرچ بھی چلتا رہے۔ یہاں اس کی دوستی ایک ہوٹل کی منیجر مس سنگیتا سے ہو گئی جو انڈیا سے وہاں آئی تھی اس نے ہوٹل مینجمنٹ میں ایم بی اے کر رکھا تھا اور اس کے والدین کا وہاں پولٹری بریڈنگ فارم تھا۔ گویا یہ لوگ وہاں کے شہری بھی اور مالی لحاظ سے بھی بہت مضبوط تھے۔

رفیع الدین کو ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہونے کے باعث اسے زندگی کے راستے میں ہر قدم پر محرومیوں اور مایوسیوں کا سامنا رہا تھا۔ اس نے ماضی میں اپنی بہت سی خواہشوں اور ضرورتوں کو اپنے دل میں ہی دفن کر رکھا تھا مگر اب امریکہ آ کر اس کی تو کایا ہی پلٹ گئی۔ تقدیر اس پر مہربان تھی۔ وہ اپنی محرومیوں کا ازالہ کرنے کے لئے دنیا کی ہر خوشی حاصل کرنے کا فیصلہ کئے ہوئے تھا دوسرے جب سے سنگیتا اس کی زندگی میں داخل ہوئی اس نے اپنی تعلیم پر بھی توجہ دینا کم کر دی۔ ایک سال تک تو وہ یونیورسٹی آتا جاتا رہا پھر آگے چل کر اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ جس مقصد کے لئے تعلیم کے حصول کی خاطر آیا تھا وہ مقصد اس نے بھلا دیا۔ سنگیتا کے علاوہ اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ اس کا ارادہ سنگیتا سے شادی کرنے کا تھا۔ وہ اس سونے کی چڑیا کو اپنے ہاتھ سے کھونا چاہتا تھا۔ اب وہ سنگیتا والے ہوٹل میں ہی فل جاب کرنے لگا جس سے اسے ایک معقول آمدن

علاوہ سنگیتا کی قربت بھی ملتی۔ اسے یہ خبر ہو چکی تھی کہ اس کے والدین سندھ سے کراچی رہائش پذیر ہو گئے ہیں۔ اسے چاہئے تو یہ تھا کہ ان کو بھی ماہوار کچھ نہ کچھ پیسے بھیجتا لیکن وہ یہ خیال کرتا کہ دونوں کی معقول پنشن ہے اور ساتھ ساتھ وہ بچوں کی ٹیوشن سے ایک معقول رقم کما لیتے ہیں۔

بے شک اس کے والدین کی ماہوار ایک معقول آمدنی تھی لیکن ان کے ماہوار اخراجات بھی کچھ کم نہ تھے۔ خاص کر میاں بیوی اپنی عمر کے لحاظ سے پیچیدہ قسم کی بیماریوں میں مبتلا تھے اور ان کی آمدنی کا زیادہ حصہ علاج معالجے میں خرچ ہو جاتا تھا۔ اُدھر رفیع سنگیتا کے عشق میں مبتلا ہو کر دنیا جہان کو بھولا ہوا تھا۔ سنگیتا بھی رفیع کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ دونوں اپنی اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ہر شام نیویارک میں سیر و تفریح کرتے اور اپنے مستقبل کے متعلق منصوبہ بندی کرتے۔ وہ ایک مرتبہ اپنی سالانہ چھٹیوں پر نیاگرا آبشار دیکھنے بھی گئے۔ پورے ایک ماہ تک وہ چھٹیاں گزارنے کے بعد سنگیتا نے اپنے ماں باپ سے اظہار کیا کہ اس نے اپنے جیون ساتھی کا انتخاب کر لیا ہے۔ بھلا انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اسی دوران رفیع الدین نے اپنی رہائش کے لئے ایک فلیٹ بھی خرید لیا۔ پروگرام کے مطابق ایک دن سنگیتا اپنے والدین کے ساتھ رفیع الدین کے فلیٹ پر آئے انہیں لڑکا پسند آ گیا اور ان کی شادی ایک ماہ کے اندر اندر پاکستانی کمیونٹی سینٹر میں رجسٹرڈ ہو گئی اور یوں دونوں میاں بیوی کے رشتہ سے منسلک ہو گئے۔ سنگیتا اب مسز رفیع الدین مدین کے نام سے پکاری جانے لگی اور رہائش بھی رفیع کے فلیٹ میں اختیار کر لی۔

رفیع الدین اب بہت خوش تھا۔ اس نے اپنے والدین کو پاکستان اپنی شادی کی خبر بھیج دی کہ اس نے اپنی پسند کی ایک امیر کبیر لڑکی سے شادی کر لی ہے اور وہ بہت جلد انہیں بھی امریکہ بلوا لے گا۔ جب رفیع کے والدین نے اپنے بیٹے کی شادی کی خبر سنی تو اس کی ماں کو احساس ہوا کہ ان کا بیٹا اب ان کی دنیا سے بہت دور جا چکا ہے۔ اتنی دور جہاں سے واپسی بھی ممکن نہیں۔ دراصل رفیع الدین کے والدین کو اس کی شادی کی کوئی خاص خوشی نہ ہوئی کیونکہ اس کی ماں تو یہ خواہش لئے ہوئے تھی کہ جب ان کا بیٹا پی ایچ ڈی کر کے واپس وطن آئے گا تو ایک عالی شان بنگلہ خریدیں گے۔ پھر ایک خوبصورت دلہن کا انتخاب ہو گا۔ یہ سب خواہشیں دم توڑ گئیں اور اس کی ماں نے اپنے بیٹے کے اس فیصلے پر ناراضی کا اظہار کیا اور ذہنی طور پر وہ پریشان ہو گئی اور اسے ہسپتال میں داخل کروانا پڑا۔

کچھ دن ہسپتال میں رہنے کے دوران وہ رو بہ صحت ہو کر آ گئی لیکن وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے سلوک سے ذہنی طور پر منتشر ہو کر رہ گئی کہ اس کے بیٹے نے وہاں امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کی بجائے اپنی مرضی سے شادی کر ڈالی اور اپنے والدین سے مشورہ تک نہیں کیا۔

جلد ہی انہیں بیٹے کی طرف سے امریکہ سے سپانسرشپ لیٹر موصول ہو گیا۔ سنگیتا سے شادی کر لینے کے بعد رفیع کو بھی وہاں کی قومیت مل گئی۔ ویزے کے کاغذات وصول پا کر انہیں کوئی خاص خوشی نہ ہوئی۔ تاہم انہوں نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ امریکن ایمبیسی میں ویزے کے حصول کی خاطر کاغذات جمع کرا دیے لیکن میڈیکل گراؤنڈز کی وجہ سے ان کے ویزوں کی درخواست خارج کر دی گئی کہ وہ شدید بیماری کا شکار ہیں لہٰذا اپنا علاج کروائیں فٹنس کی صورت میں ویزہ مل سکے گا۔ خیر انہوں نے اپنے بیٹے رفیع کو ساری صورت حال سے باخبر کر دیا۔ رفیع نے جواباً فون پر کہا کہ آپ لوگ فکر نہ کریں میں یہاں کے ڈاکٹر سے وقت لے کر علاج معالجے کے لئے اپیل کر کے بلوا لوں گا۔ تاہم اس کے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

لئے تھوڑا وقت درکار ہوگا۔

میاں بیوی نے بیٹے سے کہا کہ ٹھیک ہے جیسی صورت حال ہو گی اور ہماری صحت اجازت دے گی۔ کیونکہ وہ خود بھی وہاں جانا پسند نہیں کرتے تھے وہ اپنی بیماری کے پیش نظر اپنے ملک میں ہی باقی ماندہ زندگی کے دن گزارنا چاہتے ہیں۔ انہیں اپنے ملک کی مٹی سے پیار تھا۔ وہ دیار غیر کی مٹی میں دفن ہونا پسند نہ کرتے تھے۔

دراصل رفیع کے شادی کر لینے کے فیصلے نے ان کو توڑ کر رکھ دیا تھا اور بیماریاں بھی میاں بیوی کا گھیرا تنگ کر رہی تھی۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھانا بھی اب ان کے بس میں نہ تھا۔ صرف اور صرف ان کی آمدن کا ایک ہی ذریعہ تھا، پنشن۔

ماسٹر علاؤالدین مدنی کی بیوی رقیہ بانو بیماری کی وجہ سے بستر پر لگ کر رہ گئی تھی۔ اب گھر کے کام کاج کا سارا بوجھ، ماسٹر جی پر آن پڑا تھا۔ علاج معالجے کے ساتھ ساتھ ماسٹر جی کا صدقہ خیرات پر بھی یقین تھا۔ وہ ہر جمعرات کو چیل کوؤں کو گوشت کے ٹکڑے ڈالتے تھے۔ ان کے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک خالی ویران سا پلاٹ تھا اور وہاں ایک قبر تھی اور کچھ جھاڑیوں کے جھنڈ بھی تھے۔ وہاں ایک کتا ہر وقت دکھائی دیتا۔ دن کو وہاں سکون سے سویا رہتا اور رات کو گلی میں گھومتا پھرتا، دانا بینا شخص تھے۔ ان کو کتے کی یہ ادا بہت پسند تھی۔ لہٰذا وہ دو چار گوشت کے ٹکڑے اس کتے کو ضرور کھلاتے۔ کتا بھی ماسٹر جی کے اس حسن سلوک سے ان سے بہت زیادہ مانوس ہو گیا۔ ماسٹر جی جب بھی گھر سے باہر کام کاج کے سلسلہ میں نکلتے نہ جانے کیسے کتے کو ان کی گلی میں آمد کی خبر ہو جاتی وہ ماسٹر جی کے قدموں میں لوٹ پوٹ جاتا۔ ہر کوئی یہ ہی سمجھتا کہ یہ ان کا پالتو کتا ہے حالانکہ ایسی بات نہ تھی۔ اگر ماسٹر جی گھومنے پھرتے پبلک پارک میں جاتے اور وہاں بیٹھ کر پارک کا نظارہ کرتے تو کتا برابر ان کے ساتھ ساتھ رہتا۔ پھر جب وہ وہاں سے گھر واپس آتے کتا ان کو گھر تک چھوڑ کر پھر پلاٹ میں جہاں اس نے رہنے کے لئے مسکن بنا رکھا تھا وہاں چلا جاتا۔

مختصر یہ کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ ماسٹر جی بھی وقت نکال کر دن میں ایک دو مرتبہ اسے پیار کر آتے۔ جس دن ماسٹر جی کتے سے نہ ملتے تو پھر وہ شام کو ان کے گھر کی دہلیز پر ان کا انتظار کرتا اور ماسٹر جی اس کو کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ دیتے اس طرح دن رات گزرتے چلے گئے۔ ادھر بیگم رقیہ بانو کے متعلق ڈاکٹروں نے ماسٹر جی کو بتا دیا تھا کہ چند دنوں کی مہمان ہے۔ کیونکہ اس کے دونوں گردے فیل ہو چکے ہیں اور کسی وقت بھی بلاوا آ سکتا ہے۔ یہ جان کر ماسٹر جی کو ذرا بھر بھی حیرانی اور پریشانی نہ ہوئی اور نہ ہی ان کے آنسو نکلے۔

دراصل ماسٹر جی کئی مہینوں سے اپنی شریک حیات کو سخت اذیت اور کرب میں مبتلا دیکھ کر خود بھی اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر رہ گئے تھے اور اب وہ بڑی حد تک ذہنی طور پر تھک گئے تھے پھر وہ اپنے ذہن کو بدلنے کے لئے کچھ عرصہ کے لئے اپنے گھر کے ماحول سے باہر گھومتے پھرنے پبلک پارک میں چلے جاتے۔ وہاں ایک لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا بنچ ہوتا اس پر بیٹھ کر آسمان کی طرف نگاہیں لگائے تکتے رہتے۔ اس دوران ان کا ساتھی کتا بھی ان کے ساتھ ساتھ رہتا۔ وہ ان کے پاؤں کو بڑے ہی پیار اور عقیدت سے چاٹتا۔ ماسٹر جی خود بھی شوگر کے مریض تھے۔ اس لئے اپنے پاس بسکٹ وغیرہ رکھتے تھے وہ خود بھی کھاتے اور کتے کو بھی کھانے کے لئے دیتے۔ کتا دم ہلا ہلا کر ماسٹر جی کا شکریہ ادا کرتا۔ پھر دونوں واپس گھر لوٹ آتے۔

ایک دن معمول کے مطابق ماسٹر صاحب نے ہسپتال جانے کے لئے اپنی بیوی کو جگانے کے لئے آواز دی کہ بیگم اٹھو ہسپتال کا وقت ہو رہا ہے مگر بیگم کی طرف

Scanned By BooksPK

سے کوئی جواب نہ آیا۔ انہیں کچھ شک گزرا فوراً اس کے بیڈ پر گئے آواز دی، دیکھا کہ وہ تو ابدی نیند سو رہی ہے۔ شاید رات کو سوتے وقت ان کی بیگم کو دل کا دورہ پڑا اور انتقال کر گئی۔

یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا جو ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اس امر کا پہلے ہی اظہار کر رکھا تھا اور یوں بیگم رقیہ بانو لقمہ اجل بنی۔ آناً فاناً مرحومہ کے انتقال کی خبر گلی محلے اور ان کے شاگردوں تک پہنچی اور ان کے عزیز و اقارب نے بھی آنا جانا شروع کر دیا۔ جس گھر میں ایک طرح کا سناٹا تھا اب کہرام سا مچا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب تو محض ایک بت بنے ہوئے تھے۔ بہرکیف مرحومہ کی تجہیز و تکفین کا بندوبست ہوا، نماز جنازہ پڑھانے کے بعد اس کو قریبی قبرستان میں دفنا دیا گیا۔

ماسٹر صاحب نے بیٹے کو اس سانحے کی اطلاع کرنا مناسب نہ سمجھا کہ جس کو ہماری کوئی پروا نہیں ہم کیوں اس کی پروا کریں۔ انہوں نے اپنے عزیز و اقارب کو بھی رفیع کو اطلاع دینے سے منع کر دیا تھا۔

مرحومہ کی وفات کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد امریکہ سے ان کے بیٹے رفیع کا گھر پر فون آیا جو ماسٹر جی نے اٹھایا۔ ہیلو ہیلو کیا اور کہا۔ ابا جان میں رفیع بول رہا ہوں۔ آپ کیسے ہیں، امی کیسی ہیں۔ میں نے آپ لوگوں کے لئے یہاں کے ایک ڈاکٹر سے ٹائم لے لیا ہے اور اس کو فیس بھی ادا کر دی گئی ہے۔ آپ لوگوں کا کیس اپیل میں ہے۔ امید ہے ایک دو مہینوں تک ایجنسی والے آپ سے رابطہ کریں گے۔ اس قسم کی گفتگو ہوتی رہی جواب میں ماسٹر جی نے کہا۔ بیٹا! کیا ضرورت تھی ہمارا وہاں آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہم زندگی کے باقی ماندہ دن یہاں ہی گزارنا چاہتے ہیں۔

"نہیں نہیں ابا جان! آپ لوگ ایک مرتبہ یہاں ضرور آئیں"۔ بیٹے نے اصرار کیا۔ "پھر بے شک واپس چلے جانا۔ دوسرا آپ لوگوں کا علاج معالجہ بھی بہتر اور مناسب ہوگا"۔

"امی جان کیسی ہیں؟" رفیع نے آخر میں باپ سے کہا۔ "ان سے بات کروائیں۔ میں ان کو بھی تاکید کر دیتا ہوں وہ میری بات ضرور مان لیں گی"۔

"لیکن بیٹا! وہ تو ابدی نیند سو گئی ہے۔" ماسٹر جی نے کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا جی!" رفیع نے حیرانگی کے عالم میں پوچھا۔

"ہاں ہاں بیٹا! وہ آرام کر رہی ہیں۔ سو رہی ہیں"۔ ماسٹر جی نے بات بنائی اور کہا۔ "کل رات سے اس کی طبیعت علیل تھی"۔

"اچھا تو یہ بات ہے"۔ رفیع نے سکون کی سانس لے کر کہا۔ "انہیں سونے دیں اور ڈسٹرب نہ کریں۔ اور میرا سلام کہنا اور میرے فون کا کہنا کہ آیا تھا۔ میں پھر ان سے کسی وقت دوبارہ بات کروں گا"۔ اور فون بند کر دیا۔

ماسٹر جی نے بھی بیٹے کو خدا حافظ کہہ کے فون بند کر دیا اور سوچنے لگے کہ اس کو اس کی ماں کی خبر دے دینی چاہئے تھی پھر انہوں نے یہ سمجھ کر بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ماں کی وفات کی خبر سن کر وہ وقتی طور پر ضرور پریشان ہوگا لیکن پھر وہ پاکستان کبھی بھی نہیں آئے گا۔ شاید کبھی اس کے دل میں ماں کی محبت جاگے اور اسے پاکستان آنے پر مجبور کرے۔

جہاں تک رفیع نے کہا تھا کہ وہ فرصت میں دوبارہ ماں کو فون کرے گا اسے بھلا کہاں فرصت تھی کہ وہ دوبارہ ماں کو فون کرتا اور نہ ہی اس نے دوبارہ فون کیا۔ وہ تو وہاں کی رنگینیوں میں صبح و شام اپنی زندگی سے بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

لیکن ماسٹر جی کو بھی اپنی مرحومہ بیوی کی طرح بیٹے کی جدائی کا غم جینے نہیں دے رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

طرزِ عمل پر اکثر سوچتے کہ رفیع تو وہاں تعلیم حاصل کرنے گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر تو ہم سب کو بھول گیا۔ ایسا لگتا ہے ہماری طرف سے کہیں نہ کہیں اس کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی اور کمی واقع ہوئی ہے۔ اسی سوچ و فکر کے ساتھ ماسٹر جی اپنے گھر سے پبلک پارک میں آئے۔ ایک لکڑی کے بوسیدہ سے بنچ پر آ کر بیٹھ گئے۔ پارک میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ لوگ سیر و تفریح کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں کچھ لوگ گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ان کا ساتھی کتا بھی کچھ دیر بعد ماسٹر جی کی بو سونگھتے سونگھتے دُم ہلاتا ان کے قدموں میں آن بیٹھا اور ان کے پاؤں چاٹنے لگا۔ اس وقت ماسٹر صاحب کے پاس پیسے نہ تھے اور نہ ہی کھانے کی کوئی چیز مثلاً بسکٹ وغیرہ۔ کتا اس صورتِ حال کا عادی نہ تھا لہٰذا وہ ماسٹر جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کرتا رہا۔ جس کو ماسٹر جی نہ سمجھ سکے۔ پھر کتے نے جیسے ساری بات سمجھ کر سر ہلایا اور اٹھ کر وہاں سے چپ چاپ ایک طرف چلا گیا۔ پھر تھوڑے ہی وقفے بعد ماسٹر جی کیا دیکھتے ہیں کہ کتا ایک چھوٹا سا پولی تھین بیگ اپنے منہ میں دبائے ان کی طرف آ رہا ہے۔ وہ بیگ کتے نے ماسٹر جی کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس بیگ میں کچھ کھانے کو تھا جو کتا قریب ہی پارک کے باہر پڑے ہوئے ایک کوڑے دان سے اٹھا لایا تھا۔ دراصل کتے کو ماسٹر جی کے بھوکے ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔ ماسٹر جی اپنی سوچوں میں گم صم بیٹھے تھے جب کتے نے ان کی قمیص کھینچ کر انہیں کھانا کھانے کی طرف متوجہ کیا۔ ماسٹر جی بیگ کے اندر کھانا دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ انہیں یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ کتا ان کے لئے کھانا لایا ہے۔ ایک کتے کے دل میں اپنے لئے یہ خلوص پیار اور احساس دیکھ کر ان کا دل جذبات سے لبریز ہو گیا اور آنسوؤں کا ایک سلسلہ ان کی آنکھوں سے بہنے لگا۔ انہوں نے کتے کے سر پہ پیار بھرا ہاتھ رکھ کر اسے ساتھ لگا لیا۔

''کاش! میری کوئی اولاد بھی نہ ہوتی''۔ بے ساختہ ماسٹر جی کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ ''کتنا اچھا ہوتا جو میں یہ کتا ہی پال لیتا''۔

ماسٹر جی بوجھل بوجھل قدموں اور فکر کا ایک وسیع و عریض سمندر اپنے ذہن میں لئے ہوئے گھر آئے اور بغیر کچھ کھائے اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ نیند تو ان کی ایک عرصہ سے روٹھ چکی تھی بس زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ اپنی بیوی کی طرح رات کے کسی وقت ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ کسی کو کچھ خبر نہ تھی کہ ماسٹر جی کا انتقال ہو گیا ہے۔ صبح کے وقت دودھ دینے والا آیا دستک دی، دروازہ بھی کھلا تھا۔ اسے کچھ شک سا گزرا۔ گھر کے اندر داخل ہوا دیکھا ماسٹر جی اپنے بستر پر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ دودھ والے نے گلی محلے کے لوگوں کو ان کی وفات کی خبر دی۔ لوگوں کا آنا جانا شروع ہو گیا اور ان کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے بعد مرحومہ کی قبر کے ساتھ ان کو بھی دفن کر دیا گیا۔

دوسری طرف ان کے بیٹے کو کسی رشتہ دار کے ذریعے یہ خبر مل گئی کہ کچھ عرصہ سے ان کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کے والد نے اسے دانستہ وفات کی خبر نہیں کی۔ رفیع نے باپ سے شکوہ کرنے اور اپنے کنفرم ہونے کے لئے فون پر رابطہ قائم کیا۔ فون کی گھنٹی بجی کسی نے ریسیور اٹھایا۔

''میں رفیع بول رہا ہوں''۔ رفیع نے کہا۔ کوئی عزیز فون پر موجود تھا۔ اس نے فون سنا تھا اور کہا۔ کس سے بات کرنا ہے۔

''ابا جی سے''۔ اس نے کہا۔ ''یعنی ماسٹر مدنی صاحب سے''۔

''لیکن وہ تو آج صبح وفات پا چکے ہیں اور کل ان کے قل شریف ہیں''۔

یہ سنتے ہی رفیع پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور فون کا ریسیور شدتِ غم سے اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس کا سر چکرانے لگا پھر زار و قطار رونے لگا۔ ہائے اللہ سب کچھ لٹ گیا۔ میری ماں مر گئی، اب میرا والد بھی چل بسا۔ میں کتنا بدقسمت ہوں۔ میں ان کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ وہ عمر بھر میری خدمت کرتے رہے، میرے ناز نخرے اٹھاتے رہے۔

رفیع کی بیوی ساتھ والے کمرے میں اپنے میاں کی آہ و بکا سن کر فوراً اپنے میاں کے پاس پہنچی۔ رفیع اس کے ساتھ لپٹ کر رونے لگا۔ اس کی بیوی نے اسے حوصلہ دیا اور صبر کرنے کو کہا کہ یہ پل صراط تو ہر ایک نے ایک نہ ایک دن عبور کرنا ہی ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ رفیع امریکہ کی چکا چوند زندگی اور گیتا کی اداؤں میں ایسا کھویا کہ اسے ماں باپ کے لئے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ وہ ہر روز ارادہ کرتا کہ ماں باپ کو فون کرے گا مگر پھر بھول جاتا۔ اس کی یہ عدیم الفرصتی اس کے ضمیر کا بوجھ بن گئی۔

دراصل رفیع کی آنکھوں سے چھلکنے والے آنسو اصلی نہ تھے بلکہ یہ مگرمچھ کے آنسو تھے۔ رفیع کے والدین نے اس پر کتنے احسانات کئے لیکن اس کے بدلے رفیع نے ان کو کچھ نہ دیا بلکہ انہیں ہر لمحہ ہر گھڑی پریشان رکھا اور وہ غموں کے وسیع سمندر میں ڈوبے رہے بیٹے کی جدائی اور بے وفائی نے ان کو جیتے جی مار ڈالا۔ اس کے باوجود وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی سلامتی اور درازیٔ عمر کے لئے ہر وقت اللہ کے حضور دعا گو رہے۔

اولاد کو چاہئے کہ وہ اپنے والدین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے۔ اگر آپ آبِ حیات پینا چاہیں تو پھر زیادہ سے زیادہ اپنے والدین کی دعائیں لیں۔ والدین کی ہر دعا آبِ حیات ہے۔

شفائی کورس

نئی صحت کورس	5000/- روپے (ایک ماہ)	ہر قسم کے مردانہ امراض کے لئے
دمہ کورس	1500/- روپے (20 دن)	دمے کا شافی علاج
یوری کیور	600/- روپے (10 دن)	یورک ایسڈ کے لئے
فزی فورٹ	1500/- روپے (30 دن)	اعصاب اور پٹھوں کے لئے
بلیک لائن ہیئر آئل	500/- روپے	خشکی سکری گرتے بالوں سے نجات

اولاد نرینہ کورس روحانی اور ادویاتی طریقہ سے اولاد نرینہ کا حصول ممکن ہے۔

ڈاکٹر زیڈ آئی مرزا 0300-4793488 - عارف محمود 0323-4329344

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

تعلقات

میاں بیوی کی بے راہ روی

وجوہات اور علاج

میاں بیوی تھوڑی سی کوشش کریں تو ان کا پیار محبت ہمیشہ قائم رہتا ہے لیکن ناجائز تعلقات بہت جلد نفرت میں بدل جاتے ہیں کیونکہ ان کی بنیاد دھوکے اور مفاد پر مبنی ہوتی ہے۔

☆ -- کے ایچ مجاہد

منطقی:۔ عام مشاہدہ ہے کہ گھر میں اچھی خاصی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی مردوں کے اپنی بیوی سے کہیں کم خوبصورت عورتوں سے چکر چل رہے ہوتے ہیں یا ٹھیک ٹھاک مردوں کے ہوتے ہوئے بھی عورتوں کے دیگر مردوں سے مراسم ہوتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

فلسفی:۔ دیکھو انسان طبعاً تغیر پسند ہے وہ ایک ہی چیز سے اکتا جاتا ہے روز مرغ بھی کھانے کو دل نہیں کرتا بنی اسرائیل تو مقدس آسمانی خوراک من وسلویٰ سے اکتا گئے تھے اور اس کے بدلے سبزی ترکاری طلب کرنے لگے تھے۔ یہ میاں بیوی کے ساتھ شادی کے چند ابتدائی سالوں کے بعد ہوتا ہے آغاز میں تو جذبے اور جنسی ضرورت شدید ہوتی ہے، اس لئے حالات ٹھیک رہتے ہیں رفتہ رفتہ جب ان کی شدت کم ہو جاتی ہے تو مزاج کے تضاد ابھر کر سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں اور میاں بیوی دونوں یا ان میں سے ایک لاپرواہی اختیار کر لیتا ہے یہی وقت ہوتا ہے جب بیرونی عناصر فائدہ اٹھاتے ہیں اس وقت میاں بیوی صرف فریضہ ادا کرتے ہیں ان کے اندر گرم جوشی اور محبت کا فقدان ہوتا ہے اور ایک روٹین بن جانے کے باعث وہ گرم جوشی یا محبت پیدا کرنے کی کوئی خاص کوشش بھی نہیں کرتے تو اس وقت ایسے لوگ جن کا کام ہی ایسے مردوں اور عورتوں کو بہکانا ہوتا ہے وہ بڑے دل کش روپ میں سامنے آتے ہیں۔ مصنوعی اور کاروباری مسکراہٹ اخلاق رکھ رکھاؤ اور محبت دکھاتے ہیں جو کہ میاں بیوی کی حقیقی زندگی سے رخصت ہو چکی ہوتی ہے اس لئے وہ بڑی آسانی سے ان کے جال میں آ جاتے ہیں۔ پیشہ ور عورتیں اس کے بدلے مال کماتی ہیں اور شکاری مرد نت نئی عورتوں کا جنسی استحصال کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو بات بلیک میلنگ تک پہنچ جاتی ہے جس کے نتیجے میں اور بھی کئی مسائل جنم لیتے ہیں۔

منطقی:۔ پھر اس کا حل کیا ہے؟

فلسفی:۔ ہر چیز کا پہلا اور آخری حل اسلام ہی ہے اسلام نے عورت کو مرد کی خاطر بننے سنورنے اور اس کی دلداری کرنے کا حکم دیا اگر عورت اس پر کاربند رہے مرد کبھی اِدھر اُدھر نہ دیکھے اسی طرح مرد کو بھی حکم دیا کہ عورت کی تمام ضروریات پوری کرتے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے اسے محبت اور پیار کے ساتھ ساتھ مقام دے اگر وہ ایسا کرے تو عورت بھی اِدھر اُدھر نہ دیکھے پھر بھی اگر بگاڑ پیدا ہو جائے اور اصلاح احوال کی کوششیں ناکام ہو جائیں تو مرد کے پاس طلاق اور عورت کے پاس خلع کا اختیار موجود ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر عورت ایک خاص مدت کے بعد مرد کی جنسی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہیں رہتی اسی لئے اسلام نے مرد کو حالات، ضرورت اور وسائل کو مدِنظر رکھ کر انصاف کی شرط کے ساتھ چار تک شادیوں کی اجازت دی تاکہ مرد زنا میں مبتلا نہ ہو جائے اس سے ایک طرف تو مرد کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے اور دوسری طرف ایسی عورتیں جن کی کسی وجہ سے شادی نہیں ہو پائی ان کو بھی گھر اور خاوند مل جاتا ہے اور وہ بدکاری سے بچ جاتی ہیں۔

آج کل ہمارے آس پاس جو بدکاری کا سیلاب آیا ہوا ہے اس کی وجہ اسلام کے احکامات پر عمل نہ کرنا ہی ہے۔ پھر اسلام نے غیر محرموں سے اختلاط سے منع کیا اور محرموں سے بھی تنہائی میں اکٹھے ہونے سے منع کیا لیکن ہم اس کا خیال نہیں رکھتے۔ نتیجتاً بدکاری بڑھتی رہی جا رہی ہے اور محرم رشتے داروں سے زنا کے کیس بھی سامنے آ رہے ہیں۔ شادی شدہ لوگ بھی اپنی بیویوں کو دوستوں یا کولیگز سے پردہ نہیں کراتے بلکہ مخلوط محفلوں اور ڈانس پارٹیوں میں شرکت کرتے ہیں۔ اس سے آشنائیاں پیدا ہوتی ہیں اور چونکہ ہر نئی چیز لذیذ محسوس ہوتی ہے یہ آشنائیاں ناجائز تعلقات میں بدل جاتی ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے وفادار نہیں رہتے اور بالآخر سو طرح کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن میں سے گھر ٹوٹنا تو بالکل ایک معمولی سا نتیجہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اسلام کی حد توڑ کر ہم نقصان ہی اٹھائیں گے۔

منطقی:۔ لیکن اب ماحول میں جس قدر بگاڑ آ چکا ہے اس کی اصلاح اتنی آسان نہیں اوپر سے شیطانی میڈیا کی تباہ کاریاں اف توبہ اصلاح کی تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

فلسفی:۔ یہ درست ہے کہ حالات بڑے گھمبیر ہیں اور اصلاح مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اگر میاں بیوی

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

یہ سمجھ لیں کہ ان کے اپنے ساتھی کے پاس بھی تو وہی سب کچھ ہے جو دیگر مردوں یا عورتوں کے پاس ہے اور تھوڑی سی توجہ اپنے اور اپنے ساتھی پر دے لیں تو بیرونی عناصر ان کو بہکانے میں کبھی کامیاب نہ ہوں کیونکہ حلال رشتے میں جو برکت اور لذت ہوتی ہے وہ حرام رشتے میں کبھی نہیں ہوتی۔ میاں بیوی تھوڑی سی کوشش کریں تو ان کا پیار محبت ہمیشہ قائم رہتا ہے لیکن ناجائز تعلقات بہت جلد نفرت میں بدل جاتے ہیں کیونکہ ان کی بنیاد دھوکے اور مفاد پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ جذبات میں شدت اور ایک دوسرے کی پہلی سی جنسی ضرورت نہیں رہتی لیکن اتنے عرصے میں اولاد ہو جاتی ہے ماں ان کی پرورش میں لگ جاتی ہے اور باپ ان کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے زیادہ محنت اور کوشش شروع کر دیتا ہے لیکن اس سب میں وہ عموماً خود کو یا اپنے ساتھی کو بھول جاتے ہیں یہیں سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ ساتھ خود اور اپنے ساتھی پر بھی توجہ دیں کچھ وقت اس کے لئے بھی نکالیں تو گھر کی جنت کبھی جہنم نہ بنے۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا ہے میاں بیوی کی صحت کو زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ تب ان کو بھلے جنسی طور پر ایک دوسرے کی ضرورت رہے یا کم ہو جائے لیکن ایک دوسرے کی توجہ دیکھ بھال اور خدمت کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے اور یہ فطری مراحل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ رکھے ہیں تاکہ کوئی گھر نہ ٹوٹے اور میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہیں چاہے اولاد کی خاطر چاہے ایک دوسرے کی خاطر پھر صبر و قناعت بڑی چیزیں ہیں اگر انسان ان کو اختیار کرے تو کئی مسائل پیدا ہی نہ ہوں۔

منطقی:۔ لیکن عام طور پر عورتیں اکثر ناشکری، زبان درازی، طعنہ زنی، لگائی بجھائی اور سازشیں کرتی ہیں جس سے تعلقات میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے جو بعد میں بڑے مسائل پیدا کر دیتی ہے۔

فلسفی:۔ اصل میں یہ عورت کی فطری کمزوریاں ہیں جن پر وہ مکمل طور پر تو قابو نہیں پا سکتی لیکن اگر کوشش کرے تو ایک حد تک کنٹرول کر سکتی ہے اور گھر ٹوٹنے سے بچ سکتے ہیں لیکن اکثر عورتیں عاقبت نااندیش ہوتی ہیں وہ یہ نہیں سوچتیں کہ ان کی بدتمیزی اور مرد سے زبان درازی کا نتیجہ کتنا غلط نکل سکتا ہے مرد اگر معاملہ فہم اور بُردبار ہو اور طلاق نہ بھی دے تو اس کے دل میں عورت کے لئے نفرت ضرور پیدا ہو جاتی ہے جو کسی بھی تعلق کے ٹوٹنے کی پہلی اینٹ ہوتی ہے۔ عورت اخلاق کا مظاہرہ کرے تو کبھی کوئی گھر نہ ٹوٹے۔

منطقی:۔ لیکن ہمیشہ تلخی کی ذمہ دار عورت تو نہیں ہوتی بعض مرد بھی تو زیادتی کرتے ہیں۔

فلسفی:۔ یہ درست ہے کہ بعض مرد بھی عورت سے ناروا سلوک کرتے ہیں اور ایک حد کے بعد جب عورت کی برداشت ختم ہو جاتی ہے تو عورت بغاوت کر دیتی ہے۔ اس سے پھر بے شمار مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ کوئی سہارا پا کر گھر سے بھاگ بھی سکتی ہے، خلع بھی لے سکتی ہے اور خاوند کو قتل تک کر سکتی ہے۔ اس لئے اسے اس حد تک مجبور نہیں کرنا چاہئے۔

منطقی:۔ طلاق کی عدت کتنی ہوتی ہے؟

فلسفی:۔ از روئے قرآن طلاق کی عدت تین ماہ ہے اور یہ پہلی دو طلاقوں کی ہے اس عرصے کے دوران میاں بیوی بغیر نئے نکاح کے رجوع کر سکتے ہیں اور عدت کے خاتمے پر نئے نکاح سے پھر رشتہ قائم کر سکتے ہیں لیکن تیسری طلاق کے بعد رجوع یا نئے نکاح کی گنجائش نہیں رہتی اور میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے مکمل طور پر حرام ہو جاتے ہیں۔

پنجابی انشائیہ اردو ترجمہ

پگڑی

ارشد میر مرحوم نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں یکساں مہارت سے شاہکار انشائیے تخلیق کیے۔ زیر نظر پنجابی انشائیہ ان کی کتاب ''چونبھڑاں'' سے لیا گیا ہے جسے میں نے اردو کا پیرہن دینے کی اپنی سی کوشش کی ہے اس انشائیے میں بھی ارشد میر مرحوم نے حسب روایت پنجاب کی ایک اہم روایت کے مٹنے کا مرثیہ اپنے انداز میں لکھا ہے —— خادم حسین مجاہد

ارشد میر / خادم حسین مجاہد ---------------- 0300-8826510

ایک زمانہ تھا پگڑی کی بڑی شان ہوا کرتی تھی، پگڑی باندھنے والوں کو خاص عزت دی جاتی تھی۔ روزمرہ زندگی اور محفل میں اس کے گھیراؤ اور لمبائی سے چودھراہٹ کا اندازہ کیا جاتا تھا اور تو اور بغیر پگڑی کے اعتبار تک نہ کیا جاتا تھا۔ منگنی بیاہ پر دو چار پگڑی والے باراتی نظر نہ آتے تو گاؤں بھر میں لعنت ملامت ہونے لگتی حتیٰ کہ دولہے اور شہ بالے کی سج دھج بغیر پگڑی کے نمایاں نہ ہو پاتی۔ اکثر سسرال سے دولہا کو پگڑی پر پگڑی باندھ کر ڈولی کے ساتھ روانہ کیا جاتا تھا۔ پھر دولہا چھوڑ طلباء سے لے کر علماء فضلاء شعراء ادباء اور عوام و خواص میں سے کوئی پل بھر بھی سر سے جدا نہ کرتا کیونکہ ننگے سر گھر سے نکلنا ماتم کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ آج کی بات چھوڑو جب جڑ ہی نہیں کل ہی بگڑا ہوا ہے اور لوگ سر بدھ سے ننگے ہو کر خوار پھرتے ہیں۔ کچھ پگڑی کی جگہ پاؤں سے جوتا اتار کے رکھ لیتے ہیں اور اگر خود اس قابل نہ ہوں تو بیوی جوتا بیزار سے کسر پوری کر دیتی ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ ننگے سر تڑاتڑ پڑنے سے چندیا صاف ہونے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ کبھی پگڑی ہوتی تھی تو جوتے پڑنے کا ڈر نہیں ہوتا تھا اگر کبھی اونچ نیچ ہو بھی جاتی تو پگڑی جھاڑ کر باندھ لی جاتی تھی اور اس طرح سر بھی سلامت رہتا تھا۔ پتہ نہیں دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کا کیا بیڑہ غرق ہوا ہے کہ انہوں نے یا تو پگڑی کو مختصر کر دیا ہے یا بالکل ہی غائب کر دیا ہے۔

کبھی پگڑی کے ناز نخرے اٹھانے مشکل تھے۔ اسے کلف لگایا جاتا ابرق چھڑکا جاتا پھر رنگ میں ڈبو کر اسے سنوارا جاتا۔ کئی شوقین تو گوٹے والے کیسری چھلکے باندھ کر اوپر کلغی بھی لگاتے تھے۔ پہلوان لنگی اور رنگ دار مشہدی باندھ کر جلوس نکالتے اور نعرے لگاتے پھرتے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تھے اور تو اور پنجاب میں کچھ صدیاں پیشتر بعض علاقوں میں مسلمان عورتیں پگڑی باندھتی رہی ہیں۔ بات یہیں تمام نہیں ہو جاتی پگڑی مہاراجوں اور نوابوں کے درباروں کی آن بان اور شان کو بھی ظاہر کرتی تھی۔ مہاراج کی پگڑی میں لاکھوں کروڑوں کے ہیرے جواہرات ٹانکے جاتے جن کی چمک دمک اور پگڑی کی شان وشوکت سے سارے درباریوں کی نظریں نیچی رہتی تھیں۔ درباروں پر ہی کیا موقوف پگڑی پیروں مولویوں اور اماموں کی علمی فضیلت کا پرچار بھی کرتی تھی اور کئی بار ان کے مکروفریب کی چالوں پر بھی روشنی ڈالتی تھی اسی لئے کہتے ہیں جتنے پگڑی کے پیچ اتنے جگ کے پیچ۔ پھر کئی بار پیرخانہ بنا کر چکر چلا کر "بنھ سر تے پگ تے سارے جگ نوں ٹھگ" کا نعرہ مستانہ بھی لگتا رہا۔ اس قسم کی پگڑی نے اصلی پیروں کا نام بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اسی مضمون کو ایک رباعی میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

ویہن وچ حرصاں دے دل ڈبے توں وچ
کھا نہ ظالم پیر دے قبے توں وچ
پیچ وچ جس دی ریا بوجھے وی حرص
پاڑ جیہی دستار نوں، جے توں وچ

اس جیسی کسی پیر، صوفی اور زاہد کی پگڑی جب زیادہ اچھلنا شروع کر دیتی تو کھلتا کہ مے خانے کی حدود شروع ہوگئی ہیں اور اگر کبھی چیتھڑوں پر مشتمل پگڑی زیب سر ہوتی تو لوگ سمجھ جاتے کہ بھائی صاحب رندوں کی کسی محفل کا چکر لگا کر آ رہے ہیں۔ پگڑی میخانے میں ہی نہیں میلے وغیرہ میں بھی مرکزی حیثیت کی مالک ہوتی تھی جہاں یہ سر سے پاؤں تک لنگ کے لڈی بھنگڑا ڈالنے والوں کے ساتھ ساتھ رقص کرتی جاتی تھی اور جیتے ہوئے پہلوان کے یار دوستوں اور قدردان فن سے سلامیاں وصول کر لیتی تھی۔

پگڑی کی شان کہاں کہاں گنائیں تقسیم ملک سے قبل پولیس کا ایک سپاہی سر پر رکھی لال پیچوں اور نیلی پٹی والی پگڑی سے پورا گاؤں محکوم کر لیتا تھا اور غریب کیا وڈیرے بھی خدا سے زیادہ پولیس سے ڈرتے تھے لیکن اب پولیس نے اوپر تلے اپنا جلوس نکال کر اپنا رعب داب خود ختم کر لیا ہے۔ اس کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار لی ہے کہ انہوں نے برسوں کی مستعمل، بارعب اور امن پسند پگڑی کو بلاوجہ دھتکار دیا ہے اور اس کی جگہ ایسی بے رونق سی چنا جور گرم بیچنے والوں جیسی ٹوپی رکھ لی شاید سرکاری مجبوریوں نے ان کی لٹیا ڈبوئی ہے کہ انہوں نے بادل نخواستہ یہ ٹوپی پسند کر لی ہے جسے اکثر اچھا بھلا گھبرو جوان پہن کر ٹین کا سپاہی اور کاغذ کا یاد الگتا ہے۔ اس ٹوپی سے کبھی کبھار نقلی چوکیدار کا بھی احتمال ہوتا ہے۔ کبھی اگر ہوا کا تیز جھونکا آ جائے تو وہ ٹوپی کو اڑا لے جاتا ہے اور سپاہی میاں اپنی عزت آبرو کی خاطر اس کے پیچھے بھاگ کر تھک جاتے ہیں لیکن ٹوپی اتنے میں کہیں کوڑے کرکٹ میں مل چکی ہوتی ہے۔

قربان جائیں پولیس کی اس پگڑی کے جس کی شرفاء سے لے کر چور اچکے اور اشتہاری ملزم تک تاب نہ لا سکتے تھے اور اس کے بل پر ایک مریل سپاہی بھی اچھے خاصے موٹے تازے بدمعاش کو ایک ہی جھپٹ میں قدموں میں ڈال لیتا تھا۔ اب حال یہ ہے کہ پولیس چوکی کے سامنے ہلا گلا ہوتا ہے۔ سنتری بادشاہ باہر نکلنے کی بجائے بیرکوں میں گھس جاتے ہیں۔ اگر کوئی ہم سے پوچھے تو ہم پولیس کی ٹوپی سے زیادہ حقے کی ٹوپی کی شان سمجھتے ہیں جس کے سہارے اب بھی دو چار نفوس مل بیٹھتے ہیں اور جو چوپال سے لے کر صف ماتم تک میں دخیل ہے۔

وقت وقت کی بات ہے کبھی سجا سنوار کر پگڑی باندھنا بھی ایک آرٹ کا درجہ رکھتا تھا۔ ہما شما تو اس کا شملہ ہی نہ نکال سکتا تھا۔ سرمہ ڈالنا تو ہر کسی کو آتا ہے پر

آنکھ مٹکانا کسی کسی کو آتا ہے۔ پگڑی باندھنے کے ماہر ایسی ایسی کمال کی پگڑی باندھتے تھے کہ کمزور چوہا بھی ببر شیر لگتا تھا۔

جیسے گیدڑ کی موت آتی ہو تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے اسی طرح قوموں کا بیڑہ غرق ہونا ہو تو وہ اپنی تہذیب ثقافت اور روایات سے منہ موڑ لیتی ہیں۔ ہماری بھیڑ چال قوم نے بھی دیکھا دیکھی پگڑی جیسے نفیس بڑھیا اور ہزاروں برس پرانے لباس کو اتار پھینکا ہے۔

ہماری نئی نسل کے آسودہ اور نازک مزاج لڑکے بالے مغرور اور جدت پسند قسم کے لوگ پگڑی باندھنے والوں کو یوں دیکھتے ہیں جیسے کچا ہی چبا جائیں گے۔ اگر کوئی خالص دیہاتی شہر میں آ گھسے تو اکثر بازار میں چلتے ہوئے اس کے پلو یا پگڑی میں کوئی لڑکا بکسوایا پچھلی پگڑ لے کا کانٹا ٹانک دیتا ہے۔ اس کے ساتھ دھاگہ ہوتا ہے جسے چوبارے پر موجود دوسرا لڑکا اوپر کھینچ لیتا ہے اور پگڑی والا ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ اردگرد جمع لڑکے تالیاں بجاتے پھرتے ہیں اگر ایسی حرکت نہ کریں تو پھر بھی اکثر پگڑی باندھنے والوں کا جگتوں سے مذاق اڑتا رہتا ہے۔ اسی لئے لوگ اب پگڑی سے یوں ڈرتے ہیں جیسے غلیل سے کوا۔ لے دے کر کوئی پرانے خیالات کا مالک یا رسموں کا شوقین بڑا معرکہ سر کر لے تو شادی والے دن لڑکے کو کچھ دیر کے لئے پگڑی بندھا لیتا ہے کیونکہ ہار سہرے کے شگن اس کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ اتنی دیر میں بھی کئی ماڈرن نوجوانوں کا سر چکرا جاتا ہے اور وہ رسم پوری ہوتے ہی پگڑی اتار کے گھٹنوں پر لٹکا لیتے ہیں۔

اگر ذرا سوچیں کہ پگڑی کے ساتھ کیا ہوا اور کیسے ہوا تو اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ ٹوپی کے رواج سے پگڑی کا ستیاناس ہوا ہوگا کیونکہ ایک تو ویسے ہی اس کی دوسرے باندھنے اور ہر بار کلف لگانے کی مصیبت سے چھٹکارا۔ تھان سے کم پگڑی باندھنے کا نام نہ لیتے تھے چاہے کسی وقت گردن کو بل پڑ جائے یا غریب کا منکا ہی ٹوٹ جائے۔

اس گئے گزرے زمانے میں اگر اب بھی اجداد کی عزت کی خاطر کسی نے پگڑی کو سینے سے لگا رکھا ہے تو وہ سکھوں کی خالص قوم اور جاگیرداری دور کے یادگار۔ چیف کالج لاہور کے لڑکے بالے ہیں۔ سکھ قوم کے قربان جائیں جنہوں نے اسے پانچ کافوں کے قریب درجہ دے رکھا ہے اور کسی قیمت پر بھی اسے پگڑی کی جدائی نہیں بھاتی۔ ابھی پچھلے دنوں اخبارات میں ایک مزے کی خبر دیکھی تھی کہ امریکہ کی فوجی عدالت نے دو سکھوں کو پگڑی نہ اتارنے کے جرم میں دو دو ماہ قید کی سزا سنائی۔ جب عشق صادق ہو تو پھر سزا چھوڑ لوگ پھانسی کا جھولا جھولنے سے باز نہیں آتے۔ پگڑی کے لئے اتنی قربانی دے کر بھی بھلے یہ بات علیحدہ کہ کچھ شرپسند یہ کہتے بھی پائے جاتے ہیں کہ سکھ پگڑی سے کیوں پیار نہ کریں۔ جب کوہ نور ہیرے کے مالک بن بیٹھے جو استادی طریقے سے بھائی چارے کی آڑ میں پگڑی بدل بھائی بن کر پہلے نادر شاہ نے محمد شاہ رنگیلے سے لیا اور بعد میں یہی نسخہ آزما کے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع سے ہتھیا لیا۔ سکھوں کو پتہ ہے کہ تاریخ کبھی نہ کبھی اپنے آپ کو دہراتی ہے اس لئے شاید پھر ان کو ایسا موقع مل جائے۔ اسی طرح چیف کالج والوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت تصنع پسند ہیں اور اپنی ڈفلی الگ بجانے پر ایمان رکھتے ہیں اگر ان کا پگڑی سے سچا پیار ہو تو وہ پڑھائی کے بعد اسے کیوں پھینک دیں حالانکہ جب پگڑی باندھ کے لیفٹ رائٹ یا گھڑ سواری کرتے ہیں تو ان کا منفرد اور بھیلا رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ دوسری تقریبات میں بھی پگڑی کے سہارے ان کی فوراً پہچان ہو جاتی ہے۔ نیتوں کا حال تو خدا جانتا ہے بظاہر تو پگڑی کے اصل پجاری یہی لگتے ہیں۔

اب حقہ بمقدار چلم اور شملہ بمقدار علم کا رواج تو

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

نہیں رہا نہ ہی ڈگریاں دیتے وقت یا انعام واکرام کے وقت ان کی طرف دھیان دیا جاتا ہے پھر بھی رہی سہی نشانی کے طور پر ہی سہی مشاعروں میں خلیفہ بناتے وقت یا استاد بنانے کے لئے دستار بندی کی تھوڑی سی رقم نظر آ جاتی ہے۔ شاید لوگوں کی عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے اور وہ اس کے فائدے بھی بھلا چکے ہیں جو کہ لاتعداد تھے مثلاً پگڑی سے گنج بالکل ہی چھپ جاتا تھا اور اوجھڑی سے ملتی جلتی وگ کا جھنجٹ نہیں پالنا پڑتا تھا۔ دلبرداشتہ آدمی آسانی سے چھت سے لٹکا کر پھندہ لے کر آزاد ہو جاتا تھا۔ سن سٹروک سے حفاظت کے لئے مجرب نسخہ تھا کیونکہ سر ویسے ہی ائرکنڈیشنڈ ہو جاتا تھا اور پگڑی کا پلو گردن کا محافظ بن جاتا تھا۔ کنوؤں نہروں اور دریاؤں میں ڈوبتے لوگوں کو پگڑی پھینک کر کھینچ لیا جاتا تھا پھر چوٹ زخم اور حقے کی چلم کے لئے اس کا پلو بڑا کارآمد تھا اور تو اور چور حضرات پگڑی کے ذریعے چھت پر پہنچ جاتے اور پھر صفایا کر کے اطمینان سے اتر آتے تھے۔ اگر کسی وقت زیادہ خطرہ ہوتا تو وہ پگڑی سے گھر والوں کی مشکیں کس کے نو دو گیارہ ہو جاتے۔ کبھی تھانے میں ہتھکڑیوں کی کمی ہوتی تو پولیس سارا گاؤں پگڑیوں سے باندھ لاتی۔ یہی پگڑی سوتے وقت سرہانے کا کام بھی دیتی تھی اور کبھی کسی جنگل بیابان میں پیاس لگ جاتی تو کسی کنوئیں وغیرہ میں پگڑی کا پلو بھگو کر منہ کھول کر اندر پانی نچوڑ لیتے۔ یہی نہیں اس کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے بندہ آسانی سے دنیاداری کا بوجھ اٹھانے کے قابل بھی ہو جاتا تھا۔ درویش اور صوفی شب بیداری کے لئے پگڑی کو گرہیں دے کر کمر کے گرد لپیٹ لیتے تھے جن کی چبھن سے وہ نیند بھگانے کی عادت بناتے تھے۔ پھر پگڑی رکھ کر کچھ بھی چکھا جا سکتا تھا اور بغیر تحریری دستاویز کے پگڑی کو گروی رکھ کر مہاجن مال چھوڑ دیتے تھے۔ اس طرح پنجاب کے کئی وڈیروں کی پگڑیاں گروی پڑی ہوئی تھیں اور وہ مزے کرتے اور داد عیش دیتے پھرتے تھے۔

پگڑی نے بہت سوں کو چکر بھی دیئے ہیں اور چاہے لوگوں نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھامے بھی رکھا پھر بھی جب اترنے پر آئی تو پل میں اتر گئی ہے جیسے عشق کی ماری ہوئی نئی نسل کو دیکھیں تو وارث شاہ کا مصرع یاد آتا ہے:

یارو! چڑھی ہنیری عشق والی اُڈ شرم حیا دی پگ گئی

ویسے اس کی عزت بھی ہمیشہ خدا کے ہاتھ رہی ہے۔ نئی نسل نے اسے چھوڑ کے اپنا ہی کچھ گنوایا ہے ورنہ عقل والے اس سے کئی فائدے اٹھاتے ہیں۔ آج کل تحریری اور زبانی معافی کا بڑا رواج چل پڑا ہے۔ لوگ محفل میں ڈھیٹ ہو کر نظریں نیچی کر کے معافی مانگتے ہیں یا لکھ کر دے دیتے ہیں۔ کئی بار اخبار میں شائع ہوتے اور وکیل کے نوٹس بھیجنے تک نوبت آ جاتی ہے۔ جب پگڑی کا رواج تھا لوگ بذات خود مخالفت کے گھر جا کر پگڑی پیروں میں پھینک کر معافی مانگ لیتے تھے اور دوسروں کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔

پگڑی کا رواج کم ہونے سے گاؤں کی معاشرت پر بڑا اثر پڑا ہے جو اس کے لئے کمر توڑ ثابت ہوا ہے کئی سیانوں نے چیخ چیخ کر دہائی دی پگڑی سنبھال جٹا۔ اسے بہت کہا گیا پگڑی رکھ کر کھیر اور حلوہ کھایا جاتا ہے لیکن جب جٹ غصے میں تھا۔ مصنوعی شان وشوکت اور پگڑی کا شملہ اونچا رکھنے کے لئے اندھا دھند ادھار کھاتے کھولے رکھتا تھا اور اس طرح شملہ اونچا رکھنے کی تدبیریں کرتے کرتے پگڑی سر سے گلے میں اور گلے سے پاؤں میں آ گری۔ آپ کو یہ علم ہوگا کہ ایک بار گھونسلے سے گرا بچہ پھر کبھی گھونسلے میں نہیں نکلتا اور......

محفلیں پرت نہ آئے ڈٹھے لتھیاں پگاں والے

(بے عزت ہونے والے دوبارہ محفل میں آتے نہیں دیکھے)

کچھ مویشی چور خاندانوں میں جدی پشتی رواج ہے کہ لڑکا جوان ہو کر جب تک اپنے ہاتھوں مویشی نہ چرائے پگڑی نہیں باندھ سکتا اور شرط پوری کرلے تو جشن منا کر اس کی دستار بندی کی جاتی ہے۔ اسی طرح تقسیم ہندوستان کے بعد پاسپورٹ پگڑی کا چکر چلا تھا۔ جب لوگ ہندوستانی پاسپورٹ بنوا کر دوپٹے خریدنے بھارت جاتے تھے اور واپسی میں بارڈر پار کرتے وقت انہی دوپٹوں کی پگڑی باندھ لی جاتی تھی جو آدمی کے ساتھ سرحد پار کر آتی تھی۔

رنگوں کے ساتھ بڑا جوڑ نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کو سفید سبز خاکی، بادامی، آسمانی، لہریا، کیسری، سیاہ، ننی، جوگیا، نیلی، پیلی، کاسنی، آتشی گلابی، سلیٹی، دارچینی، شنگرفی، زہر موہریا، طوطیا، نسواری، جامنی، تربوزی اور مزید کئی رنگ برنگی پگڑیوں کے نمونے نظر آئیں گے۔

بہت سے علاقوں اور قوموں کی نسبت سے بھی پگڑیاں مشہور ہوئیں جیسے راجستھانی اور مارواڑی، پٹیالوی اور مدراسی، لاہوری اور پشاوری، جہلمی اور گجراتی، کالے شاہی اور قصوری، پوٹھوہاری اور ماجھی، ملوئی اور گوجری، دیہاتی، شہری، پلسی، فوجی، مولویانی، پنڈتانی، سکھ شاہی اور کوکے والیاں کئی پگڑیاں نظر آتی ہیں۔

پنجاب کے لوک گیتوں میں بہنوں کو بھائیوں پر والدین سے بڑھ کر مان رہا ہے اور انہوں نے ہر وقت اور ہر جگہ بھائیوں کا ذکر ضرور کیا ہے۔ ان کے گیتوں میں پگڑی کا مضمون بھی بھائیوں کے ذکر کے ساتھ کئی طرح کا ملتا ہے۔

کنگھی کلیر دی پگ میرے ویر دی
دوپٹہ میرے بھائی دا فتے منہ جوائی دا

ایک دو اور دلچسپ اور رس بھرے بول بیوی کی طرف سے خاوند کے لئے دیکھیں جن میں پگڑی کے چیچ

AL-KAWTHER
الکوثر
• واشنگ مشین • ڈرائیر • روم ائرکولر • گیزر
سب سے اچھی ہے
Environment Friendly
حمید الیکٹرک انڈسٹری
+92-55-3894638 +92-55-3894636-7
e-mail: info@unitedwash.com

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

کے واسطے سے پیار چھلک چھلک جاتا ہے۔

سوہے وے چیرے والیا! میں کتنی آں
کر چھتری دی چھاں میں چھانویں حتنی آں
توڑ گھا تیری پگ وچ دیواں تیتھوں کون سوایا اے
اک واری آ سجنا! مینوں تیریاں تاہنگاں نی
وے چیرے والیا! مینوں تیریاں تاہنگاں نی

یہ تو نرالی اور گئی گزری پگڑیوں کا ذکر تھا جن سے نئی نسل یہ بہانہ کر کے کہ پگڑی ہر جگہ کو بھنگڑ خانہ ہی سمجھ بیٹھی ہے۔ پگڑی سے جان چھڑا رہی ہے مگر پھر بھی اس کے لاشعور میں پگڑی کے لئے بہت پیار اور محبت ہے۔ اسی لئے اس سر کی پگڑی کو چھوڑ کر بھی اس کے پیار کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ایک اور پگڑی کے ساتھ آنکھیں ملائی ہیں جس کے ساتھ وہ دیوی کے درشن کے ساتھ ساتھ بیوپار بھی کر رہی ہے۔ اس پگڑی کو وہ مکانوں اور دکانوں کے قبضے کے واسطے مفت میں کھینچ کھانچ لیتی ہے مکان دکان کا کرایہ سو روپے اور قبضہ دینے کے ہزاروں کما لیتی ہے۔ اب تو کھلم کھلا یہ بیوپار چل پڑا ہے جس سے دن میں لاکھوں کا ہیر پھیر ہو جاتا ہے۔

شروع شروع میں جب پگڑی کے اس نمونے کی عام شناسائی نہیں تھی ایک بھولا بھالا کراچی دکان لینے گیا۔ سیٹھ جی نے پگڑی مانگی اس بھولے نے فوراً بڑھیا ململ کا تھان خریدا اور آ پہنچا۔ کہنے لگا ”لو سرکار! ایک چھوڑ کئی پگڑیاں بنائیں اور برتیں ہم آئندہ بھی خدمت کرتے رہیں گے“۔

یہ بھی سنا ہے کہ کراچی بندر روڈ اور فریئر ہال کے مغربی طرف ایک پگڑی مسجد بھی بنائی گئی ہے جس کی پگڑی دکان دینے کے وعدے پر پہلے وصول کر لی جاتی۔ ساری مسجد اور اس کی دکانیں اسی طرح پگڑیوں کی پیشگی رقمیں وصول کر کے ان سے ہی بنائی گئی تھیں۔ کہتے ہیں یہ پگڑی ایسی خوشحالی لائی ہے کہ جس سے بہت سوں کی پشتیں سنور گئی ہیں اور جدی پشتی غربی ختم ہو گئی ہے۔

اسی طرح پگڑی کی ایک اور قسم بھی سیاسی حلقے میں زور پکڑ گئی ہے۔ جو ملکی غداری اور ڈپلومیسی کے بدلے باندھی جاتی ہے۔ جیسے بنگلہ دیش کے لئے مجیب کو بھارت اور روس کی طرف سے اور اسرائیل کو بیت المقدس کے لئے امریکہ کی طرف سے بندھائی گئی ہے لیکن یہ نقلی پگڑیاں ہیں چاہے انہوں نے کئی گھروں اور ملکوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے یہ اصل پگڑیاں نہیں بن سکتیں نہ ہی بن سکیں گی۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پنجاب میں پگڑی کی ایک خاندان کے اتحاد کی وجہ سے کچھ بچی ہوئی ہے جو کھاتا پیتا خاندان ”پگاں والا“ کہلاتا ہے۔

عام اور بھائیوں کی سانجھی پگڑیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے لیکن پگڑی اتار پھینکنے کی آج بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ پگڑی اتارنے کی بسم اللہ شریف لیڈروں کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی رہی اور ساتھ ہی قومی بیان باز اس پگڑی کو مضبوط ہاتھوں سے روندتے رہے۔

استادوں نے پگڑی بتاشے کی رسم ختم کرنے کی حماقت کی تو شاگردوں کا شرم لحاظ بھی لد گیا۔ انہوں نے پگڑی سے مشکیں کس کے استاد کو ایک طرف ڈال دیا۔ نئی نسل نے اندھیر مچایا اور باپ کے مرنے پر بیٹے کی دستار بندی کی رسم کو مصیبت سمجھ کر ختم کرا دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لڑکوں نے بھی باپ کی یاد بھلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

قصہ مختصر یہ کہ پگڑی کے ساتھ وہ کچھ ہو گیا ہے کہ وہ مستقبل میں بھی رواج پاتی نظر نہیں آتی اس لئے یادگار کے طور پر آخری بار کا میوہ سمجھ کر اسے ایک الوداعی پارٹی ضرور دے دیں تاکہ مستقبل کا مؤرخ ہماری مجلسی عزت و آبرو کے خاتمے کا کچھ تو ذکر کر سکے۔

جہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں

”ہمارے ہاں کون نہیں آتا۔ جیل سے نکل کے جو آتے ہیں وہ بھی ہمارے ہاں آتے ہیں اور ہم نے انہیں بھی اپنے ہاں دیکھا ہے جو جج کر کے آئے تھے۔ ہماری دنیا ننگی ہے حضور! انسان ہمارے کوٹھوں پر ہی آ کر ننگا ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کی اصلیت دیکھنی ہو تو ہمارے ہاں آ کر دیکھیں“۔

احمد یار خان

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بارات

بہت عرصے بعد تفتیش اور تھانے سے نجات ملی۔ اعصاب تھکے ہوئے تھے، دماغ دکھ رہا تھا۔ یہ بات میرے لئے دوا کا اثر رکھتی تھی۔ مجھے بتا گیا تھا کہ جہاں بارات جارہی ہے وہاں رات کو قوالی ہوگی اور دلی کی ایک گانے والی کا مجرا بھی ہوگا۔ میں تو فراغت کو ترس رہا تھا مگر بارات کے ساتھ دلہن کے گھر پہنچے تو ایک کی بجائے دو قتل ہو گئے۔ قوالی اور مجرا دھرا رہ گیا اور ساری رات قاتلوں کے پیچھے دوڑتے گزر گئی۔ وہ تھانہ میرا نہیں تھا لیکن مجھے تفتیش اور تعاقب میں پورا پورا ساتھ دینا پڑا۔

بارات ایک مسلمان جاگیردار کے بیٹے کی تھی۔ یہ جاگیردار انگریزوں کا پروردہ تھا۔ اس کے دو بیٹے فوج میں تھے، ایک کیپٹن دوسرا لیفٹیننٹ۔ وہ جہاں کا رہنے والا تھا میں وہاں کے تھانے کا ایس ایچ او رہ چکا تھا۔ اس دوران اس جاگیردار کے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ اب میں تیس میل دور ایک تھانے میں چلا گیا تھا۔ جاگیردار نے ایک آدمی کے ذریعے پیغام بھیجا کہ میں بارات کے ساتھ ضرور چلوں۔ ایک تو دوستی ایسی تھی کہ میں ٹال نہ سکا اور ٹال نہ سکنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے تفریح اور ذرا سی فراغت کی ضرورت تھی۔

میں اُس کے ہاں چلا گیا۔ اُس کے جس بیٹے کی شادی ہو رہی تھی وہ اوباش اور عیاش نوجوان تھا۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا میں اُسے دولہا ہی کہوں گا۔ وہ شادی سے پہلے بھی دولہا ہی بنا رہتا تھا۔ میں اس کے باپ سے کہا کرتا تھا کہ اسے بھی فوج میں کمیشن دلا دو یا اس کی شادی کر دو۔ وہ اکثر دلی جاتا رہتا تھا۔ وہ صرف عیش و عشرت کے لئے جاتا تھا۔ اس کے باپ کے پاس زمین اور دولت کا کچھ حساب نہ تھا۔ وہ میری بات نہ سمجھ سکا۔ ہم جسے شہزادہ کہا کرتے ہیں اسے ہندو راجکمار کہتے ہیں۔ باپ اپنے بیٹے کو بڑے فخر سے راجکمار کہا کرتا تھا۔

راجکمار مہاراجوں کے اُن بیٹوں کو کہا کرتے تھے جنہیں مہاراجوں کا جانشین بننا ہوتا تھا۔ اس مسلمان جاگیردار پر چونکہ انگریزوں اور ہندوؤں کا اثر زیادہ تھا اس لئے بیٹے کو شہزادہ کی بجائے راجکمار کہتا تھا۔

باپ کو آخر خیال آ گیا۔ اُس نے اپنے راجکمار کے لئے اپنے جیسے ایک جاگیردار کی بیٹی کے ساتھ رشتہ طے کر لیا۔ لڑکی والے چالیس میل دور رہتے تھے۔ وہ گاؤں تھا اور اس گاؤں پر لڑکی کے باپ کی حکمرانی تھی۔ وہ بھی انگریزوں کا منظورِ نظر تھا۔ بارات کو رات وہاں ٹھہرنا تھا۔ آج کل بارات کو فوراً چھٹی دے دی جاتی ہے۔ رات رکھنے کا رواج کم ہو گیا ہے۔ اُس زمانے میں بارات کو رات نہ رکھنا اپنی اور لڑکے والوں کی توہین سمجھا جاتا تھا۔ یہ لوگ تو روپے پیسے والے تھے۔ بارات کئی راتیں رکھ سکتے تھے۔

بارات پانچ بسوں پر گئی۔ بسوں کی چھتوں پر بھی باراتی سوار تھے۔ اُس دور میں بسوں کی یہ افراط نہیں تھی جو آج ہے۔ چونکہ جاگیردار دولت مند تھا اس لئے اُس نے دلی سے بسوں کا انتظام کر لیا تھا۔ لڑکی والوں کے گاؤں پہنچے تو سارا گاؤں دلہن بنا ہوا تھا۔ میں نے ایسی رونق شاید ہی کسی شادی پر دیکھی ہو گی۔ دونوں فریق دولت اور جاگیرداری کی خوب نمائش کر رہے تھے۔ نئی چیز یہ دیکھی کہ لڑکی والوں نے قوالی اور مجرے کا انتظام رکھا تھا۔ بھانڈوں اور نٹوں کے تماشے کا بھی اہتمام تھا۔

ایک گیت، دو غزلیں اور قتل

نکاح ہو گیا، بھانڈوں اور نٹوں نے خوب رونق کی۔ قوال آ چکے تھے۔ گانے والی شام سے ذرا پہلے آئی۔ وہ دلی کے اجمیری گیٹ کی دنیا کی باسی تھی۔ یہ طوائفوں کا بازار تھا جہاں ناچنے اور گانے والیاں بھی کاروبار کرتی تھیں۔ ان میں اونچے درجے کی بھی

تھیں، درمیانہ درجے کی اور بالکل تھرڈ کلاس بھی ہوتی تھیں جنہیں لوگ بیاہ شادیوں پر لے جایا کرتے تھے۔ قمر بائی درمیانہ درجے کی ایک گمنام سی گانے والی تھی۔ وہ جوانی کی عمر میں تھی اور بہت خوبصورت تھی۔ اُس کے جسم میں عجیب سی کشش تھی جو کسر رہ جاتی تھی وہ ناز و انداز اور مسکراہٹ سے پوری کر لیتی تھی۔

میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی حُسن کا شاہکار تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کا گانا بھی اس کے حُسن و جوانی جیسا ہوگا مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ اس نے ایک گیت اور دو غزلیں سنائیں۔ اس کی آواز واجبی سی تھی۔ لوگوں نے اُس پر روپوں کا مینہ برسا دیا۔ یہ ویلیں دکھاوے کے لئے دی جارہی تھیں جیسا کہ آپ اکثر شادیوں میں دیکھا کرتے ہیں۔ دولہا تھوڑی دیر بعد پانچ روپے کا نوٹ نکالتا، ہوا میں لہراتا اور قمر بائی نازک سے پودے کی ڈالی کی طرح جھومتی لہراتی آتی اور طلسماتی سی مسکراہٹ سے نوٹ لے کر چلی جاتی۔ دولہا کا باپ اور دلہن کا باپ بھی اسی طرح نوٹ پہ نوٹ پھینک رہے تھے۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ اُس دور کا پانچ روپے کا نوٹ آج کے سو روپے کے برابر تھا۔

قمر بائی کی نائکہ نے (جو گانے والیوں کے ساتھ ہوا کرتی ہے) کہا کہ بائی ذرا آرام کر لیں۔ گاتے گاتے اور اٹھ اٹھ کر ویلیں وصول کر کر کے تھک گئی ہیں۔ چنانچہ طے ہوا کہ قوالی شروع کر دی جائے اور اس کے بعد قمر بائی گانا سنائے گی اور رقص بھی کرے گی۔

قمر بائی اپنی نائکہ اور سازندوں کے ساتھ محفل سے اٹھ کر چلی گئی۔ اُس کے لئے الگ کمرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ قوالوں نے محفل جمائی۔ میں نے دیکھا کہ قمر بائی کی نائکہ اور سازندے قوالی سننے کے لئے آ گئے۔ قوالی ابھی شروع ہوئی تھی کہ کسی آدمی نے لڑکی کے باپ کے کان میں کچھ کہا۔ اتفاق سے میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے لڑکی کے باپ کو چونکتے اور گھبرا کر اٹھتے دیکھا۔ اس نے دولہا کے باپ کے کان میں کچھ کہا۔ وہ بھی گھبرا کر اٹھا اور مہمانوں کو دیکھا۔ اُس کی نظر مجھ پر پڑی تو دوڑا آیا۔

''ملک صاحب!'' اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''قمر بائی قتل ہو گئی ہے''۔

میرا ذہن محفل موسیقی سے اچھل کر تھانے جا پہنچا جیسے تھانے میں کوئی مجھے قتل کی رپورٹ دے رہا ہو۔ مجھے اطمینان صرف اتنا ہوا کہ وہ تھانہ میرا نہیں تھا اور یہ کیس بھی میرا نہیں تھا لیکن تھانیدار ہوتے ہوئے میں اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ اس تھانے کا ایس ایچ او ایک ہندو سب انسپکٹر راجیش نندہ تھا۔ خوبصورت جوان اور بہت قابل پولیس آفیسر تھا۔ دماغ کا تیز اور جسم کا پھرتیلا تھا۔ وہ اُن آدمیوں میں سے تھا جو آج کا کام کل پر ملتوی کرنے کی بجائے کل کے کام بھی آج ہی کر لیا کرتے ہیں۔ بڑے امیر باپ کا بیٹا تھا اس لئے اس میں لالچ کم تھا۔ اس نے رشوت کا ریٹ اتنا اونچا مقرر کر رکھا تھا کہ ہر کوئی اس سے اپنا کام نہیں کرا سکتا تھا۔ اس کا مطالبہ کوئی جاگیردار یا ٹھیکیدار ہی پورا کر سکتا تھا۔

راجیش لڑکی والوں کی طرف سے مدعو تھا۔ وہ عام ہندوؤں سے مختلف آدمی تھا۔ اس نے کھانا ہمارے ساتھ کھایا اور بڑے مزے سے گوشت کھاتا رہا تھا۔ وہ تنگ نظر نہیں تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھا تھا۔ دولہا کے باپ نے مجھے کہا کہ قمر بائی قتل ہو گئی ہے تو راجیش مجھ سے پہلے اٹھا اور پوچھا۔ ''کہاں؟''

تحصیلدار بھی مارا گیا

قوالی روک دی گئی۔ لڑکی اور لڑکے کے باپ حویلی کی طرف دوڑے۔ میں اور راجیش ان کے ساتھ گئے۔ دولہا بھی اٹھ دوڑا۔ ذرا سی دیر میں ہڑبونگ مچ گئی۔ دھماکے کی طرح خبر لوگوں میں پھیل گئی کہ گانے والی قتل ہو

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

گئی ہے۔ وہاں لوگ تھوڑے نہیں تھے۔ دور دور سے تماشائی آئے ہوئے تھے۔ وہ سب حویلی پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے لئے گانے والی کے گانے کی نسبت اس کے قتل کا تماشہ زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔ اس ہجوم پر قابو پانا ناممکن تھا۔

حویلی وسیع و عریض تھی۔ ایک طرف باغیچہ سا تھا جس کے دو طرف دیوار تھی اور دو طرف برآمدے اور کمرے تھے۔ یہ مہمانوں کے لئے تھے۔ قمر بائی اور قوالوں کو انہی کمروں میں سے کمرے دیئے گئے تھے۔ میں اور راجیش جب اس حصے کے دروازے میں داخل ہوئے تو لوگ ہمارے راستے میں آ رہے تھے۔ کسی کی راہنمائی میں ہم اُس کمرے میں پہنچے جہاں فرش پر قمر بائی کی لاش پڑی تھی۔ خون اتنا کہ دروازے تک آ گیا تھا۔

میں نے اور راجیش نے لاش کو پیٹھ کے بل کیا۔ پیٹ چاک تھا اور انتڑیاں وغیرہ باہر آ کر بکھر گئی تھیں۔ ایک زخم دل کے مقام پر تھا۔ خنجر یا چاقو استعمال کیا گیا تھا۔ ہم دونوں نے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ حسین مغنیہ اُسی لباس میں تھی جو پہنے ہوئے اس نے گانے سنائے تھے۔ لباس پھٹا ہوا یا اترا ہوا نہیں تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُسے صرف قتل کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے اس کے ساتھ کوئی اور زیادتی یا چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی۔ اس کے گلے میں قیمتی ہار تھا۔ انگلیوں میں سونے کی دو انگوٹھیاں، کانوں میں سونے کے جھمکے اور کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں۔ ہر ایک چیز جسم پر موجود تھی۔ پلنگ پر اُس کا پرس پڑا تھا۔ کھول کر دیکھا نوٹوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ ویلوں کی رقم تھی۔

”عداوت یا رقابت“۔ راجیش نے کہا۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ یہ بات صاف تھی کہ قاتل کو مقتولہ کے نہ حسن و جوانی کے ساتھ کوئی دلچسپی تھی نہ اُس کے زیورات اور رقم کے ساتھ۔ وہ اُسے قتل کرنے آیا تھا، قتل کر گیا۔ یہ بھی واضح تھا کہ قاتل بہت دلیر تھا یا کوئی اس حویلی کا رہنے والا تھا جو اطمینان سے اندر آیا اور قتل کر گیا۔

ہم لاش کو دیکھ رہے تھے۔ اُسے الٹا پلٹا کر دیکھا۔ باہر حویلی کے اندرونی باغیچے اور برآمدوں میں جو شور و غل تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ تماشائیوں کا سارا ہجوم اندر آ گیا ہے۔ اچانک ایک بلند اور گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”مار گیا...... ادھر آ نا“۔ اور بھگدڑ مچ گئی۔ میں اور راجیش کمرے سے نکلے۔ ایک آواز کانوں میں پڑی۔

”تحصیلدار صاحب کو چاقو مار گیا ہے“۔

باغیچے کی دیوار کا ایک ہی دروازہ تھا۔ میں ہجوم کو چیرتا تماشائیوں کو گھونسے، کندھے اور ٹھڈ مارتا دروازے تک گیا اور دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ راجیش کو آواز دی۔ وہ بھی ہجوم میں سے بڑی مشکل سے مجھ تک پہنچا۔ وہاں روشنی کم تھی، صرف دو بلب جل رہے تھے جن کی روشنی ہجوم نے روک رکھی تھی۔

”راجیش!“ میں نے کہا۔ ”تین چار آدمی یہاں لاؤ جو کسی کو باہر نہ نکلنے دیں“۔

اُس نے کچھ نام پکارے۔ میں نے بڑی بلند آواز سے کہا۔ ”تمام آدمی جہاں جہاں کھڑے ہیں وہیں بیٹھ جائیں اور خاموش ہو جائیں ورنہ ہم گولی چلا دیں گے“۔

”ملک صاحب!“ راجیش نے کہا۔ ”چل کے دیکھو تو سہی، تحصیلدار زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ ہم نے دیکھا ہی نہیں کہ ہوا کیا ہے“۔ اُس نے ان آدمیوں کو جو اُس نے بلائے تھے، سختی سے کہا۔ ”کسی کو باہر نہ نکلنے دو خواہ کوئی اس حویلی میں رہنے والا ہی ہو“۔

باغیچہ خاصا وسیع تھا۔ اس میں پودے تھے اور گملے کے پلاٹ بھی اور اس میں درخت بھی تھے۔ میں راجیش کے ساتھ اُس برآمدے میں گیا جہاں کہتے تھے تحصیلدار زخمی پڑا ہے۔

تعاقب بیکار تھا

کچھ آدمی ارد گرد بیٹھے تھے اور ان کے درمیان تحصیلدار پڑا تھا۔ ایک نبض پر میں نے ہاتھ رکھا، دوسری پر راجیش نے۔ وہ زندہ تھا۔ وہ پیٹھ کے بل پڑا تھا اور اس کا بھی پیٹ قمر بائی کی طرح چاک تھا۔ پیٹ کے اندرونی حصے باہر آ گئے تھے۔ اُسے فوری طور پر ہسپتال لے جانا بیکار تھا۔ اس کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔ ہمیں اس کا نزعی بیان لینا تھا۔

”آپ کو کس نے زخمی کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

جواب میں وہ اپنا ایک ہاتھ مونچھوں تک لے گیا اور انگلیوں سے مونچھیں مروڑنے کا اشارہ کیا۔ اُس کی مونچھیں بہت چھوٹی تھیں۔ میں اشارہ سمجھ گیا۔ قاتل کی مونچھیں بڑی اور مروڑ مروڑ کر نوکدار کی ہوئی تھیں۔ تحصیلدار کے ہونٹ ہلے۔ میں نے کان اس کے منہ کے قریب کیا۔ اس کی سرگوشی سنائی دی مگر صرف اتنی ”نا“ ہو سکتا ہے اس نے ”نہ“ کہا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ قاتل کا نام بتا رہا تھا مگر ”نا“ کے آگے کچھ کہہ سکا۔ نام پورا نہ بتا سکا۔ میں نے اس کا آخری خراٹا سنا اور وہ مر گیا۔

میں نے اور راجیش نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہجوم بیٹھ چکا تھا اور خاموش تھا۔ اچانک آواز سنائی دی۔ ”وہ گیا...... ارے کون ہے“۔ اس کے ساتھ ہی ہجوم میں پھر بھگدڑ مچ گئی۔ راجیش نے اپنی دبنگ آواز میں گرج کر کہا۔ ”خاموش بیٹھے رہو“۔

ہم نے ایک آدمی کو نیم کے درخت پر چڑھتے دیکھا۔ وہ پرانا اور پھیلا ہوا درخت تھا۔ ٹہن موٹے تھے اور وہ درخت دیوار کے قریب تھا۔ کچھ ٹہن دیوار کے اوپر سے باہر کو گئے ہوئے تھے۔ دیوار کی اونچائی دس فٹ کے لگ بھگ تھی۔ ہم درخت سے اتنی دور تو نہیں تھے مگر ہجوم میں سے گزر کر اس آدمی تک پہنچنا جو ٹہنی پر چلا گیا تھا ممکن نہیں تھا۔ راجیش چلایا۔ ”ارے پکڑو اسے“۔ مگر کسی نے اوپر جانے کی جرأت نہ کی۔ ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہمارے پاس ریوالور نہیں تھے۔ میں اور راجیش مہمان آئے ہوئے تھے۔

میں اس آدمی کی چال سمجھ گیا اور دروازے کی طرف دوڑا مگر بیٹھے ہوئے آدمیوں نے مجھے تیز نہ دوڑنے دیا۔ میں نے دروازہ کھولا، باہر نکلا اور اُس طرف گیا جدھر ٹہن جاتا تھا۔ اُدھر گلی تھی۔ باہر بھی لوگ جمع تھے اور میرے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ میں اُس گلی میں گیا۔ اُدھر اندھیرا تھا اور گلی خالی تھی۔ مجھے ایک آدمی دوڑتا سائے کی طرح دکھائی دیا اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔ تعاقب بیکار تھا۔ قاتل نکل گیا۔

میں اندر چلا گیا اور اُس درخت کے پاس گیا جس پر وہ آدمی چڑھا اور ٹہن کے راستے دیوار پھلانگ گیا تھا۔ وہاں جو آدمی تھے، اُن سے پوچھا کہ وہ آدمی کہاں تھا اور کیسا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے جوگیا رنگ کا پاجامہ اور اسی رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا اور اس نے سر پر میلے سے رنگ کی چادر رکھی تھی جس سے اس کا سر ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ اچانک اٹھا اور درخت پر چڑھ گیا۔ میں نے درخت کا تنا دیکھا۔ اس پر تیزی سے چڑھنا مشکل نہیں تھا۔

”اُس کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

صرف ایک آدمی نے یقین کے ساتھ بتایا کہ اس کی مونچھیں گھنی اور لمبی تھیں لیکن اس کا چہرہ کوئی بھی بیان نہ کر سکا کیونکہ چادر ماتھے سے بھی نیچے آئی ہوئی تھی اور نیچے سے چادر نے تھوڑی بھی ڈھانپ رکھی تھی۔ یہ بھی کوئی نہ بتا سکا کہ اس کے کپڑوں پر خون تھا یا نہیں۔ بہر حال یہ تصدیق ہو گئی کہ قاتل بڑی بڑی مونچھوں والا تھا۔ مقتول تحصیلدار کے اشارے کو میں نے صحیح سمجھا تھا۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

تین ٹارچیں چار کلہاڑیاں

سانپ نکل گیا تھا۔ اب ہمیں اس کی لکیر کا تعاقب کرنا تھا۔ میں نے یہ انتظام کرا دیا کہ ساتھ والی گلی میں کوئی نہ جائے۔ ہجوم حویلی کے سامنے تھا۔ میں ساتھ والی گلی میں کھرے دیکھنا چاہتا تھا۔ کھوجی کے انتظار میں وقت ضائع ہونے کا خطرہ تھا۔ میں وہاں اجنبی تھا۔ راجیش سے کہا کہ وہ اس دوہرے قتل کی ابتدائی اور ضروری کاغذی کارروائی کرے اور لاشوں کو پوسٹمارٹم کے لئے بھجوا دے۔ اس سے پہلے اُسے یہ کام کرنا تھا کہ حویلی والے باغیچے کے حصے کا دروازہ ذرا سا کھول کر اندر رو کے ہوئے لوگوں کو ایک ایک کر کے باہر نکالے اور سب کی جامہ تلاشی لے اور کپڑوں پر خون کے داغ دیکھے۔ راجیش ذہین اور قابل انسپکٹر تھا۔ اُسے کسی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ مجھے دو تین ٹارچوں اور تین چار آدمیوں کی ضرورت ہے جو لاٹھیوں یا کلہاڑیوں سے مسلح ہوں۔ میری یہ ضرورت فوراً پوری کر دی گئی۔ اس زمانے میں ایک ایک فٹ لمبی ٹارچیں بھی ہوتی تھیں۔ مجھے تین ٹارچیں مل گئیں۔ تینوں بڑی تھیں۔ ایک اپنے ہاتھ میں اور ایک ایک دو آدمیوں کو دے دی۔ میرے ساتھ چار آدمی تھے، سب کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔

میں انہیں ساتھ لے کر اس گلی میں گیا جس میں قاتل دیوار سے کودا تھا۔ وہاں مٹی تھی اور دھول تھی۔ کھرے بڑے صاف تھے۔ یہ فلیٹ شوز کے جنہیں پی ٹی شوز بھی کہتے ہیں، نشان تھے۔ میں نے تلوے کے نشان سے پہچانا۔ اس دور میں ان کے تلوے ربڑ کے ہوتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس طرح اتنی تیزی سے درخت پر چڑھ گیا تھا۔ اگر جوتی چمڑے کے تلوے والی ہوتی تو جوتی پہنے ہوئے وہ درخت پر نہ چڑھ سکتا۔ میں نے کبھی کھرا نہیں اٹھایا تھا یعنی میں نے پاؤں کے نشان دیکھ کر کبھی سراغرسانی نہیں کی تھی۔ یہ ماہر کھوجیوں کا فن تھا جو مشکل اور پیچیدہ فن ہے۔ میں نے کھوجیوں کو کھرا اٹھاتے دیکھ دیکھ کر کچھ سوجھ بوجھ حاصل کر لی تھی۔

فلیٹ شوز کا کھرا دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ کھرا اٹھا لوں گا۔ یہ آسان تھا۔ میں تین ٹارچوں کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ کھرے صاف تھے۔ یہ مجھے گاؤں سے باہر لے گئے۔ یہ حویلی گاؤں کے باہر تھی۔ آگے پگڈنڈی آ گئی۔ اگر آپ نے دیہات کی پگڈنڈیاں دیکھی ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان پر کتنی دھول ہوتی ہے۔ قاتل بیس پچیس قدم پگڈنڈی پر چلتا رہا، پھر ساتھ والے کھیت میں داخل ہو گیا۔ میری خوش قسمتی کہ کھیت خالی تھا۔ یہاں مجھے کھرا تلاش کرتے کچھ دقت ہوئی لیکن میں بھٹکا نہیں۔

آگے سبزیوں والا باغ آ گیا۔ یہ خاصا وسیع باغ تھا۔ میں نے آوازیں دیں۔ "کوئی ہے؟ ...... اوئے باہر نکلو"۔ بار بار پکارنے کے باوجود کوئی نہ آیا تو میں سمجھ گیا کہ باغ والے بھی تماشہ دیکھنے چلے گئے ہیں۔ باغ کے کیارے ہی کیارے تھے۔ بعض میں سبزیاں اگی ہوئی تھیں اور بعض خالی تھے۔ کھرا بڑا صاف تھا۔ قاتل کیاروں میں سے گزرا تھا۔ میں تین ٹارچوں کی روشنی میں چار مسلح آدمیوں کے آگے آگے کھرا دیکھتا بڑھتا گیا۔ باغ سے نکلا تو کھیت آ گئے۔ باغ اور کھیتوں کے درمیان گز بھر کا چوڑا راستہ تھا۔ اس پر بھی دھول اتنی کہ پاؤں کا نشان صاف رہ جاتا تھا۔

گاڑی آئی اور گئی

یہاں کھرے دو ہو گئے۔ دوسرا کھرا بھی فلیٹ شوز کا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حویلی سے درخت کے ذریعے باہر آنے والے کا ایک ساتھی یہاں کھڑا تھا۔ اب دونوں پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ مجھے ایک خیال آیا۔ قاتل ایک تھا یا دو، وہ اس جرم کے استاد تھے لیکن وہ دیہاتی نہیں تھے۔ اگر وہ دیہات کے رہنے والے پیشہ ور قاتل ہوتے تو اپنے کھروں کے متعلق لاپروا نہ ہوتے۔ ہر دیہاتی جانتا ہے کہ واردات ہوتی ہے اور کھوجی کھرا اٹھاتا ہے۔ استاد تو پوری طرح محتاط ہوتے تھے۔ وہ کنکریوں والے راستوں پر چلتے تھے۔ کھوجیوں کو گمراہ کرنے کے لئے ندیوں میں اتر جاتے اور دور جا نکلتے تھے۔ اگر زیادہ ہوں تو قطار میں چلتے تھے تاکہ ایک دوسرے کے کھرے پاؤں تلے مٹتے جائیں۔

یہ قاتل شہر کے معلوم ہوتے تھے۔ شہروں میں مجرموں کے کھرے نہیں ملا کرتے۔ مکان پکے، سڑکیں اور فٹ پاتھیں بھی پکی ہوتی ہیں۔ شہروں میں انگلیوں کے نشان دیکھے جاتے ہیں لیکن جو مدد پاؤں کے نشان کر سکتے ہیں وہ انگلیوں کے نشان نہیں کر سکتے۔ یہ مجرم شہری ہو سکتے تھے جو کچے راستوں اور نرم نرم کیاروں پر چلتے رہے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ دیہات کی زمین مجرم کو پکڑ لیا کرتی ہے۔ اُن کے شہری ہونے کا ایک اور ثبوت یہ ذہن میں آتا تھا کہ شہری گانے والی کے ساتھ کسی دیہاتی کی کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ قمربائی کے قتل کا باعث رقابت تھا یا کوئی عداوت۔ قاتل شہری ہی ہو سکتے تھے۔ البتہ تحصیلدار کا قتل ذہن میں کچھ پیچیدگی پیدا کر رہا تھا۔

میں یہی کچھ سوچتا اور کھرے دیکھتا بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے ریل گاڑی کی آواز سنائی دی جو دور تھی، پھر انجن کی وسل سنائی دی۔ میں نے اُدھر دیکھا۔ دور سے انجن کی روشنی نظر آئی۔ میں گاؤں سے تقریباً ایک میل دور آ گیا تھا۔ وہاں سے ریلوے سٹیشن تقریباً پون میل دور تھا۔ کھروں کا رخ اُدھر ہی تھا۔ میں نے اپنے ساتھ کے دو آدمیوں سے پوچھا کہ ریلوے سٹیشن کو اور کوئی راستہ جاتا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ گاؤں سے ایک کچا راستہ نکلتا ہے وہ سیدھا ریلوے سٹیشن تک جاتا ہے۔ وہ چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک مسافر گاڑی دن کو یہاں رُکتی ہے اور ایک رات کو۔

پولیس کی حس نے مجھے بتایا کہ دونوں مجرم ریلوے سٹیشن پہنچ گئے ہیں اور اس گاڑی سے چلے جائیں گے۔ میرے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ میں اتنی تیز بھی نہیں دوڑ سکتا تھا۔ گاڑی ریلوے سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے وہاں سے کھرا اٹھانا ترک کر دیا اور بہت تیز ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ گاؤں سے آنے والا راستہ آ گیا۔ یہ بھی پگڈنڈی تھی۔ میں نے ٹرک کر ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ بڑے صاف کھرے نظر آ گئے۔ میں اور تیز چل پڑا۔ گاڑی رُکی اور انجن وسلیں دینے لگا پھر گاڑی چل پڑی۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ قاتل نکل گئے ہیں۔

قاتل بغیر ٹکٹ گئے

میں جب ریلوے سٹیشن پہنچا تو گاڑی دور جا چکی تھی۔ سٹیشن ماسٹر اپنے کوارٹر کو جا رہا تھا۔ اُسے روکا اور اُس کے دفتر لے گیا۔ بکنگ کلرک کو بلایا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور اسے بتایا کہ ایک گانے والی اور ایک تحصیلدار قتل ہو گئے ہیں۔ سٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ وہ بھی وہاں مدعو تھا لیکن اس کا ایک افسر گزر رہا تھا اس لئے نہ جا سکا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے اس کے تعاون کی ضرورت ہے۔ بکنگ کلرک سے پوچھا کہ کتنے آدمیوں نے ٹکٹ لئے تھے۔ اس نے کہا کہ چار ٹکٹ فروخت ہوئے ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا کہ ان چاروں کے حلئے اور چہرے اُسے یاد ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ چہرے دیکھنا اور یاد رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ سوچنے لگا پھر کہنے لگا کہ تین مرد تھے جو بالکل دیہاتی تھے اور ایک ادھیڑ عمر

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

عورت تھی۔

"اُن میں سے کسی کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں؟" میں نے پوچھا۔ "سر پر چادر اور اُس کے کپڑے جوگیا رنگ کے ہوں گے"۔

"نہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "اتنی بڑی بڑی مونچھوں والا کوئی نہیں تھا اور کسی کے سر پر چادر بھی نہیں تھی"۔

کانٹے بدلنے والا ایک ملازم وہاں کھڑا تھا۔ اُس نے کہا۔ "میں نے دو آدمیوں کو چلتی گاڑی پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ میں ڈرائیور کو گولہ (ٹوکن) دینے گیا تو گاڑی چلنے کا وقت ہو گیا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ گاڑی چل پڑی تو ایک طرف سے، پلیٹ فارم کے باہر سے، دو آدمی دوڑے آئے اور دونوں پہلے ڈبے کے پہلے کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گئے۔ انہوں نے یقیناً ٹکٹ نہیں لئے تھے"۔

"ان میں سے ایک کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں؟"

"دونوں نے سروں پر اس طرح چادریں لے رکھی تھیں کہ اُن کے چہرے اچھی طرح نظر نہیں آتے تھے"۔ اس نے جواب دیا۔ "وہاں روشنی کم تھی...... آپ بابو صاحب سے جوگیا کپڑوں کا پوچھ رہے تھے۔ مجھے ایسے خیال آتا ہے جیسے ایک کے کپڑے جوگیا رنگ کے تھے"۔

یہ تھے میرے مجرم۔ انہوں نے ٹکٹ نہیں لئے تھے۔ وہ گاڑی کے وقت سے پہلے سٹیشن تک پہنچ گئے ہوں گے لیکن پلیٹ فارم سے باہر انجن کی طرف کہیں رُکے رہے۔ گاڑی چلی تو دوڑ کر سوار ہو گئے۔

میں نے سٹیشن ماسٹر سے پوچھا کہ اس وقت گاڑی کہاں ہو گی۔ ان سے باتیں کرتے پون گھنٹہ گزر گیا تھا۔ سٹیشن ماسٹر نے پچیس میل دور کے ایک سٹیشن کا نام لیا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اُس سٹیشن ماسٹر کو فون کرے اور کہے کہ گاڑی کو وہیں روکے رکھے۔ سٹیشن ماسٹر ہچکچایا۔ میں نے اُسے کہا کہ دو انسان قتل ہو گئے ہیں اور قاتل اس گاڑی میں فرار ہو رہے ہیں۔ میں پولیس آفیسر ہوں۔ اگر گاڑی نہ روکی گئی اور قاتل نکل گئے تو سٹیشن ماسٹر جوابدہ ہو گا کہ اُس نے گاڑی کو روکنے کا انتظام کیوں نہیں کیا۔

سٹیشن ماسٹر نے وہ سٹیشن ملا دیا اور وہاں کے سٹیشن ماسٹر کو میرے متعلق بتا کر فون مجھے دے دیا۔ پتہ چلا کہ وہ سٹیشن ماسٹر مجھے اس طرح جانتا ہے اور میرے طریقہ تفتیش سے بھی واقف ہے۔ اُس نے بتایا کہ گاڑی اس کے سٹیشن میں داخل ہو رہی ہے اور وہ اُسے روکے رکھے گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں لاری پر آ رہا ہوں۔ میں نے اُسے یہ تسلی بھی دی کہ میں اُسے تحریر دے دوں گا کہ میں نے گاڑی رکوائی تھی اور اگر وہ کہے گا تو میں اُس کے اعلیٰ حکام کو بھی مطمئن کر دوں گا۔

اس کے علاوہ میں نے سٹیشن ماسٹر سے کہا کہ اگلے ڈبے کے پہلے کمپارٹمنٹ پر نظر رکھے۔ وہاں جوگیا رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے، بڑی مونچھوں والا ایک آدمی ہو گا۔ اس کے کپڑوں پر خون کے دھبے بھی ہوں گے۔ اگر یہ آدمی گاڑی سے اترے تو اسے پکڑنے کی کوشش کرے اور بہتر یہ ہے کہ وہ تھانے سے پولیس کی مدد لے لے۔

قاتل تیز اور ذہین نکلے

ریلوے سٹیشن سے مجھے سائیکل مل گئی۔ میں اس پر سوار ہوا اور شادی والی حویلی پہنچا۔ راجیش لاشیں اٹھوا کر تھانے لے گیا تھا۔ انہیں پوسٹمارٹم کے لئے پندرہ میل دور جانا تھا۔ میں نے بارات والی بسوں میں سے ایک بس لی۔ دو آدمی ساتھ لئے اور اُس سٹیشن کو روانہ ہو گیا جہاں مسافر گاڑی رُکی ہوئی تھی۔ راجیش کا تھانہ وہاں سے میل دور راستے میں تھا۔ وہاں ذرا سا رُک کر اُسے کہ میں کیا کچھ کر آیا ہوں اور اب کہاں جا رہا ہوں۔ [illegible]

کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ چلتے چلتے اس نے دو کانسٹیبل میرے ساتھ روانہ کر دیئے۔

میرے کہنے پر ڈرائیور نے بس بہت تیز چلائی۔ سڑک خالی تھی، بس نے پچیس میل کا فاصلہ بیس منٹ میں طے کر لیا۔ میں سیدھا ریلوے سٹیشن گیا۔ گاڑی رُکی کھڑی تھی۔ سٹیشن ماسٹر نے تھانے سے مدد منگوالی تھی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل چار کانسٹیبلوں کے ساتھ آ گیا تھا۔ یہاں میں ایک بات کہوں گا۔ پولیس اگر دیانتداری سے مجرموں کو پکڑنے کی کوشش کرے تو جرائم نوے فیصد ختم ہو سکتے ہیں۔ یہاں تو بعض کیسوں میں دو تھانیداروں کے درمیان یہ تنازعہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ یہ کیس کس تھانے کا ہے۔ ایسے تنازعے میں یوں بھی ہوتا ہے کہ مضروب زخموں کی تاب نہ لا کر مر جاتا ہے اور اس کا نزعی بیان بھی کوئی نہیں لیتا۔ اس سے مجرم اگر پکڑے بھی جائیں تو استغاثہ کمزور ہونے کی وجہ سے بری ہو جاتے ہیں۔

اس تھانے نے سٹیشن ماسٹر کی اطلاع پر پولیس سٹیشن پر بھیج دی۔ خود میرا یہ حال تھا کہ یہ میرا کیس نہیں تھا لیکن میں تعاقب میں ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ قاتل پولیس سے زیادہ تیز اور ذہین نکلے۔ وہ اس طرح کہ میں گاڑی کے پہلے کمپارٹمنٹ میں گیا۔ مسافر زیادہ نہیں تھے۔ سب کو دیکھا مونچھیں تو کئی ایک کی تھیں مگر جوگیا کپڑے کسی کے نہیں تھے۔ باوردی پولیس میرے ساتھ تھی۔ مسافر ڈر گئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ فلاں سٹیشن سے دو مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوئے تھے، وہ کون ہیں؟

ایک نے بتایا اور تین چار نے اس کی تائید کی وہ دروازے میں کھڑے رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ایک نے جوگیا پاجامہ اور اسی رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ دوسرے کا پاجامہ کرتہ سلیٹی تھا۔ جوگیا کپڑوں والے کی مونچھیں گھنی اور مروڑی ہوئی تھیں۔ دونوں نے گہرے سلیٹی رنگ کی قیمتی چادریں لے رکھی تھیں۔

میں نے اور زیادہ کریدا تو ایک مسافر نے بتایا کہ دونوں نے فلیٹ شوز پہن رکھے تھے۔ صرف ایک مسافر نے میرے اس سوال کا جواب دیا کہ ان کے کپڑوں پر سرخ داغ یا چھینٹے تھے یا نہیں۔ اُس نے کہا کہ سلیٹی کپڑوں والے کے پاجامے پر کچھ سرخ دھبے نظر آتے تھے۔ اُن کے کرتے چادروں میں ڈھکے ہوئے تھے۔

وہ گئے کہاں؟

مسافروں نے بتایا کہ گاڑی اس سٹیشن پر رُکی تو رکی ہی رہی۔ وہ دونوں دروازے میں سے باہر دیکھتے رہے۔ یہاں گاڑی دو منٹ سے زیادہ نہیں رُکتی مگر پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ ان دونوں میں سے ایک جس نے سلیٹی کپڑے پہن رکھے تھے اتر گیا۔ دوسرا دوسری طرف والے دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ جوگیا کپڑوں والا تھا۔ سلیٹی کپڑوں والے نے پائیدان پر کھڑے ہو کر اپنے ساتھی کو آواز دی۔ "نادرا!" نادر نے اس کی طرف دیکھا تو شاید انہوں نے ایک دوسرے کو اشارے کئے۔ نادر وہیں کھڑا رہا۔ اس کا ساتھی اُس کے پاس آ گیا اور دونوں اس طرف اتر گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں، ہیڈ کانسٹیبل اور چھ کانسٹیبلوں کے ساتھ پہنچ گیا۔

میں نے پلیٹ فارم کے دوسری طرف دیکھا جدھر وہ اتر گئے تھے۔ اُدھر اندھیرا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ تین آدمی اُدھر گاڑی کی لمبائی تک پھیلا دے۔ اُسے ان کے ساتھ اس حکم سے بھیج دیا کہ کوئی آدمی گاڑی سے اتر کر بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے پکڑے اور اگر وہ نہ رُکے تو اس کی ٹانگوں پر گولی چلا دے۔

میں نے تین کانسٹیبلوں کو پلیٹ فارم پر پھیلا دیا۔ خود یوں کیا کہ اس کمپارٹمنٹ کے دو مسافروں کو جو مجرموں کو پہچانتے تھے، ساتھ لیا اور گاڑی کے تمام ڈبوں میں گھوم گیا۔ ہر ایک مسافر کو دیکھا، مگر جوگیا اور سلیٹی

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کپڑوں والے نہ ملے۔ یہ میں نے محض ایک کارروائی پوری کی تھی۔ توقع یہی تھی کہ وہ نکل گئے ہیں۔ اس کارروائی کے بعد میں نے سٹیشن ماسٹر اور گاڑی کے گارڈ کو اُن کی ضرورت کے مطابق تحریر دے دی۔ میں سمجھ گیا کہ دونوں قاتل ہوشیار تھے۔ گاڑی کو رکے زیادہ وقت ہو گیا تو وہ چوکس ہو گئے۔ انہوں نے ہیڈ کانسٹیبل کو کانسٹیبلوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر دیکھ لیا ہو گا۔ انہیں دیکھتے ہی کھسک گئے۔

اس کارروائی کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میرے پاس سوچنے کے لئے وقت ہی کہاں تھا۔ میں تعاقب میں تھا اور ساتھ ساتھ سوچ بھی رہا تھا۔ مجھے گاڑی رکوانی نہیں چاہئے تھی۔ بس میرے پاس تھی جو گاڑی کی رفتار سے دُگنی رفتار پر چل سکتی تھی۔ میں اگلے سٹیشن پر چلا جاتا اور گاڑی رکتے ہی قاتلوں کے کمپارٹمنٹ میں جا دھمکتا۔ انہیں بھاگ نکلنے کا موقع نہ ملتا۔ بہرحال یہ یقین ہو گیا کہ قاتل یہی دو ہیں۔ ان کا کچھ حلیہ اور نشانیاں بھی معلوم ہو گئیں۔

میں بس میں بیٹھا اور واپس راجیش کے تھانے میں چلا گیا۔

طوائفوں اور ناچنے گانے والیوں کی دنیا

راجیش تمام تر کاغذی کارروائی مکمل کر چکا تھا۔ لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے چلی گئی تھیں۔ قمر بائی کی نائکہ اور اس کے سازندے لڑکی والوں کے گھر میں تھے۔ راجیش نے مجھے بتایا کہ وہ اُن سے وہیں جا کر پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے مجھ سے درخواست کے لہجے میں کہا کہ میں اتفاق سے وہیں ہوں اور اس کے ساتھ رہوں۔ میں رات تک تو رک سکتا تھا، اگلے دن رکنا میرے بس سے باہر تھا۔ تاہم میں نے اُس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور ہم دونوں لڑکی والوں کے گھر چلے گئے۔

طوائفوں اور ناچنے گانے والیوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ اُن کے طور طریقے الگ، سیاست الگ، اُن کی چاہت الگ اور ان کے تعصبات اور عداوتیں الگ ہوتی ہیں۔ وہاں دوستی اور دشمنی کا تصور کچھ اور ہوتا ہے۔ وہاں جسم اور ناز و انداز کا کاروبار ہوتا ہے اور محبت صرف پیسے سے ہوتی ہے۔ اس دنیا میں کوئی واردات ہو جائے تو سراغ لگانا مشکل نہیں ہوتا۔ پولیس والے عصمتوں کی اس منڈی کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

قمر بائی گانے والی خوبصورت عورت تھی بلکہ میں اسے لڑکی کہوں گا۔ اس کے چاہنے والے کئی ہوں گے اور اُن سب میں رقابت لازمی تھی۔ قمر بائی اور تحصیلدار کا قتل رقابت کا ہی نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ قمر بائی کے چاہنے والے کون کون تھے۔ گانا سننے کے لئے تو اُس کے کوٹھے پر بے شمار لوگ جاتے ہوں گے لیکن چند ایسے اُلّو کے پٹھے بھی ہوتے ہیں جو گانے والیوں کو دل دے بیٹھتے ہیں اور ان کے اس جھانسے میں آ جاتے ہیں کہ وہ بھی انہیں دل و جان سے چاہتی ہیں۔

لڑکی کے جاگیردار باپ کے گھر گئے۔ وہاں تو دولت لٹ رہی تھی اور دور دور سے تماشائی آئے ہوئے تھے۔ وہاں بارات بھی اتری ہوئی تھی مگر اب وہاں اُلّو بول رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں ایسے لگتا تھا جیسے یہ محل جیسی حویلی آسیب زدہ ہو گئی ہو۔ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ وہاں چند ایک آدمی جو اس حویلی کے ملازم اور مکین تھے اور باراتی موجود تھے لیکن ایسی خاموشی جیسے وہاں کوئی بھی نہ ہو۔

لڑکی کے باپ اور لڑکے کے باپ نے مجھے کہا کہ میں تفتیش اپنے ہاتھ میں رکھوں۔ لڑکے کا باپ مجھے وہیں رکھنے پر زیادہ اصرار کر رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اپنے آپ ہی دوسرے تھانے کے کیسوں میں دخل

[illegible]داری نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ میں اپنے تھانے سے [illegible] حاضر نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بتایا نہیں جا سکتا تھا کہ تفتیش کتنے دنوں یا کتنے مہینوں میں ختم ہو گی۔ دولہا کے باپ نے کہا کہ وہ مجھے ایس پی سے احکام لے دے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان دونوں باپوں کا انگریز افسروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے اور یہ خوشامدی لوگ ہیں۔ انگریز افسروں سے اتنا سا حکم لے سکتے ہیں کہ فلاں کیس کی تفتیش میں فلاں سب انسپکٹر کو بھی لگا دیا جائے۔

مقتول مقتولہ کا گاہک تھا

تحصیلدار چالیس سال کا خوبرو مسلمان تھا۔ اُن دنوں دلی میں ہوتا تھا۔ بالائی آمدنی کے علاوہ بہت سی [illegible] کا مالک بھی تھا۔ میرا اور راجیش کا خیال تھا کہ تحصیلدار کو اس کے کسی رقیب نے قتل کرایا ہے۔ دونوں کا اکٹھا قتل بتاتا تھا کہ ان دونوں کا آپس میں تعلق تھا۔ میں ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ قمر بائی کسی اور وجہ سے قتل ہوئی اور تحصیلدار کے قتل کا باعث کچھ اور تھا اور یہ کہ دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔

ہم نے قمر بائی کے سازندوں اور نائکہ کو اکٹھے ہی الگ بٹھا لیا۔ یہ طریقہ صحیح نہیں تھا۔ ان سے الگ الگ پوچھ گچھ ہونی چاہئے تھی لیکن راجیش کہتا تھا کہ اکٹھے بٹھانا [illegible] مفید رہے گا۔ میں مان گیا۔ قمر بائی کے سازندے تین تھے اور ایک نائکہ۔ ہم دونوں نے پہلے تو انہیں خوب ڈرایا اور یہ بھی کہا کہ ہم ان چاروں کو مشتبہ بٹھا لیں گے اور قاتل ان ہی میں سے کوئی ہو گا۔

''تمہیں کھلی اجازت ہے کہ جھوٹ بولو''۔ میں نے ان سے کہا۔ ''ہم تمہیں نہیں روکیں گے لیکن تم پولیس کو اچھی طرح سمجھتے ہو۔ ہم دلی جا رہے ہیں۔ تمہارے اندر کی ہر بات ہمیں مخبروں سے اور تمہارے اردگرد رہنے والے دوسرے مخبروں سے معلوم ہو جائے گی، پھر میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ پولیس کو جھوٹی باتیں بتانے کے جرم میں دو دو سال کے لئے اندر کرا دوں گا''۔

چاروں اکٹھے ہی بولنے لگے۔ وہ منت سماجت کے لہجے میں ہمیں یقین دلا رہے تھے کہ وہ سچ بولیں گے۔ راجیش نے انہیں کہا کہ ان کی بائی مر چکی ہے اور وہ بے روزگار ہو چکے ہیں۔ انہیں اب سچ بولنے سے نہیں ڈرنا چاہئے بلکہ جھوٹ بولنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔

''تم بتا سکتے ہو کہ تمہاری بائی کو کس نے قتل کیا ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم کسی کا بھی نام نہیں لے سکتے۔'' ایک نے کہا۔ ''ہمیں کسی پر شک نہیں''۔

''تحصیلدار کا قمر بائی کے ساتھ کیا تعلق تھا؟''

''وہ ہمارا پکا گاہک تھا''۔ ہمیں جواب ملا۔ ''قمر پر تو وہ جان نثار کرتا تھا''۔

''نادر کون ہے؟''

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گئے۔

''اس کی مونچھیں گھنی اور مروڑی ہوئی رہتی ہیں''۔ میں نے کہا۔ ''کبھی کبھی جوگیا رنگ کا کرتہ اور پاجامہ پہنتا ہے''۔

''اوہ نادر''۔ ایک سازندے نے کہا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''ارے وہ نادر...... وہ حوض قاضی والا''۔ اور ہم سے مخاطب ہو کے بولا۔ ''وہ حضور! دادا گیری کرتا ہے۔ نامی دادا (بدمعاش) ہے''۔

''تمہارے ہاں آتا تھا؟'' راجیش نے پوچھا۔ ''قمر بائی کے ساتھ اس کا تعلق تھا یا کبھی رہا ہے؟''

''نہ جی''۔ ہمیں جواب ملا۔ ''ایک دو مرتبہ آیا ہو گا۔ بائی کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، ہم صرف گانے کا کاروبار کرتے تھے۔ قمر بائی طوائف نہیں تھی''۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نادر کے ساتھ تمہاری نہ

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دوستی تھی نہ دشمنی"۔

"کچھ بھی نہیں جی"۔ انہوں نے کہا۔ "کوئی تعلق ہی نہیں تھا"۔

مقتولہ مردوں کی کمزوریوں کو سمجھتی تھی

"تمہارے ہاں گانا سننے والے تو بہت آتے تھے"۔ میں نے کہا۔ "خاص گاہک کون کون سے تھے؟ یعنی جو تمہاری بائی کی محبت کا دم بھرتے اور دولت لٹاتے تھے"۔

معلوم نہیں سازندوں نے بوڑھی نائکہ کی طرف کیوں دیکھا۔ وہ شاید اُسے قمر بائی کا رازدان سمجھتے تھے۔

"ایک تو یہ تحصیلدار صاحب تھے جو قتل ہو گئے ہیں"۔ نائکہ نے جواب دیا۔ "یہ تو صحیح معنوں میں قمر بائی پر جان نثار کرتے تھے۔ کپڑے وہ لا کے دیتے تھے جو صرف رانیاں اور راجکماریاں پہنتی ہوں گی۔ دوسرے نمبر پر اس دولہا کے والد صاحب تھے جو مہینے میں دو تین بار دلی آتے اور دن قمر بائی کے ساتھ گزارتے تھے۔ گانا سنتے تھے اور الگ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ یہ صاحب دو پھیروں میں اتنا دے جاتے تھے جو عام تماش بین پورا مہینہ آتے تو بھی نہیں دے سکتے تھے۔ تیسرے نمبر پر اسی باپ کا یہ بیٹا تھا جو آج یہاں دولہا بن کے آیا ہے۔ یہ تو شہزادہ ہے۔ جب بھی آتا تھا ضد کرتا تھا کہ قمر کو سیر کے لئے لے جاؤں گا لیکن ہم نے لڑکی کو کبھی بھی اس کے ساتھ جانے نہیں دیا تھا۔ ہمارا کاروبار گانے تک محدود ہے۔ ہم بیاہ شادیوں پر بائی کو لے جاتے رہے ہیں جہاں ہم چاروں اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ کسی کے ساتھ اکیلے کبھی نہیں جانے دیا۔ چوتھے نمبر پر ایک ہندو ٹھیکیدار تھا جو قمر بائی پر فریفتہ تھا"۔

"قمر ان میں سے کسے چاہتی اور کسے ناپسند کرتی تھی؟"

"آپ بھولے بادشاہ ہیں"۔ ایک سازندے نے اداس سی مسکراہٹ سے کہا۔ "ہم لوگ اور ہماری بائیاں صرف پیسے کو چاہتی ہیں۔ قمر بائی ہوشیار تھی۔ اپنے پیشے کو اور مردوں کی کمزوریوں کو خوب سمجھتی تھی۔ محبت کا اظہار کرنے والوں کو اس نے کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ لیلیٰ مجنوں کا ڈرامہ کھیلنا جانتی تھی۔ وہ چاہنے والوں کو مجنوں بنائے رکھتی تھی۔ جو زیادہ مچل جاتا اور غلط ضد کرنے لگتا، اُسے وہ شراب پلا پلا کر بے ہوش کر دیتی تھی"۔

"ذرا غور کریں حضور!" دوسرے سازندے نے کہا۔ "باپ بیٹا ایک ہی لڑکی پر فدا تھے اور وہ لڑکی محض کاروباری تھی۔ یوں کہئے کہ باپ بیٹا ایک دھوکے سے دل بہلا رہے تھے"۔

"تمہارے ہاں اور کون آتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

میں نے دراصل کچھ اور پوچھا مگر نائکہ کچھ اور ہی کہنے لگی۔ "ہمارے ہاں کون نہیں آتا۔ جیل سے نکل کے جو آتے ہیں وہ بھی ہمارے ہاں آتے ہیں اور ہم نے انہیں بھی اپنے ہاں دیکھا ہے جو جج کر کے آئے تھے۔ ہماری دنیا ننگی ہے حضور! انسان ہمارے کوٹھوں پر ہی آ کر ننگا ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کی اصلیت دیکھنی ہو تو ہمارے ہاں آ کر دیکھیں"۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ ان سے ایسی ہی باتیں پوچھوں لیکن یہ قتل کی واردات کی تفتیش تھی۔ مجھے اسی دائرے میں رہنا تھا۔

جیسا باپ ویسا بیٹا

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ قمر بائی کے ان چاہنے والوں میں آپس میں عداوت کس کس کی تھی۔ میں نے ان سازندوں اور نائکہ پر بہت سوال پھینکے اُن کے جوابوں میں سے سوال نکالے۔ جرح کی۔ راجیش بھی سوال پوچھتا اور جرح کرتا رہا۔ اتنی زیادہ مغز کھپائی سے یہ حاصل ہوا کہ تحصیلدار (مقتول) اور دولہا کے درمیان چپقلش پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ دونوں قمر کو بڑھ چڑھ کر تحفے دیتے تھے۔

نائکہ نے دولہا کے متعلق بتایا کہ وہ قمر بائی سے کہا کرتا تھا کہ تحصیلدار کے ساتھ بے رخی سے پیش آیا کرو۔ قمر نے اُسے کہا تھا کہ وہ اپنا کاروبار خراب نہیں کرنا چاہتی۔ نائکہ نے بتایا کہ اس شادی سے کوئی ایک ماہ پہلے یہ دولہا دلی گیا اور قمر بائی کے ہاں چلا گیا۔ دن کا وقت تھا۔ تحصیلدار کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اس نوجوان کا باپ بھی قمر بائی کا شیدائی ہے۔ اس نوجوان نے تحصیلدار کے ساتھ گستاخی سے بات کی۔ تحصیلدار نے اسے کہا کہ وہ یہاں سے نکل جائے۔ دولہا طیش میں آ گیا۔ اس نے قمر کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔ اس پر قمر کو غصہ آ گیا۔ اس نے تحصیلدار سے کہا کہ یہ فلاں جاگیردار کا بیٹا ہے جو یہاں آیا کرتا ہے۔

تحصیلدار اس کے باپ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے دولہا سے کہا کہ وہ فوراً باہر چلا جائے ورنہ وہ اس کے باپ کو بتا دے گا۔ ترش کلامی میں تحصیلدار نے کہہ دیا۔ "جیسا باپ ویسا بیٹا"۔ دولہا نے غصے سے گرجتے ہوئے کہا۔ "یہ رنڈی تمہاری ماں تو نہیں"۔

تحصیلدار بھڑک اٹھا مگر قمر بائی غصے سے بولی۔ اس نے دولہا سے کہا۔ "میں رنڈی نہیں ہوں، میں گاتی ہوں۔ تم نے مجھ میں رنڈیوں (طوائفوں) والی کون سی بات دیکھی ہے؟"

قمر بائی تحصیلدار کی طرفدار ہو گئی۔ سازندوں نے بتایا کہ چونکہ وہ تحصیلدار تھا، حاکم تھا اس لئے وہ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ قمر بائی نے اچھا کیا کہ تحصیلدار کو ناراض نہ کیا۔ دولہا میاں چلے گئے لیکن جاتے جاتے قمر کو یہ دھمکی دے گئے کہ تمہارے منہ پر تیزاب نہ پھینکا تو میں بے غیرت ہوں گا۔

اس انکشاف سے یہ شک قدرتی تھا کہ قمر بائی اور تحصیلدار کو دولہا نے قتل کرایا ہے۔ قتل کا یہ موقعہ موزوں تھا۔ جاگیرداروں اور ان کے "راجکماروں" کے لئے کسی کو قتل کرانا مشکل نہیں تھا۔ کرائے کے پیشہ ور قاتل مل جاتے تھے۔ آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ اس دولہا کو میں جانتا تھا۔ اوباش، عیاش، خود سر اور لڑاکا تھا۔ وہ آج کل کی پنجابی پکچروں کے ہیرو اور ولن کی طرح بڑھکیں مارنے والا آدمی تھا۔

جاگیر - ایمان کا سودا

راجیش سازندوں اور نائکہ سے پوچھ گچھ کر رہا تھا اور میں اپنے ہی ایک خیال میں الجھ کر اس سے لاتعلق ہو گیا۔ اپنے متعلق آپ کو پہلے بھی کبھی بتا چکا ہوں کہ کٹی پھٹی ہوئی، چیری پھاڑی ہوئی اور گلی سڑی لاشیں دیکھ دیکھ کر اور قاتلوں، ڈاکوؤں اور عجیب و غریب ابنارمل آدمیوں اور عورتوں سے پوچھ گچھ کر کر کے پولیس آفیسر انسانی جذبات سے محروم ہو جاتے ہیں، دل پتھر بن جاتے ہیں اور ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے کہ جذبات کو مار دیا جائے۔ اگر ایک حسین و جمیل جوان بیوی اپنے بوڑھے اور عیاش خاوند کو زہر دے کر مار ڈالے اور تھانیدار جذبات کے جال میں آ جائے کہ یہ یہ جوان لڑکی قتل پر مجبور ہو گئی تھی اور یہ مظلوم ہے تو تھانے اور حوالاتیں دارالامان بن جائیں۔ کوئی قاتل سزا نہ پا سکے۔

مجھ میں یہ خامی تھی کہ میں اپنے جذبات کو نہ مار سکا۔ قانون کو میں نے جذبات پر کبھی قربان نہیں کیا تھا سوائے دو تین کیسوں کے لیکن اکثر کیسوں میں میرے جذبات اُبل پڑتے تھے اور میں اپنا خون پینے لگتا تھا یہی حال میرا یہاں ہوا۔ اگر اس گانے والی کو اور تحصیلدار کو دولہا نے ہی قتل کرایا تھا تو میں اور راجیش اسے لاکھوں

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

روپوں کی رشوت کے عوض بھی بخشنے کے لئے تیار نہیں تھے مگر مجھے خیال یہ آ کے بے چین کرنے لگا کہ دولہا شادی کے چوبیس گھنٹے بعد ہی حوالات کا مہمان ہوگا۔ یہ ڈولی نہیں لے جا سکے گا اور اس کی ازدواجی زندگی کی ابتدا حوالات سے ہوگی اور شاید پھانسی کے تختے پر جا ختم ہو یا یہ اُس وقت قانون اور سزا کی گرفت سے نکلے گا جب اس کی جوانی ڈھل چکی ہوگی۔

یہ انگریزوں کی عطا کی ہوئی جاگیر کا تصور تھا......

انگریزوں نے یہ جاگیر اس کے دادا پردادا کو اپنی قوم سے غداری کے صلے میں دی تھی۔ جب ہندوستان میں مجاہدین آزادی کی لاشیں درختوں کے ساتھ لٹک رہی تھیں اور ان کے لیڈروں کو عمر بھر کے لئے کالا پانی بھیجا جا رہا تھا، اُس وقت دولہا کے دادا، پردادا انگریزوں سے اشرفیوں کی تھیلیاں اور جاگیریں وصول کر رہے تھے۔ انہی کی نشاندہیوں پر بے شمار مجاہدین پکڑے گئے اور فرنگیوں کی اذیتوں اور بربریت کا نشانہ بنے تھے۔

اب یہ جاگیر اور ایمان کا یہ سودا رنگ دکھا رہا تھا۔ باپ بیٹا ایک ہی آبرو باختہ مغنیہ کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں اخلاق اور کردار کا نام ونشان نہ تھا۔ بیٹا قتل کے الزام میں پکڑا جانے والا تھا۔ اگر وہ قتل کرانے کا مجرم نہیں بھی تھا تو بھی یہ صورت کتنی شرمناک تھی کہ باپ بیٹا ایک ہی کشتی میں سوار تھے اور یہ کشتی گناہوں کے دریا میں تیر رہی تھی۔ میں آپ کو اپنی تفتیش کی کہانیاں صرف تفریح طبع کے لئے نہیں سنایا کرتا۔ آپ غور سے میری کہانیاں پڑھیں تو آپ کو ان میں نیکی اور بدی اور جزا اور سزا کا فلسفہ ملے گا اور کچھ عبرت ملے گی اور یہ بھی کہ جس مجرم کو سزا دنیا کا قانون نہیں دے سکتا، اُسے خدا کا قانون ضرور پکڑتا ہے اور کسی نہ کسی رنگ میں سزا دیتا ہے۔

"سنا ملک صاحب!" راجیش نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

میں نے نہیں سنا تھا۔ سنا تو ہوگا لیکن میرا دھیان اپنے خیالوں میں الجھ گیا تھا۔

"ایک صورت اور سامنے آ رہی ہے"۔ راجیش نے کہا۔ "یہ بھی سن لو"۔

"پھر سناؤ یار!" میں نے قدرے اکتائے لہجے میں کہا۔ "ہم بائی کا مجرا دیکھنے آئے تھے اور وہ قتل ہوگئی"۔

"اب دوسری بائی کا مجرا سنو"۔ راجیش نے کہا۔

ابلیس کی منڈی میں

راجیش سازندوں سے کچھ نہ کچھ پوچھتا رہا۔ پتہ چلا کہ قمر بائی کی دشمنی ایک اور گانے والی کے ساتھ تھی جس کا نام کیرتن کماری تھا۔ یہ بات اس طرح سامنے آئی کہ راجیش نے اُن سے پوچھا تھا کہ دلہن کے باپ نے یہاں بلانے کے لئے قمر بائی کا انتخاب کس طرح کیا تھا۔ کیا یہ بھی اس کے چاہنے والوں میں سے تھا یا کسی اور نے قمر بائی کی سفارش کی تھی؟

سازندوں اور نائکہ نے بتایا کہ دلہن کا باپ اُن کے ہاں کبھی نہیں گیا تھا۔ قمر بائی کا انتخاب دولہا کے باپ اور تحصیلدار نے کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ دلہن کے باپ نے کیرتن کماری کو پسند کیا تھا لیکن تحصیلدار کو جو دلہن کے باپ کا دوست تھا، پتہ چل گیا۔ اُس نے سودا منسوخ کر دیا اور قمر بائی سے بات طے کرا دی۔ دولہا کے باپ نے بھی قمر بائی کی سفارش کی اور سودا پکا ہو گیا۔

نائکہ نے یہ بات پوری تفصیل سے سنائی تھی۔ ان تفصیلات اور بظاہر ذرا ذرا سی بے معنی باتوں میں تفتیش کے کام کی باتیں نکل آئیں۔ جرح اور سوال در سوال کے سلسلے کے دوران پتہ چلا کہ تحصیلدار پہلے کیرتن کماری کے ہاں جایا کرتا تھا۔ وہ گاتی تھی اور ناچتی بھی تھی۔ اچھی خوبصورت تھی۔ تحصیلدار سونا گاہک تھا اور حاکم بھی تھا۔

اڑوس پڑوس کی طوائفوں کے دلال ایک دوسرے کے موٹے گاہکوں پر نظر رکھتے اور انہیں اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تحصیلدار نے قمر بائی کو کسی شادی پر دیکھا تھا۔ وہ پہلی بار قمر بائی کے ہاں آیا تو ایک دلال نے قمر بائی کو بتایا کہ یہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہے۔ ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ قمر بائی نے اُسے حسن و جوانی اور ناز و انداز کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔

تحصیلدار نے قمر بائی کو خوش کرنے کے لئے اسے بتایا تھا کہ وہ اُس کی خاطر کیرتن کماری کو ٹھکرا چکا ہے۔ اس کے بعد تین مرتبہ ایسے ہوا کہ بیاہ شادی پر متعلقہ لوگوں نے کیرتن کماری سے سودا کیا لیکن تحصیلدار نے سودا منسوخ کرا کے قمر بائی کا سودا کرا دیا۔ کیرتن کماری قمر بائی کے گھر سے دو ہی گھر پرے رہتی تھی۔ ایک روز تحصیلدار نے نائکہ اور سازندوں کی موجودگی میں قمر بائی کو بتایا کہ کیرتن کماری نے اپنا ایک آدمی اُس کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ ہم سے کیا غلطی ہوگئی ہے کہ آپ ایک طوائف کے قیدی بن گئے ہیں۔ تحصیلدار نے بتایا کہ اُس نے پیغام کا جواب یہ دیا تھا کہ تم قمر بائی کے پاؤں کی خاک بھی نہیں۔ کچھ اور سخت اور طنزیہ باتیں بھی کہلا بھیجی تھیں۔

ایک روز کیرتن کماری کا ایک آدمی قمر بائی کے ایک سازندے سے ملا اور اُسے دھمکی کے لہجے میں کہا کہ اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔ تین مرتبہ کیرتن کماری کا سودا منسوخ ہوا اور اُس کی جگہ قمر بائی چلی گئی۔ اس کے بعد کیرتن کماری اور قمر بائی کی لڑائی بھی ہوئی تھی۔ کیرتن کماری نے قمر بائی کے قریب آ کر کہا۔ "کس نشے میں مست ہو؟ تمہارے گاہکوں کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی"۔

میں نے بھی بال کی کھال اتارنی شروع کر دی۔ قتل کا باعث ان دونوں گانے والیوں کی کاروباری رقابت اور عداوت بھی ہو سکتی تھی۔ سوال پیدا ہوا، کیا کیرتن کماری نام کی یہ گانے والی قتل کرا سکتی ہے؟ جی ہاں! ایک طوائف دوسری طوائف کو قتل کرا سکتی ہے۔ آپ اکثر اخباروں میں پڑھتے ہوں گے کہ ایک طوائف قتل ہو گئی یا کسی طوائف پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ طوائفوں اور ناچنے گانے والوں کی دنیا جرم اور گناہ کی دنیا ہے۔ ان کے ہاں وہ لوگ جاتے ہیں جو نارمل ذہن کے نہیں ہوتے۔ اگر آپ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو طوائف اور ناچنے گانے والی ابنارمل عورت ہوتی ہے۔ ایک تو ان کے گاہک ہوتے ہیں جو اُن کے ہاں جاتے ہیں اور واپس آ جاتے ہیں۔ دوسرے تحصیلدار، دولہا اور اس کے باپ جیسے لوگ ہوتے ہیں جو ان کے چاہنے والے ہوتے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے ابنارمل ہوتے ہیں کہ جانتے ہوئے کہ بازار میں بیٹھی ہوئی پیشہ ور عورت پیسے کی یار ہے کسی انسان کی نہیں اور یہ بڑا خوبصورت دھوکہ ہے، یہ عشاق

جواھر پارے

○ مدد صرف اللہ سے مانگی جاتی ہے، اس کے علاوہ اپنوں سے مانگی جائے یا غیروں سے ایمان خراب کر دیتی ہے۔

○ دونوں جہان کا حاکم اللہ ہے اور غیب کا حال اُس کے سوا کسی کو معلوم نہیں، خدا ہر کسی کی سنتا ہے۔

○ اصل قوت، بازو اور تلوار کی نہیں، ایمان کی ہوتی ہے۔

○ جنگ صرف ہتھیاروں اور فوج سے نہیں جیتی جا سکتی بلکہ جذبے شکست کو فتح میں بدلتے ہیں۔

○ کسی قوم نے اتنے غدار پیدا نہیں کئے جتنے مسلمانوں نے۔

("داستان ایمان فروشوں کی" از عنایت اللہ)

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

انہیں اپنا سمجھتے ہیں۔

ان کے ہاں جانے والے تیسرے لوگ جرائم پیشہ اور نامی گرامی غنڈے، استاد اور بدمعاش ہوتے ہیں۔ انہوں نے بھی ایک ایک بازاری عورت کو محبوبہ بنا رکھا ہوتا ہے۔ یہ لوگ رقابت کی تسکین چاقوؤں اور خنجروں سے کیا کرتے ہیں۔ یہ بھی نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ لہٰذا ابلیس کی اس منڈی میں خون خرابہ کوئی عجوبہ نہیں ہوتا۔

جہاں تک کیرتن کماری اور قمر بائی کی عداوت کا تعلق تھا، وہ بڑھتی گئی اور اس دولہا کی شادی کا وقت آ گیا۔ سازندوں کے بیان کے مطابق، یہاں بھی کیرتن کماری کو بلایا گیا تھا مگر تحصیلدار نے اس کا سودا منسوخ کرا کے قمر بائی کی بات طے کرا دی۔ یہ ممکن تھا کہ کیرتن کماری نے اسی کو قمر بائی اور تحصیلدار کے قتل کا باعث بنایا ہو۔

مجرم دولہا ہے یا کیرتن کماری؟

رات گزر چکی تھی۔ میرے اور راجیش کے لئے ناشتہ آ گیا۔ ناشتے کے بعد راجیش، دولہا کا باپ اور دلہن کا باپ تھانے چلے گئے۔ وہ مجھے تفتیش کے لئے یہیں رکھنا چاہتے تھے۔ میں اُن کے ساتھ نہ گیا۔ میں وہ جگہیں غور سے دیکھتا رہا جہاں دو انسان قتل ہو گئے تھے۔ مجھے وہاں سے کچھ نہیں مل سکتا تھا لیکن میں اپنی عادت پوری کرتا رہا۔

وہ تینوں تھانے سے یہ خبر لے کر آئے کہ دونوں جاگیرداروں نے مجھے وہیں رکھنے کے لئے میرے بالائی حکام سے اجازت لے لی ہے۔ میں اور راجیش الگ بیٹھ گئے اور جو کچھ ہمیں اُس وقت تک معلوم ہوا تھا، اس پر بحث مباحثہ کرنے لگے۔ ہمارا ایک مشتبہ دولہا تھا۔ اس کے لئے ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ آیا تحصیلدار نے اس کے باپ کو بتا دیا تھا کہ وہ قمر بائی کے ہاں جایا کرتا ہے؟

اس سوال کا جواب ہمیں کہاں سے مل سکتا تھا؟ تحصیلدار قتل ہو چکا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ دولہا اپنی زبان سے کہہ دے کہ اس کے دل میں تحصیلدار کے خلاف بھی دشمنی تھی۔

"اس کے باپ کو گھیرتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"ہوسکتا ہے وہ بتا دے"۔

"نہ باپ سے کچھ پوچھتے ہیں نہ اس کے بیٹے سے"۔ راجیش نے کہا۔ "یہاں ان پر شک کا اظہار نہ کیا جائے۔ ہمیں یہ پتہ چل چکا ہے کہ قتل کرائے کے قاتلوں نے کیا ہے۔ ان میں سے ایک کا نام (نادر) بھی معلوم ہو گیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ وہ دلی کا سزا یافتہ بدمعاش ہے اور اس کی ایک نشانی تو معلوم ہو گئی ہے کہ اس کی مونچھیں مروڑی ہوئی ہیں۔ ہمارا مجرم دولہا ہے یا کیرتن کماری۔ میرے دماغ میں یہ آئی ہے کہ کرائے کے یہ قاتل اپنا کام کامیابی سے کر چکے ہیں۔ اب وہ اپنا انعام وصول کرنے آئیں گے۔ بارات کو جانے دیں۔ میرا زیادہ تر شک کیرتن کماری پر ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو پہلے اس شک پر کام کرتے ہیں۔ آپ بارات کے ساتھ واپس جائیں گے اور آپ ولیمے پر بھی مدعو ہوں گے۔ وہاں کے ایس ایچ او کو ساری واردات بتا کر ایک دو مخبر لے لینا یا اپنے مخبر ساتھ رکھنا یا کوئی اور انتظام کر لینا"۔

اُس نے ایک اور تجویز پیش کی۔ دلی اجمیری گیٹ (بازار حسن) کے تھانے کا ایس ایچ او ایک سکھ درشن سنگھ اس کا دوست تھا۔ دونوں نے اکٹھے ٹریننگ کی تھی۔ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ اکٹھے رہے تھے۔ اُس نے کہا کہ وہ درشن سنگھ سے ٹیلیفون پر بات کرے گا اور اُسے کہے گا کہ کیرتن کماری کے کوٹھے پر نظر رکھے اور نادر کو پکڑنے کی یا اُس کا ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

تجویز اچھی تھی۔ ہم دونوں تھانے چلے گئے۔ دلی کی کال جلدی مل گئی۔ فون پر درشن سنگھ مل گیا۔ بات

راجیش نے کی۔ اُس نے میرا حوالہ بھی دیا اور اُسے مختصراً واردات سنائی اور کہا کہ نادر نام کا ایک سزا یافتہ بدمعاش کیرتن کماری کے گھر جائے گا اور اس کے ساتھ ایک اور آدمی ہو گا۔ انہیں پکڑنا ہے یا ان کا ٹھکانہ معلوم کرنا ہے۔

درشن سنگھ اس تھانے میں پرانا ہو چکا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ نادر کو جانتا ہے کیونکہ وہ تھانے کے ریکارڈ پر تھا۔ ایسے ہسٹری شیٹر تھانیداروں کو زبانی یاد ہوتے ہیں۔ درشن سنگھ کیرتن کماری کو بھی جانتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ بھی بات کی اور وعدہ کیا کہ وہ فوراً کارروائی کرے گا اور راجیش کو اطلاع دے دے گا۔

تحصیلدار نے مرتے وقت کچھ کہا تھا

میں نے تھانے سے آ کر بارات کو جانے کی اجازت دے دی اور میں خود بھی ساتھ چل پڑا۔ دولہا اور دلہن کے باپوں نے مجھے کہا کہ میں نہ جاؤں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں تفتیش کے سلسلے میں ہی جا رہا ہوں۔ میں نے جھوٹ بولا کہ ایک مشتبہ کو شامل تفتیش کرنا ہے۔ میں اب باراتی تھا، جاسوس یا سراغرساں تھا، یا مجھے راجیش کا مخبر کہہ لیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بارات کے ساتھ کوئی نیا چہرہ تو شامل نہیں ہوا؟

بارات اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئی۔ یہ بھی میرا تھانہ نہیں تھا۔ دوسرے دن ولیمہ تھا۔ میں نے کہیں سے مخبروں کا بندوبست کرنے کی بجائے خود ہی وہاں رُکے رہنا بہتر سمجھا۔ دولہا کے باپ سے کہا کہ میرا سر چکرا رہا ہے، شاید رات بھر جاگنے کا اثر ہے۔ میں نے صورت مریضوں کی سی بنالی۔ ان لوگوں نے میری تیمارداری میں حد ہی کر دی۔ مجھے لٹا دیا لیکن میں باہر نکل کر لوگوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ایکٹنگ شروع کر دی۔ کبھی کہتا کہ دل گھبرا رہا ہے، ذرا باہر نکلوں گا، میں باہر نکل گیا۔

رات بھی اسی طرح گزاری۔ دیگیں پک رہی تھیں، ولیمے کے انتظامات ہو رہے تھے اور میں گھوم پھر کر ہر کسی کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے گھنی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والے بہت سے آدمی نظر آئے وہ مونچھوں کا زمانہ تھا۔ کہا کرتے تھے کہ جس کی مونچھ نہیں وہ مرد ہی نہیں۔ آج کل نوجوانوں نے مونچھیں رکھنی شروع کر دی ہیں لیکن یہ ہندوؤں کی طرح نیچے کو رکھی جاتی ہیں۔ ہماری جوانی کے وقتوں میں کہا جاتا تھا کہ مرد جان دے دیتا ہے مونچھ نیچے نہیں کرتا۔

مونچھوں کے زمانے میں گھنی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والے کسی خاص آدمی کو الگ کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ اس کے باوجود میں نے سراغرسانی کا کمال دکھانے کی کوشش کی لیکن مجھے اپنی حماقت کا احساس ہونے لگا۔ دوسرے دن ولیمہ تھا۔ دولہا باہر آیا تو میں یہ ظاہر کئے بغیر کہ میری اُس پر نظر ہے، اُس کے ملنے والوں کو غور سے دیکھتا رہا اور اُس کی طرف پیٹھ کر کے اُس کی باتیں بھی سنتا رہا۔

میں نے وہاں اور کیا کچھ کیا، اس کی تفصیل خاصی طویل ہے لیکن یہ کارروائی احمقانہ تھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ راجیش نے جلد بازی میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں دولہا کے ساتھ رہوں۔ میں نے بھی سوچے سمجھے بغیر اس کے کہنے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ولیمہ بھی ہو چکا تھا۔ مجھے نادر نظر نہیں آیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ آیا ہو لیکن میں اُسے پہچانتا نہیں تھا۔ میں شام کی گاڑی سے واپس راجیش کے تھانے میں چلا گیا اور اسے بتایا کہ ہمیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ ہم نے سوچنا شروع کر دیا۔ بہت بحث مباحثہ کیا۔ تان درشن سنگھ پر ہی ٹوٹتی تھی۔ وہ نادر کو جانتا تھا۔ اب میرا شک بھی کیرتن کماری پر منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے راجیش سے کہا کہ دلی چلتے ہیں اور درشن سنگھ کی مدد سے نادر کو گھیرنے کی ترکیب کرتے ہیں۔

یہاں میں آپ کو یاد دلا دوں کہ مجھے کیوں یقین

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

ہو گیا تھا کہ قاتل کا نام نادر ہے۔ اس کی وجوہات تو میں بیان کر چکا ہوں مگر ایک ثبوت بڑا واضح تھا۔ میں سنا چکا ہوں کہ تحصیلدار نے مرتے وقت کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے تھے۔ میں نے کان اُس کے ہونٹوں کے ساتھ لگایا تو مجھے اس کی سرگوشی سنائی دی تھی لیکن وہ صرف "نہ" یا "نا" ہی کہہ سکا اور مر گیا۔ اس کے علاوہ اُس نے مونچھیں مروڑنے کا اشارہ کیا تھا۔ اُس وقت میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اُس نے کیوں "نہ" کہی ہے۔ جب گاڑی کے مسافروں نے بتایا تھا کہ سلیٹی رنگ کے پاجامے اور کرتے والے نے جوگیا رنگ کے پاجامے کرتے والے نادر کہہ کر پکارا تھا تو مجھے یاد آیا کہ مقتول نے نزع کے وقت "نادر" کہنا چاہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتول نادر کو جانتا تھا۔

ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ دلی چلا جائے۔

گھنی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والا

ہم اگلی رات کو دلی پہنچے اور سب انسپکٹر درشن سنگھ کے مہمان بنے۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے ایک آدمی کو کیرتن کماری کے گھر پر نظر رکھنے کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ یہ ایک ہی روز پہلے کی بات تھی۔ رات درشن سنگھ کے ساتھ کچھ کام کی باتیں کرتے اور کچھ گپ شپ لگاتے گزر گئی۔ نادر کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ چاقو زنی کا ماہر ہے اور اُس نے دو سزائیں چاقو زنی میں اور ایک سزا قتل کے کیس میں اعانت جرم میں کاٹی ہے۔ درشن سنگھ نے بتایا کہ نادر قتل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ درشن سنگھ نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ کیرتن کماری کے ساتھ نادر کا گہرا تعلق ہے۔

ان معلومات کے بعد یہ ضروری نہیں تھا کہ مخبر کو وہاں بٹھایا جاتا۔ اب سوچنا یہ تھا کہ نادر پر براہ راست حملہ کیا جائے یا پہلے کیرتن کماری کو لپیٹ میں لیا جائے۔ ہمارے پاس اس کا تو ثبوت ہی نہیں تھا کہ قتل اگر نادر نے کیا ہے تو یہ کیرتن کماری نے کرایا ہے۔ قتل دولہا بھی کرا سکتا تھا۔ ہم تینوں نے اس اقدام پر تبادلۂ خیالات کیا کہ نادر کے ٹھکانے پر چھاپہ مارا جائے۔ ہم نے اسی اقدام کو بہتر سمجھا اور طے ہوا کہ اگلے روز ایک مخبر یہ اطلاع لانے کے لئے مقرر کیا جائے کہ نادر اپنے ٹھکانے پر موجود ہے۔

ہم سو گئے۔

صبح درشن سنگھ نے نادر کی اطلاع لانے کے لئے ایک آدمی مقرر کر دیا۔ کچھ دیر بعد درشن سنگھ کا ایک ہیڈ کانسٹیبل جو کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا، تھانے میں آیا اور درشن سنگھ کو بتایا کہ جس آدمی کو کیرتن کماری کے گھر پر نظر رکھنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہ نادر کے ساتھ جا رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے انہیں دور سے دیکھا تھا۔

درشن سنگھ گہری سوچ میں چلا گیا، پھر بولا۔ "وہ آدمی نادر کے ساتھ جانے والا نہیں تھا، شاید کسی لالچ میں آ گیا ہو...... اٹھو۔ مجھے کچھ شک ہو گیا ہے"۔

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ درشن سنگھ نے تین کانسٹیبل بھی ساتھ لے لئے۔ دو تانگے روک کر ہم ان میں بیٹھے اور حوض قاضی کی ایک گلی کے سامنے تانگے رکوا کر اترے۔ درشن سنگھ بالکل خاموش تھا جیسے اُسے معلوم ہو کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ گلیوں کے موڑ مڑتا ایک مکان کے سامنے رُکا۔ دروازے کو ہاتھ لگایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ آگے چلا گیا اور تیسرے دروازے پر رُک کر دستک دی۔ ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ اُس نے مسکرا کر درشن سنگھ کو سلام کیا۔ درشن سنگھ نے کہا۔ "ذرا ادھر جانا ہے"۔ وہ آدمی یہ کہہ کر کہ آ جائیے، ایک طرف ہٹ گیا۔

ہم سب اندر گئے۔ ڈیوڑھی میں سیڑھیاں تھیں۔ ان سے اوپر گئے۔ چھت سے ایک فصیل پھلانگی۔ آگے پھر چھت تھی۔ اس سے اتر کر درشن سنگھ سیڑھیاں اترا۔

ہم بھی اُس کے پیچھے اترے۔ یہ صحن تھا۔ ایک آدمی اندر سے دوڑتا باہر آیا۔ اُس کا منہ کھل گیا اور آنکھیں ابل آئیں۔ اندر سے آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"نادر ہے!" درشن نے بلند آواز سے جواب دیا۔ "میں ہوں درشن سنگھ جہاں ہو وہیں رہنا"۔

درشن سنگھ نے ریوالور نکال لیا اور برآمدے میں داخل ہو کر ایک کمرے میں چلا گیا۔ ہم اس کے پیچھے گئے۔

"یہ ہے تمہارا نادر!" درشن سنگھ نے ہمیں کہا۔ "اور یہ جو فرش پر پڑا ہے، یہ میرا آدمی ہے"۔

ہمارے سامنے گھنی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والا نادر کھڑا تھا اور ایک آدمی فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے رسّی سے بندھے تھے اور پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ نادر کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی۔ درشن سنگھ نے کانسٹیبل سے کہا کہ اسے کھولو۔

وہ تین تھانیداروں کے سامنے بے بس ہو گیا

"اگر میں اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو اس آدمی کو یہ غائب کر دیتے"۔ درشن سنگھ نے کہا۔ "میں اس مکان میں ایک بار پہلے بھی چھاپہ مار چکا ہوں۔ میں نے راستہ بنا رکھا ہے"۔

یہ واقعہ یوں ہوا تھا کہ جو آدمی رسیوں میں بندھا پڑا تھا، درشن سنگھ کا وہ مخبر تھا جسے اُس نے کیرتن کماری کے کوٹھے پر نظر رکھنے کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ طوائفوں اور ناچنے گانے والیوں کے ہاں رات کو رونق ہوا کرتی ہے۔ اس بازار میں اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ چلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ دن کے وقت وہاں الو بولا کرتے تھے۔ یوں کہہ لیں کہ گناہوں کی اس دنیا کے دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ استاد جرائم پیشہ عموماً دن کے وقت طوائفوں کے ہاں جایا کرتے تھے۔ مخبر نے بتایا کہ وہ صبح کے وقت اس بازار میں ٹہل رہا تھا کہ نادر کیرتن کماری کے گھر سے نکلا۔ نادر اس مخبر کو جانتا تھا۔

نادر نے اُسے کہا کہ ایک ضروری کام ہے، ذرا ساتھ چلو۔ یہ آدمی چونکہ نادر کے لئے یہاں بھیجا گیا تھا، اس لئے وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ نادر اُسے اس مکان میں لے آیا۔ یہاں ایک آدمی پہلے سے موجود تھا۔ دونوں نے اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے اور اوندھے منہ گرا کر اس سے پوچھنے لگے کہ وہ کل سے اس بازار میں کیا کر رہا ہے۔ نادر کو معلوم تھا کہ یہ آدمی پولیس کا مخبر ہے۔ اس نے نادر سے کہا کہ وہ اپنے کام سے گھوم پھر رہا تھا۔

نادر نے اس کی پیٹھ پر بید کی چھڑی اتنے زور سے ماری کہ وہ بلبلا اٹھا۔ نادر نے اُسے کہا کہ وہ مان جائے کہ اُسے اُس (نادر) کے لئے بھیجا گیا ہے۔ یہ آدمی نہیں مان رہا تھا۔ اسے اور زیادہ مارا پیٹا گیا۔ اتنے میں ہم پہنچ گئے۔

"دیکھو نادر!" میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "وہ جوگیا رنگ کے کپڑے اور اپنے ساتھی کے سلیٹی رنگ کے کپڑے اور چاقو یا خنجر، جو بھی تم نے استعمال کیا تھا، خود ہی نکال دو"۔

"مان جا نادرے!" درشن سنگھ نے کہا۔ "سودا کرا دوں گا۔ موقعے کے گواہ موجود ہیں۔ تم دونوں کو شناخت کر لیں گے"۔

"اور تحصیلدار کا نزعی بیان بھی ہے"۔ راجیش نے کہا۔ "اُس نے تمہارا نام لے کر بیان دیا تھا۔ پھانسی سے بچنا چاہتے ہو تو برآمدگی کرا دو، ورنہ ہم خود تلاشی لیں گے تو ہماری تمہاری دوستی ختم ہو جائے گی۔ تمہارا جرم ثابت ہے پھر بھی ذرلی جتھے (سی آئی اے) کے حوالے کر دیں گے۔ تم جانتے ہو وہاں تمہارے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ جسم پر کھال نہیں رہے گی، پھر سزا بھی پا جاؤ گے"۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

وہ تھا تو پکا جرائم پیشہ مگر تین تھانیداروں کے سامنے وہ بے بس ہوگیا۔ اُس پر ذرا سا بھی تشدد نہ کیا۔ ہم تینوں نے صرف زبان سے اُس سے ہتھیار ڈلوا لئے۔ محلے کے تین چار آدمی بلا لئے۔ نادر نے اُن کے سامنے اپنا جوگیا سوٹ اور اپنے ساتھی کا سلیٹی سوٹ نکال دیا۔ معلوم ہوا کہ یہی آدمی جو اُس کے ساتھ تھا، دوہرے قتل میں اُس کا ساتھی تھا۔

مزید تلاشی میں دو بڑے کمانی دار چاقو اور دو خنجر برآمد ہوئے۔ چرس بھی برآمد ہوئی اور جامہ تلاشی میں نادر کی جیب سے اڑھائی ہزار روپے کے نوٹ برآمد ہوئے۔ یہ تحصیلدار اور قمر بائی کے قتل کی اجرت تھی جو اس نے اسی صبح کیرتن کماری سے وصول کی تھی۔ اس دور کے اڑھائی ہزار روپے آج کے پندرہ ہزار روپے کے برابر تھے۔

بارات کے ساتھ قاتل

اس قسم کے جرائم پیشہ کا پولیس کے جال سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ ان دونوں کو ہم تھانے لے گئے۔ نادر چونکہ اپنی دنیا کا استاد تھا اس لئے اُس نے اقبال جرم کے عوض درشن سنگھ سے اپنے کسی پہلے کیس کا سودا کرنا چاہا۔ راجیش نے کیس کے متعلق پوچھا۔ درشن سنگھ نے بتایا تو راجیش نے اُسے کہا کہ نادر کو یہ انعام دے دو۔ ضروری نہیں کہ میں آپ کو یہ کیس سناؤں۔ ہسٹری شیٹر افراد کے ساتھ بعض حالات میں اس قسم کی سودا بازی کرنی پڑتی ہے۔ میں نادر اور اس کے ساتھی کی اس دوہرے قتل کی واردات میں کوئی سودا بازی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اپنے تجربے پر اعتماد تھا کہ اتنی شہادت موجود ہے اور خانہ پُری کی بھی گنجائش ہے کہ ان دونوں کو سزا دلائی جا سکے۔ یہ کیس راجیش کا تھا۔ اُس نے جو بہتر سمجھا وہ کیا۔

نادر کا اقبالی بیان اُس کے ساتھی سے الگ لیا گیا۔ اُس کے جرم کی داستان یوں ہے کہ کیرتن کماری کے ساتھ اُس کے گہرے مراسم تھے۔ اس کلاس کی طوائفیں خصوصاً ناچنے گانے والیاں نادر کی طرح کے استاد غنڈوں کو اپنی حفاظت اور اپنے کاروبار کے تحفظ کے لئے اپنے جال میں رکھتی ہیں اور ان کا ہر مطالبہ پورا کرتی رہتی ہیں۔ وہ ایک دوسری پر اپنے اپنے غنڈوں کا رعب بھی گانٹھتی رہتی ہیں۔ کیرتن کماری نے نادر کو بتایا کہ قمر بائی اُس کے گاہکوں کو لے گئی ہے اور تحصیلدار اس کی مدد اور پشت پناہی کر رہا ہے۔ اُس نے نادر کو وہی تفصیلات بتائیں جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ کیرتن کماری یہ چوٹ برداشت نہ کر سکی کہ ان جاگیرداروں کے لڑکے لڑکی کی شادی پر اُسے بلایا گیا تھا لیکن تحصیلدار قمر بائی کو لے گیا۔ اس شادی پر اُسے ہزار ہا روپوں کی ویلوں کی توقع تھی۔ اپنا معاوضہ الگ تھا۔ اس قسم کے دولت مندوں کے ہاں گانے والیاں بلا معاوضہ جانے کو بھی تیار ہو جاتی تھیں کیونکہ صرف ویلیں اتنی ہو جاتی تھیں جو وہ کوٹھے پر پورے مہینے میں نہیں کما سکتی تھیں۔

کیرتن کماری نے نادر پر شراب کا اور اپنے حسن و جوانی کا نشہ طاری کر کے ایسا بھڑکایا کہ وہ تحصیلدار اور قمر بائی کے قتل پر تیار ہوگیا۔ کیرتن کماری نے اڑھائی ہزار روپیہ نقد پیش کیا اور کہا کہ دونوں کو ختم کر آؤ اور رقم لے لو۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ لوگ ذہنی مریض ہوتے ہیں اور انتہا پسند۔ ان کی سوچوں کو علم نفسیات کے ڈاکٹر ہی سمجھ سکتے ہیں۔

بارات گئی تو نادر اپنے ایک ساتھی کو ساتھ لے کر لڑکی والوں کے گاؤں چلا گیا۔ دونوں کے پاس خنجر تھے۔ نادر نے جوگیا کپڑے اور اُس کے ساتھی نے (جس کا نام ذہن سے اتر گیا ہے) سلیٹی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دونوں نے اوپر قیمتی چادریں لے رکھی تھیں اور قلفی شوز پہنے تھے۔ وہ شام سے ذرا پہلے وہاں پہنچے۔ نادر نے

اپنے بیان میں کہا کہ اُسے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر تک اردگرد کے دیہات کے تماشائی جمع ہونے شروع ہو جائیں گے پھر ان دونوں کو کوئی نہیں پہچان سکے گا۔

ایسے ہی ہوا۔ دونوں تماشائیوں میں شامل ہو گئے... نادر بہت چالاک آدمی تھا۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ قمر بائی کو کس کمرے میں ٹھہرایا گیا ہے۔ اُس کی نظر تحصیلدار پر بھی تھی۔ وہ ان دونوں کی نظروں سے بچنا چاہتا تھا کیونکہ دونوں اُسے جانتے تھے۔ تحصیلدار اُسے اس لئے زیادہ جانتا تھا کہ ایک بار وہ تحصیلدار سے ملا اور درخواست کے لہجے میں اُسے کہا تھا کہ وہ کیرتن کماری کے کاروبار کو تباہ نہ کرے۔ تحصیلدار نے اسے ڈانٹ دیا اور کہا تھا۔ ”کیرتن کماری مجھے غنڈوں سے ڈرا رہی ہے؟“

”میں غنڈہ بن کے نہیں آیا حضور!“ نادر نے کہا تھا۔ ”ایک عرض کرنے آیا ہوں“۔

تحصیلدار نے حاکمانہ لہجے میں ہی باتیں کیں۔ تب نادر نے اُسے کہا۔ ”اگر حضور یہ چاہتے ہیں کہ میں غنڈے کے روپ میں جناب کے سامنے آؤں تو کسی دن آ جاؤں گا“۔

”میں تمہیں دس مقدموں میں پھانس کر ساری عمر کے لئے جیل بھجوا دوں گا“۔ تحصیلدار نے کہا تھا۔

نادر اُسے یہ کہہ کر چلا آیا تھا۔ ”پہلے علاقے کے ایس پی سے بات کر لینا“۔

”اوئے نادرے! یہ کیا؟“

شادی کی تقریب میں نادر نے قمر بائی کو بھی دیکھا اور تحصیلدار کو بھی۔ اُس کا ساتھی بھی دونوں کو جانتا پہچانتا تھا۔ نادر نے ابھی یہ نہیں سوچا تھا کہ انہیں کہاں قتل کرے گا۔ یہ موقع محل کے مطابق تھا۔ قمر بائی دو چار گانے سنا کر حویلی کے اندر چلی گئی۔ نادر اور اُس کا ساتھی بھی اُدھر گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ حویلی کا یہ حصہ شارع عام بنا ہوا تھا۔ دیہاتی تماشائی قمر بائی کو قریب سے دیکھنے کے لئے حویلی کے اندر چلے گئے تھے۔ اندر بھی اپنے ساتھی کے ساتھ اندر چلا گیا اور دونوں اس کمرے تک چلے گئے جو قمر بائی کو دیا گیا تھا۔

قمر بائی کو اُن کے ہاتھوں مرنا تھا۔ تماشائی جو اندر آ گئے تھے، بائی کے کمرے کا دروازہ بند ہوتے دیکھ کر چلے گئے۔ نادر اور اُس کا ساتھی بھی پیچھے ہٹ آئے اور قمر بائی کی نائکہ اور سازندے بھی باہر چلے گئے۔ قاتلوں کے لئے میدان خالی ہوگیا۔ دونوں قاتل اندر چلے گئے۔ قمر بائی انہیں دیکھ کر اٹھی۔ نادر ماہر خنجر زن تھا۔ اس نے قمر بائی کے پیٹ میں خنجر مار کر ایک طرف کو جھٹکا دیا اور اُس کے ساتھی نے اُس کے دل پر خنجر مارا۔ قمر بائی کی آواز تک نہ نکلی اور وہ گر پڑی۔ دونوں باہر نکل گئے۔

دونوں نے طے کر رکھا تھا کہ اگر وہ الگ الگ ہو گئے تو ایک دوسرے کا انتظار ساتھ والے سبزیوں کے باغ کے باہر کریں گے۔ انہوں نے جگہ مقرر کر رکھی تھی۔ قمر بائی کو قتل کر کے دونوں باہر آ گئے۔ اُس کا ساتھی لاپتہ ہوگیا۔ اُس نے اپنے اقبالی بیان میں کہا تھا کہ اُس میں دوسرے قتل کی ہمت نہیں رہی تھی اس لئے وہ وہاں سے کھسک گیا اور سبزیوں کے باغ کے باہر مقررہ جگہ چلا گیا۔ اِدھر نادر دیکھتا رہا کہ اب کیا ہوگا اور کیا وہ تحصیلدار کو قتل کر سکے گا؟

تھوڑی ہی دیر بعد قتل کا انکشاف ہوگیا اور حویلی کے اندر ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ نادر نے تحصیلدار پر نظر رکھی۔ وہ اندر گیا تو نادر بھی اندر چلا گیا۔ برآمدے میں روشنی کم تھی اور ہجوم زیادہ۔ نادر نے سامنے سے آ کر خنجر جو اُس نے چادر میں چھپا رکھا تھا، تحصیلدار کے پیٹ میں پھیر دیا۔ تحصیلدار نے نادر کا چہرہ دیکھ لیا اور خنجر کھا کر بولا۔ ”اوئے نادرے! یہ کیا؟“ اور وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر آگے کو گرا۔ سب سے پہلے نادر نے بلند آواز سے کہا۔ ”اوئے اسے دیکھو کیا ہوگیا ہے“۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جب ہجوم اِدھر متوجہ ہوا تو نادر اِدھر اُدھر ہو گیا۔ وہ وہاں سے فوراً نکل جانا چاہتا تھا مگر ہجوم جس کی صورت دریا میں بھنور جیسی ہو گئی تھی، اُسے پیچھے کو اور اِدھر اُدھر دھکیل رہا تھا۔ وہ جلدی نکل نہ سکا۔ اتنی دیر میں اعلان ہوا کہ جو جہاں کھڑا ہے وہیں بیٹھ جائے۔ نادر نے دروازہ بند ہوتے دیکھا۔ ہجوم بیٹھ گیا۔ نادر کو نکلنا تھا۔ اُس کے پاس خون آلود خنجر تھا اور اُس نے اپنا جائزہ تو نہیں لیا تھا لیکن اُسے ڈر تھا کہ اُس کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے ہوں گے۔ اُس نے چادر اسی مقصد کے لئے لے رکھی تھی۔

اُس نے جب دیکھا کہ وہ دروازے میں سے گزرتے پکڑا جائے گا تو اُس نے بیٹھے بیٹھے کوئی اور راستہ دیکھنا شروع کر دیا۔ اُسے نیم کا درخت اور دیوار تک گیا ہوا ٹہن نظر آیا۔ وہ اٹھا اور نہایت تیزی سے درخت پر چڑھ گیا۔ اُس نے شور بھی سنا۔ "وہ گیا، وہ گیا"۔ وہ بلی کی طرح ٹہن پر گیا۔ باہر کو کودا اور گاؤں سے نکل گیا۔ سبزیوں والے باغ سے گزرا۔ اس کا ساتھی اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ انہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ رات کو ایک مسافر گاڑی گزرتی ہے۔ وہ دونوں ریلوے سٹیشن پہنچے اور گاڑی آ گئی۔ وہ انجن سے ذرا ہٹ کر کھڑے رہے۔ گاڑی چلی تو وہ پہلے ڈبے پر سوار ہو گئے۔

گاڑی جب میرے کہنے پر ایک سٹیشن پر زیادہ دیر رُکی رہی تو انہیں شک ہوا۔ وہ بہت محتاط تھے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ اُن کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں چھپانے کے لئے انہوں نے چادریں اور نیچے لٹکا لیں۔ نادر کے ساتھی نے دیکھا کہ پولیس آ رہی تھی۔ اُس نے نادر کو بتایا۔ دونوں دوسری طرف اتر گئے اور پیدل سات آٹھ میل چل کر اپنے ایک دوست کے ہاں پہنچے۔ اُس کے ہاں انہوں نے کپڑوں سے خون دھویا اور خنجر صاف کئے۔ رات وہاں گزاری اور اگلی شام دلی پہنچے۔

نادر رات کو کیرتن کماری کے ہاں نہ گیا کیونکہ رات کو وہ مصروف ہوتی تھی۔ وہ رات کے آخری پہر گیا۔ کیرتن کماری کو کامیابی کی خوشخبری سنائی۔ اڑھائی ہزار روپیہ وصول کیا۔ کچھ دیر وہاں سویا اور جب باہر نکلا اُسے درشن سنگھ کا مخبر نظر آیا۔ اُس کے انداز سے اُسے شک ہوا۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو اُسے مخبر پر شک نہ ہوتا، وہ نادر تھا جو اپنے فن کا ماہر اور استاد تھا اور پولیس کی کارروائیوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُس نے مخبر سے ساتھ دوستانہ پیار سے باتیں کیں اور اُسے کسی کام کے بہانے اپنے ساتھ لے گیا۔ اپنے گھر لے جا کر اُس نے مخبر کے ساتھ جو سلوک کیا وہ آپ کو سنا چکا ہوں۔

اس کے ساتھی نے الگ اقبالی بیان دیا۔ دونوں کے بیانوں میں کچھ فرق تھا جو ہم نے پورا کر لیا۔ دونوں نے مجسٹریٹ کو بھی بیان قلم بند کرا دیئے۔ ہم نے کیرتن کماری کو بھی گرفتار کر لیا۔ میں اپنے تھانے میں چلا گیا۔ میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ راجیش ملزموں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ وہ ذہین آدمی تھا۔ مقدمہ تیار کرنا جانتا تھا۔ مجھے اطلاعیں ملتی رہیں۔ نادر اور اُس کا ساتھی سیشن کورٹ میں جا کر اقبالی بیانوں سے منحرف ہو گئے لیکن راجیش نے کوئی خانہ خالی نہ رہنے دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نادر جیسے استاد عدالت میں جا کر اپنی چال چلا کرتے ہیں۔ اس کا اُس نے اپنے گواہوں کے ذریعے پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ نادر اور اُس کے ساتھی کو سزائے موت دی گئی اور کیرتن کماری کو چار سال سزائے قید۔ اُس نے روپے پیسے کے زور پر بڑا قابل وکیل کیا تھا، وہ انہیں سزا سے بچا نہ سکا۔ اُن کی اپیلیں بھی مسترد ہو گئیں۔

✽

طنز و مزاح

ملفوظاتِ گفتارِ غازی

شوگر اچھے خاصے جوان مرد کو تقریباً نامرد بنا دیتی ہے اور بڑے بڑے اتھرے مرد امن پسند ہو جاتے ہیں۔

☆ -- خادم حسین مجاہد

حضرت کو عوام کالانعام یعنی اندھے معتقدین کی طرف سے بے تحاشا مال مفت میں نذرانوں کے علاوہ قسم قسم کی سوغاتیں، شیرینی اور بکراجات وغیرہ بھی وافر مقدار میں ملا کرتے تھے اور جنہیں وہ دلِ بے رحم کی طرح ہی استعمال کرتے تھے اور ہل جل کر تو کبھی کچھ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ ایک تو وہ خود ہی معقول حد تک سُست اور کاہل الوجود تھے، دوسرے ان کی مفت کے خدمت گاروں یعنی مریدین نے ان کی عادتیں بگاڑ دی تھیں یہی وجہ ہے کہ جونہی ان کی زندگی کا چہلم یعنی چالیسواں ہوا، ذیابیطس ان کے گوڈے گٹوں میں بیٹھ گئی اوّل اوّل تو انہوں نے اسے بالکل بھی اہمیت نہیں دی لیکن جب شوگر نے اپنا آپ دکھایا تو بادل نخواستہ دوا اور کسی قدر پرہیز شروع کر دی پھر بھی ان کو شوگر کے ساتھ مانوس ہوتے ہوتے دس سال لگ گئے لیکن شوگر کے ساتھ ان کے کبھی بھی مفاہمانہ تعلقات قائم نہ ہو سکے اور شوگر کی وجہ سے ہی گردے ختم ہونے کے باعث انہوں نے محض ساٹھ سال کی عمر میں ہی ملک الموت سے ملاقات کر لی مگر چالیس سال کی عمر کے بعد سے وہ ہمیشہ شوگر سے ویسے ہی شاکی رہے جیسے بیس سال کی عمر میں شادی ہونے کے بعد سے بیوی سے۔

راہی ملک عدم ہونے سے چند سال پیشتر ایک بار جب وہ محفل آراء تھے کسی نے بیماریوں اور ان کی اذیت ناکی کا ذکر چھیڑ دیا وہ تو جیسے بھرے بیٹھے تھے فوراً بولے کہ "بیماری تو اچھی کوئی بھی نہیں لیکن جب سے مجھے شوگر ہوئی ہے دوسری بیماریاں نعمت لگنے لگی ہیں۔ یہ تو ایسا ذلیل مرض ہے جو اپنے مریض پر اتنی پابندیاں لگا دیتا ہے کہ وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی خود کو جیل میں محسوس کرتا ہے۔ پتا چلے کہ آٹے دال کا بھاؤ کیا ہوتا ہے۔ یوں تو ہر انسان کی زندگی کم از کم ایک بار ضرور بدلتی ہے جب اس کی شادی ہوتی ہے لیکن ذیابیطس کے مریضوں کی زندگی دو بار بدلتی ہے ایک بار شادی کے بعد اور دوسری بار شوگر ہونے کے بعد۔ شادی کے بعد انسان کے جگری یار چھوٹ جاتے ہیں اور شوگر کے بعد پسندیدہ غذائیں۔ اس کی زندگی سے مٹھاس تو ختم ہوتی ہی ہے کتنی ہی حلال چیزیں بھی اس پر حرام ہو جاتی ہیں جو پہلے اَن گنت اور بے تحاشا کھاتے تھے۔

شوگر کے بعد ہر چیز حرارے معلوم کر کے اور گن گن کر لی جاتی ہے اور اگر ذرا سی زیادتی ہو جائے تو ٹوائلٹ پریڈ میں تو اضافہ ہوتا ہے سر اور جوڑوں میں درد بھی شروع ہو جاتا ہے اگر کوئی دعوت اڑائی جائے یا کوئی تگڑی غذا کھا لی جائے تو معدہ بغاوت کر دیتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ورزش کر کے اسے ٹھکانے لگانا پڑتا

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہے۔ دنیا میں شوگر سے بڑھ کے بھی خطرناک بیماریاں ہیں مگر جتنی پابندیاں شوگر کی ہیں کسی اور بیماری کی نہیں ہیں اور اگر یہ پابندیاں نہ کی جائیں تو کتنی ہی بیماریاں مزید ہو جاتی ہیں مثلاً موتیا، ہیپاٹائٹس، بواسیر، بلڈ پریشر، قبض، دل جگر اور گردوں کے امراض یعنی ام الامراض قبض نہیں بلکہ ذیابیطس ہے کیونکہ قبض کی ایک وجہ شوگر بھی ہے اور شوگر ہو جائے تو سمجھو لوکہ باقی بیماریاں بھی حملے کے لئے لائن میں لگ گئی ہیں۔ اس لئے موت کے سوا بچنے کی کوئی شکل نہیں کیونکہ اس کی جو دوا ہے وہ یوں نہیں کہ ایک بار لے لی اور بات ختم بلکہ روٹی آپ کا دل چاہے تو کھائیں نہیں تو نہ کھائیں لیکن دوا نہ کھائیں تو خیر نہیں۔

گو فراڈیے یہاں بھی فراڈ کرنے سے باز نہیں آئے اور چند خوراکوں یا پھونکوں میں شوگر کے مکمل حتمی اور یقینی علاج کے دعوؤں کے ساتھ عوام الناس کو لوٹ کر دوائی سے مکمل چھٹکارے کا مژدہ سناتے ہیں اور دوا چھوڑنے کے کچھ روز بعد جب مریض کی حالت غیر ہوتی ہے تو ٹیسٹ کرانے پر پتا چلتا ہے کہ شوگر اور بڑھ گئی پھر اگر کوئی مرنے سے بچ جائے تو دوا اور پرہیز میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ انسان کو جو چیز منع ہوتی ہے اس کے لئے ہی زیادہ دل چاہتا ہے اور چاہے پہلے پسند نہ بھی ہو شوگر کے بعد بندہ مٹھائی کھانے سے باز نہیں آتا حالانکہ یہ صاحب عقل و شعور مخلوق ہے اس کے برعکس بے شعور مخلوق پر ریسرچ یہ ثابت کرتی ہے کہ جانوروں کے لئے جو چیز مضر ہوتی ہے وہ اس کے کھانے سے باز رہتے ہیں یا ان میں اس کی خواہش ہی ختم ہو جاتی ہے یعنی جو جواب وہ ہے اسے ہی آزادی ہے اپنا بیڑہ غرق کرنے کی ویسے تو ہر وقت شوگر کے مریضوں کو کچھ نہ کچھ کھانے کی ہدایت ہے مگر صرف وہ چیزیں جن کو بندہ اپنی خوشی سے کبھی نہ کھائے۔

ایک گھوڑوں کی خوراک چنے ہی وہ چیز ہے جسے شوگر کے مریض بے دھڑک کھا سکتے ہیں جس میں شوگر بھی نہیں اور طاقت بھی ہے ورنہ ہر طاقت والی چیز میں شوگر زیادہ ہوتی ہے۔ پہلے حکیم ذیابیطس کے مریضوں کو چینی منع کرتے تھے اور گڑ کی اجازت دے دیتے تھے ڈاکٹروں نے وہ بھی منع کر دیا اب لے دے کے شوگر فری مصنوعات رہ جاتی ہیں جن کے استعمال پر شوگر کے مریضوں کا گزارا ہے لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ وہ جوڑ ہلا دیتی ہیں اب بندہ جائے تو جائے کہاں۔

ایک مرید نے پوچھا کہ حضرت یہ مرض واہیات و ہیبت ناک ہوتا کیسے ہے؟ تو حضرت نے فرمایا اس کی وجوہات ایک سے زائد ہیں وراثت، موٹاپا، گردوں کی کمزوری اور ٹینشن اس کی اہم وجوہات ہیں اور جو لوگ ہر وقت اپنی یا دوسروں کی بیویوں کے حقوق ادا کرتے رہتے ہیں ان کو بھی گردوں کی کمزوری کے باعث یہ مرض گرا دیتا ہے اور پھر وہ دوسروں کی تو کیا اپنی بیوی کے حقوق بھی کبھی کبھار ہی ادا کرنے کے قابل رہ جاتے ہیں اور وہ بھی صرف ڈیوٹی پوری کرنے کی حد تک۔ ابتدائی جوش و جذبہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے اور کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ انہیں اپنی یا کسی اور کی زوجہ اگر مشکوک نظروں سے دیکھے تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں شوگر اچھے خاصے جوان مرد کو تقریباً نامرد بنا دیتی ہے اور بڑے بڑے اتھرے مرد امن پسند ہو جاتے ہیں۔

پہلے پہل تو یہ مرض چالیس سال کی عمر کے بعد ہی ہوا کرتا تھا اور تب تک انسان بہت کچھ دیکھ چکا ہوتا تھا مگر اب تو جوانوں اور بچوں کو بھی ہو جاتا ہے اسی لئے شوگر کو دو قسموں ٹائپ ون اور ٹائپ ٹو میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک چالیس سال سے پہلے ہونے والی اور دوسری چالیس سال کے بعد ہونے والی۔ اسی طرح بعض عورتوں کو

Scanned By BooksPK

دوران حمل بھی شوگر ہو جاتی ہے جو کہ عموماً بچے کی پیدائش ے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ ماں یا بچے کو مستقلاً بھی ہو جاتی ہے یعنی اس کی تباہ کاریاں اتنی زیادہ ہیں کہ ہمارے ملک میں ہر چوتھا فرد اس کا شکار ہے۔

ایک اور مرید نے پوچھا کہ پتا کیسے چلتا ہے کہ شوگر ہو گئی ہے۔ تو حضرت نے فرمایا کہ جب آپ کی پیاس نہ بجھے، دل گھبرائے اور ہر پندرہ بیس منٹ یا آدھے گھنٹے بعد زوروں کا پیشاب آئے جو کنٹرول سے باہر ہو جائے اور نزدیک نزدیک جلد کوئی جائے پناہ میسر نہ ہو سکے تو قدرت اپنا کام کر جائے اور انسان نماز پڑھنے کے قابل نہ رہے اور یہ وقفہ اتنا ریگولر ہو کہ لوگ وقت کا اندازہ آپ کے ٹائلٹ کے چکروں سے کرنے لگیں تو سمجھ لیں کہ آپ کو یہ ذلیل و منحوس مرض ہو چکا ہے۔ پھر Test کروا کے کوئی واقع ذیابیطس کولی طبیب کے مشورے سے لیں یا انسولین شروع کریں تا کہ ٹائلٹ پریڈ کچھ کم ہو۔ مرض تو کم نہیں ہو گا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے گا حتیٰ کہ آپ کو قبر میں لے جائے گا لیکن آپ کی موت شوگر سے نہیں بلکہ اس کی وجہ سے ہونے والی بیماریوں سے ہو گی۔ حتیٰ کہ شوگر شروع میں شوگر اپ ہوتی ہے اور اسے کنٹرول کرنا مشکل ہوتا ہے جبکہ کچھ عرصے بعد جب بندہ کمزور ہو جاتا ہے تو یہ لو ہونا شروع ہو جاتی ہے اس وقت ایسی ہی کوئی چیز کھانا پڑتی ہے جو سختی سے منع ہوتی ہے۔ یعنی چینی، گلوکوز، گلقند وغیرہ لیکن تھوڑی سی مقدار میں۔ یہ نہیں کہ کھلی اجازت ہو گئی اس حالت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی صورت میں پھر شوگر آؤٹ آف کنٹرول ہو سکتی ہے اور اسی حالت میں کچھ نہ کھانے کی صورت میں ہارٹ اٹیک بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے ہی اس مرض کی مکاری کا اندازہ لگا لیں کہ بندہ مرتا بظاہر کسی اور وجہ سے ہے لیکن اس کے پیچھے اصلی ہاتھ شوگر کا ہوتا ہے۔ جیسے مسلمانوں کے خلاف ہر سازش کے پیچھے امریکہ یا اسرائیل کا ہاتھ ہوتا ہے۔

تیسرے مرید نے اس کے اہم اثرات کے بارے میں پوچھا تو حضرت بولے کہ یہ مرض عموماً نازک مزاج لوگوں کو ہوتا ہے جو کھاتے تو اچھا خاصا ہیں لیکن اس کھائے پیئے کو حلال کرنے یا کسی بھی قسم کی محنت یا ورزش کرنے کی کوئی ایماندارانہ کوشش نہیں کرتے لیکن اگر وہ نازک مزاج نہ بھی ہوں تو اس مرض کے بعد ضرور نازک مزاج ہو جاتے ہیں۔ ذرا سی ٹھوکر اور زخم بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے اور شوگر کنٹرول نہ ہو تو متاثرہ حصہ کاٹنے کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔ اس انجام سے بچنے کے لئے شوگر کنٹرول کر کے زخم کا علاج بڑی پابندی سے ضروری ہے۔ ویسے شوگر کے مریض سے دشمنی نکالنا بڑا ہی آسان ہے جیسے بلڈ پریشر کے مریض کو زیادہ نمک والی چائے پلا کر اس کی شریان تک پھاڑ سکتے ہیں جس کے بعد وہ بچ بھی گیا تو ساری عمر فالج کا شکار رہے گا۔ ویسے ہی اگر شوگر کے مریض کو اصرار کر کے زیادہ چینی والی چائے لگاتار پلاتے رہیں تو وہ چند ہی دنوں میں آدھا ہو جائے گا اور اگر آپ مذاق مذاق میں اسے کوئی کٹ یا ٹھوکر لگا دیں تو وہ معذور بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ شوگر والوں کے معمولی زخم جلد ہی غیر معمولی ہو جاتے ہیں۔ بس ذرا سی بے احتیاطی اور ایک دو بار زخم کی تجدید ہی کافی ہے اور یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ ٹھوکر عموماً وہیں لگتی ہے جہاں زخم ہوتا ہے۔

اس گل فشانی گفتار میں حضرت کا سانس پھول گیا آنکھیں سرخ ہو گئیں بلڈ پریشر بڑھ گیا اور شوگر کچھ کم ہو گئی جس سے ان کا جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔ گلوکوز کی ایک چٹکی پھانکنے کے بعد کچھ نارمل ہوئے تو ایک مرید نے جرأت کرتے ہوئے کہا کہ کتنی ہی بیماریاں ہیں جو شوگر سے بھی بڑھ کے موذی ہیں اور خطرناک ہیں، شوگر کے برعکس وہ ناقابل برداشت ہیں جیسے کینسر، خشکیں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

نگاہوں سے اس نانہجار کو گھورا کیونکہ اختلاف رائے حضرت کو بالکل پسند نہ تھا اور اس سے ان کا بلڈ پریشر مزید بڑھ جاتا تھا کہ اب ان میں بلڈ تو کم ہی رہ گیا تھا بس پریشر ہی پریشر تھا اور اسی پر ان کا گزارا تھا۔ بیوی تو برداشت کرتی نہ تھی اس لئے مریدوں کا دم غنیمت تھا۔ سوچتا ہوں مرید نہ ہوتے تو حضرت صاحب دماغ کی شریان پھٹنے سے کب کے فوت ہو چکے ہوتے۔ گو ان کے اکثر مرید تو صُمٌ بُکمٌ عُمٌ ہی تھے جنہوں نے کبھی اپنا دماغ استعمال کرنے کی زحمت ہی نہ کی تھی۔ حضرت صاحب سچ جھوٹ جو فرماتے تھے آمین کر دیتے تھے مگر چند ایک جدید تعلیم کی بدولت خراب ہو گئے تھے اور کبھی کبھار اعتراض کر دیا کرتے تھے۔

مذکورہ مرید بھی انہی میں سے ایک تھا بات اس کی ٹھیک تھی لیکن اگر حضرت اس کی بات تسلیم کر لیتے تو دوسرے اندھے مریدوں پر برا اثر پڑتا اس کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت نے فرمایا۔ ''دیکھو کینسر کا تو پھر بھی کسی قدر علاج موجود ہے ایک بار کورس لگے تو کچھ ماہ بعد ہی دوبارہ کورس کی ضرورت پڑتی ہے یہ تو نہیں کہ صبح شام سوئیاں چبھوائی جائیں اور وہ بھی اکثر اپنے ہاتھوں اور نازک جگہوں پر باقی جہاں تک تکلیف کا تعلق ہے تو وہ تو ہوتی ہی ہوتی ہے۔ آخر بیماری جو ہوئی لیکن اگر بندہ بیماری کا عادی ہو جائے تو یہ معمول کی بات ہو جاتی ہے اور بندہ اس سے لطف اندوز بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بدپرہیزی کر کے بیماری سے پنگا لیتا ہے نتیجے میں وہ بندے کو لمبا کر دیتی ہے۔ پھر بندہ دوائی کا سہارا لے کر دوبارہ حالات کو نارمل کر لیتا ہے۔ یہ آنکھ مچولی مرتے دم تک چلتی رہتی ہے۔

حضرت نے بات ختم کی تو مریدین سر دھن رہے تھے جبکہ میرا جی تو ان کی دھنائی کرنے کو چاہ رہا تھا۔ مذکورہ مرید بھی الٹے سیدھے دلائل سے مطمئن نہ بھی ہوئے تھے تو ان کے جلال سے چپ تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے پوچھا کہ حضرت آپ کا تجربہ شوگر تک ہی محدود ہے یا کسی اور بیماری کے بارے میں بھی ہماری معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں تو بولے کہ اس پچاس سالہ عمر عزیز میں شاید ہی کوئی بیماری ہو جس سے دست پنجہ نہ ہوا ہو اس لئے ہر بیماری کا حال بیان کر سکتا ہوں لیکن شوگر کے علاوہ اگر کوئی بیماری میرے لئے سب سے زیادہ تشویش ناک ہے تو وہ نزلہ زکام ہے جو کہ دراصل ایک بیماری نہیں بلکہ اس بیماری کا آغاز عموماً سرد یا گرد آلود ہوا کے باعث ہوتا ہے۔ اوّل اوّل چھینکیں آتی ہیں اور نزلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں بار بار خالص پانی ناک سے خارج ہوتا ہے اور بندہ کم از کم تین دن کے لئے کسی محفل میں بیٹھنے، کوئی کام کرنے حتیٰ کہ سونے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ اس دوران دوا لو یا نہ لو تین دن بعد نزلہ گاڑھا ہو جاتا ہے اور بالآخر زکام میں بدل جاتا ہے جس سے سانس کی تنگی پیدا ہوتی ہے اور دمے کی سی کیفیت ہو جاتی ہے جو کہ مزید تین دن کے بعد ترقی کر کے کھانسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یوں کھانسی اور بلغم کے باعث بندہ ایک بار پھر کسی کے پاس بیٹھنے کے قابل نہیں رہتا۔ اب جوشاندے سٹرپ سلز اور کھانسی کے شربتوں اور اینٹی بائیوٹک ادویات کا نیا دور چلتا ہے جو کہ کم از کم ایک ہفتے تک جاری رہتا ہے۔ اس کے ساتھ سر درد، بخار اور پھیپھڑوں میں درد بھی بونس میں ہوتا ہے اور اگر اس کی ٹھیک خاطر داری نہ کی جائے یعنی اسے سیریس نہ لیا جائے اور غفلت ہوتی جائے تو یہ ٹی بی کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کا علاج تین ماہ سے ایک سال تک جاری رہ سکتا ہے اور اس سے پھیپھڑے اور معدہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت نے محفل برخاست کر کے مریدین کی جاں بخشی کر کے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

اساں جے لٹیرے

لالہ کا ماتھا ٹھنکا اور اس کے اندر خطرے کا الارم بج اٹھا۔ اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ دل میں آئی کہ وہ فوری طور پر دکان سے باہر ہو جائے اور بھاگ لے۔

محمد نذیر ملک

☆

خیبر میل رات کے اندھیرے میں گرد اڑاتی ''چھکا چھو'' دوڑے چلی جا رہی تھی۔ یہ روہڑی جنکشن کراس کر کے کوئٹہ کی جانب رواں دواں تھی۔ 5 نمبر ڈبے میں مسافروں کی اکثریت سو رہی تھی۔ اوپر کی برتھ والے مسافر مزے میں تھے۔ وہ آزادی سے پاؤں پسارے ڈبے کے ہچکولوں کے ساتھ ہلارے کھاتے محوِ خواب تھے۔ البتہ نیچے والی سیٹوں کے مسافر کافی پھنس کر بیٹھے تھے۔ ڈبے میں معمول کے مطابق رش تھا۔ نوجوان ایک دوسرے کے کندھوں پر سر گرائے بیٹھے بیٹھے سو رہے تھے اور بوڑھے فقط اونگھ رہے تھے۔ بچے ماؤں کی گود میں دبکے دنیا و مافیہا سے بے خبر میٹھی نیند سو رہے تھے۔

لالہ فیروز بھی ان 5 نمبر ڈبے کے مسافروں میں آن بیٹھا تھا۔ اسے کوئی ڈھنگ کی سیٹ نہیں ملی تھی۔ بس نیچے والی برتھ کے ایک کونے میں ٹک گیا تھا۔ وہ لودھراں جنکشن سے اس ریل گاڑی میں سوار ہوا تھا اور اب تک تین ڈبے تبدیل کر چکا تھا۔ لالہ فیروز ایک منجھا ہوا جیب تراش تھا۔ وہ اب تک دسیوں مسافروں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر چکا تھا۔

5 نمبر ڈبے میں داخل ہوتے ہی دروازے کے ساتھ کھڑے تین مسافروں سے ٹکراتا اور ان کی جیبیں صاف کرتا ہوا وہ موجودہ سیٹ تک پہنچا تھا۔ اب وہ اس آدمی سے بھی کم جگہ کی سیٹ پر سمٹا سمٹایا اڑسا ہوا تھا۔ آتے ہی اس کی تیز نظروں نے اس برتھ کی قیمت کا بخوبی اندازہ لگاتے ہوئے اپنے آپ کو بمشکل تمام برتھ کے کونے میں اڑس لیا تھا۔ اس برتھ کے تقریباً تمام مسافر جاگ رہے تھے۔ لالہ فیروز کے چہرے مہرے اور منکسر المزاجی سے متاثر ہو کر میمن سیٹھ کالی داس اپنی زیور سے لدی پھندی جواں سالہ پتنی کی جانب ڈھلک گیا اور سیٹھانی نے بھی اپنے 4 سالہ بیٹے کو اٹھا کر گود میں بھر لیا۔

میمن سیٹھ اور سیٹھانی لالہ کا قیمتی شکار تھے۔ وہ سیٹھ

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کالی داس سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اب تک کی سیٹھ جی کی لی گئی نظری جامہ تلاشی میں لالہ فیروز نے سیٹھ کی واسکٹ کی اندرونی جیب میں نوٹوں کا بنڈل دریافت کر لیا تھا جبکہ نیچے پہنی ہوئی صدری کے اندر بائیں جانب والی جیب میں بھی لالہ نے خاصی نقدی کی جانکاری حاصل کر لی تھی۔ علاوہ ازیں سیٹھ کی دائیں ہاتھ کی چھوٹی اور ساتھ والی انگلی میں سونے کی انگوٹھیاں جن پر قیمتی نگ جڑے تھے لالہ کا دل لبھا رہی تھیں۔

ادھر سیٹھانی بھی کافی بھاری بھرکم زیور سے خوب آراستہ تھی۔ کانوں میں تین تین خاصی وزنی بالیاں جھول رہی تھیں۔ انگوٹھیوں سے انگلیاں بھری تھیں۔ گلے کا ہار بھی نہایت قیمتی تھا۔ حتیٰ کہ چار سالہ مرلی منوہر کو بھی اچھی خاصی انگوٹھی پہنا رکھی تھی اور اس کے گلے میں کالی ماتا کی تصویر والا سونے کا لاکٹ بھی لٹک رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر لالہ فیروز کو لگا کہ وہ گاڑی کے 5 نمبر ڈبے میں نہیں بلکہ کسی جوہری کی بڑی دکان میں گھس آیا ہے۔ اس کی باچھیں کھل گئیں گویا اس کے وارے نیارے ہو گئے۔ لہٰذا لالہ، سیٹھ کالی داس سے زیادہ سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بچے کو اپنی گود میں لینے کی کافی کوشش کر ڈالی لیکن لڑکا ہوشیار نکلا۔ وہ لالہ کے ہاتھ نہ آیا۔ لالہ نے اپنی جیب سے دو عدد ٹافیاں نکال کر بچے کو پچکارا اور اسے دینے کو ہاتھ بڑھایا۔ ٹافیاں بچے نے فوراً پکڑ لیں اور انہیں کھول کر کھانے لگا۔ لالہ فیروز نے لودھراں سے خیبر میل میں سوار ہونے سے قبل پلیٹ فارم سے درجن بھر کیلے پکڑ لئے تھے جو اس نے سیٹھ کے سامنے پیش کر دیئے۔ سیٹھ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پانچ عدد کیلے ایک ساتھ توڑ لئے۔ دو اپنے لئے، دو اپنی پتنی اور ایک بالکے کے لئے۔ پانچ کیلوں سے بات نہ بنی تو سیٹھ نے دوبارہ اپنی نظریں کیلے کے تھیلے پر گاڑھ دیں۔ لالہ نے بقیہ کیلوں والا تھیلا سیٹھ کالی داس کے حوالے کر دیا بقیہ کیلے سیٹھ نے خوب رغبت سے کھائے۔

کچھ ہی دیر میں سیٹھ کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز گونجنے لگی جو آہستہ آہستہ دھماکوں میں تبدیل ہو گئی۔ تب لالہ فیروز نے سیٹھ پر پہلا ہاتھ مارا اور کمال ہوشیاری سے سیٹھ کی اندرونی جیب سے نوٹوں کا بنڈل اڑا لیا۔ اب اس کی نظریں سیٹھ کی دونوں انگوٹھیوں پر تھیں۔ ادھر سیٹھ نے پہلی بار جب انگوٹھیاں پہنی تھیں تو اس کا جسم کافی ہلکا ہو گا لیکن اس کے بعد جب اس کے جسم پر موٹاپے نے یلغار کی تو سیٹھ کی انگلیاں انگوٹھیوں کے سائز سے زیادہ موٹی ہو گئیں اور انگوٹھیاں انگلیوں میں بے طرح دھنستی چلی گئیں لیکن اس کا انتظام بھی لالہ نے کر رکھا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک خاص قسم کا کٹر ہنوا رکھا تھا اور اسے اپنے کام میں مہارت حاصل تھی۔ ذرا سی دیر میں سیٹھ کی دونوں انگلیاں انگوٹھیوں کی قید سے آزاد تھیں اور ان کی جگہ انگلیوں پر انگوٹھیوں سے بنے صرف دو گڑھے رہ گئے۔

اب لالہ کا اگلا شکار سیٹھانی کا زیور تھا۔ سیٹھانی سیٹھ کالی داس کے کندھے پر گہری لمبے خراٹے لے رہی تھی۔ لالہ کے لئے یہ پوزیشن نہایت آئیڈیل تھی۔ اس نے گاڑی کے ہچکولوں کی رفتار میں ہچکولے کھاتے ہوئے نہایت استادی سے پہلے سیٹھانی کی اوپر والی جانب کی بالیاں نوچیں پھر وہ اس کی انگوٹھیوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ ایک ایک کر کے سیٹھانی کی تمام تر انگلیاں انگوٹھیوں سے محروم ہو گئیں۔ اس کے بعد آخر میں مرلی منوہر کے گلے سے لاکٹ اور انگلی سے انگوٹھی اڑانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل نکلا۔ تھوڑی سی دیر میں اسے یوں لگا کہ وہ فی الواقع کسی جوہری کی دکان سے خوب جی بھر کر زیور کی خریداری کر کے نکلا ہے۔

اس اثناء میں گاڑی ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ

رک گئی۔ غالباً کسی نے زنجیر کھینچ ڈالی ہو گی۔ کئی ایک مسافر جاگ اٹھے۔ سیٹھ اور سیٹھانی کے خراٹے بھی ہلکی ہلکی غراہٹ میں تبدیل ہو گئے اور اب سیٹھانی نے سیٹھ کے کندھے سے سر اٹھا لیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لالہ نے سیٹھانی کے دوسرے کان کی دو بالیاں کاٹ لیں۔

لالہ فیروز نے کھڑکی سے باہر دیکھا، باہر گھپ اندھیرا تھا لگتا تھا گاڑی کسی ویرانے میں کھڑی ہوئی تھی۔ لالہ نے گاڑی سے باہر نکلنے میں ذرا سا وقت بھی ضائع نہیں کیا۔ مسافر اپنے اپنے ڈبوں کی کھڑکیوں سے باہر جھانک رہے تھے۔ باہر اندھیرے میں اکا دکا مسافر گاڑی سے نیچے بھی اتر آئے تھے۔ ابھی رات کافی باقی تھی۔ لالہ فیروز گاڑی کے پچھلے ڈبوں کی طرف چل پڑا وہ دو ڈبے چھوڑ کر تیسرے میں جا گھسا۔ لالہ نے سارا مال مسروقہ ایک چمڑی بیگ میں بھرا ہوا تھا اور بیگ کو نہایت مضبوطی سے تھامے اپنے پہلو میں دبائے ہوئے تھا۔ اس نے بیگ کی زنجیر اپنے گلے میں ڈال رکھی تھی، اس نے اپنی جانب سے اس بیگ کو ہر لحاظ سے محفوظ کر رکھا تھا۔

یہ گاڑی کا 8 نمبر ڈبہ تھا۔ ڈبہ کے مسافر نیند کی غنودگی میں ایک دوسرے سے گاڑی رکنے پر استفسار کر رہے تھے۔ کوئی سٹیشن آ رہا تھا؟ سگنل ڈاؤن نہیں ہو گا؟ باہر گھپ اندھیرا ہے...... جتنے منہ اتنی باتیں۔ 8 نمبر ڈبے میں کچھ بلب نہ ہونے کی وجہ سے نسبتاً اندھیرا تھا۔ لالہ فیروز تیز نظروں سے راستہ ٹٹولتا ہوا ایک خالی سیٹ پر جا بیٹھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک اور مسافر بھی لالہ کے ساتھ آن بیٹھا۔ رات کی خنکی کی وجہ سے اس مسافر نے اپنا منہ سر چادر میں لپیٹا ہوا تھا لالہ نے اسے بے ضرر سا مسافر جانتے ہوئے اس سے خاصی بے اعتنائی برتی۔ ادھر مسافر بھی لگتا تھا زیادہ میل جول بڑھانے کے حق میں نہ تھا۔ رسمی سے جملے کہہ کر دونوں چپ سادھ کر ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ لالہ فیروز کے دل میں اب مزید مال بٹورنے کی خواہش نہیں رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آج رات کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ وہ مطمئن ہو کر اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

گاڑی دوبارہ چل پڑی اور رات کے اندھیرے میں اپنی منزل کی طرف فراٹے بھرنے لگی۔ جو مسافر جاگ اٹھے تھے انہوں نے پھر سے نیند کی چادر اوڑھ لی۔ لالہ فیروز کو بھی نیند کے جھونکے آنے لگے لیکن وہ بار بار سر جھٹک کر اپنے آپ کو بیدار رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ نہ جانے رات کا وہ کون سا کھوٹا لمحہ تھا جب لالہ کو نیند کی جھپکی نے آ لیا اور لالہ بیگ سمیت نیند کی وادی میں اتر گیا۔

گاڑی کے اچانک کسی سٹیشن پر رکنے کے ہلکے سے جھٹکے سے لالہ کی آنکھ کھل گئی تو اس نے سب سے پہلے اپنے بیگ کو ٹٹولنے کی کوشش کی لیکن بیگ وہاں ہوتا تو ملتا۔ وہ بدک کر اٹھ بیٹھا جیسے اسے کسی بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔ ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ چادر والا چور لالہ سے ہاتھ کر گیا تھا۔

اس کا مطلب ہے کوئی استادوں کا استاد بھی اس گاڑی میں سفر کر رہا ہے لالہ نے دکھ کے ساتھ سوچا۔

لالہ کا سر چکرا گیا۔ وہ بھری گاڑی میں لٹ گیا تھا۔ چوروں کو مور پڑ گئے۔ اس نے لوٹنے والے استاد کو داد دی اور اپنی غفلت پر خود کو کوسنے لگا۔ لالہ کی زبان پر بے اختیار سرائیکی گانے کے بول آ گئے۔

”اساں جگ لٹیرے، تساں لٹیا ساں کوں“

اب لالہ فیروز تہی دامن تھا۔ اسے یوں لگا کہ وہ مال اس کے گھر سے لوٹا گیا ہے۔ جو مال اس نے اپنا بنایا ہوا تھا وہ ہاتھ آ کر بھی ہاتھ سے نکل گیا اور اب کسی دوسرے کی جیب میں چلا گیا۔ ذرا سی دیر پہلے اس نے جو اپنے سہانے مستقبل کے خواب بنے تھے وہ چکنا چور ہو

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

گئے۔ اس کی ساری محنت اکارت گئی۔ ایسے موقعے زندگی میں بار بار نہیں آتے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے ہی گال پر طمانچہ دے مارا۔

اس نے سوچا کہ یہ استادوں کا استاد کون ہو سکتا ہے جس کی شکل بھی اس نے نہیں پہچانی تھی اور وہ اپنا ہاتھ دکھا گیا۔ گاڑی ابھی تک سٹیشن پر کھڑی تھی۔ اس نے جلدی میں سوچا کہ اسے لوٹنے والا اس سٹیشن پر اتر چکا ہوگا۔ گاڑی میں اس کی تلاش فضول ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ ساتھ ہی گاڑی سے اتر آیا۔ اس موہوم سی امید کے ساتھ کہ شاید اس کا صیاد اس کے ہاتھ آ جائے۔ اس نے پلیٹ فارم پر چادر والے چور کو بہت ڈھونڈا تاہم سٹیشن پر کئی دیگر افراد نے بھی چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ اسے اپنا چور کہیں نہ ملا نہ ہی وہ اسے پہچانتا تھا۔ رہ رہ کر اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ آج زندگی میں پہلی بار تگڑا مال ہاتھ لگا تھا جو ہاتھ آ کر بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ سٹیشن سے باہر نکل آیا۔ اکا دکا مسافر اب تک گیٹ سے باہر نکل رہے تھے۔ باہر تانگے کھڑے تھے اور مسافر آ آ کر تانگوں میں بیٹھ رہے تھے۔ اب اس کی منزل تو کوئی تھی نہیں، وہ باہر نکل کر حیران کھڑا تھا کہ ایک تانگہ والا ''ایک سواری'' کی رٹ لگائے اس کے پاس آ کر رک گیا۔ بابو جی کہاں جانا ہے؟ کوچوان نے لالہ سے پوچھا۔

ادھر لالہ اپنے خیالوں میں الجھا ہوا اپنے آپ سے پوچھنے لگا۔ ''میں نے کہاں جانا ہے؟''

بولا۔ کہیں بھی۔ گڑھی خیرو جاؤ گے؟ تانگے والے نے پھر پوچھا۔

''وہیں سہی''۔ لالہ نے کہا اور لالہ فیروز چپکے سے پیچھے بیٹھی دو سواریوں کے درمیان پھنس کر بیٹھ گیا۔ اس نے پھر سوچا کہ وہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ اسے لاکھوں کا نقصان ہو گیا تھا۔

جیب کترے کی اپنی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ شکار اسے جدھر لے چلے وہ اُدھر کو ہی ہو لیتا ہے وہ اس کی منزل ہوتی ہے۔

تانگہ جیکب آباد کے سٹیشن سے سواریاں لے کر گڑھی خیرو جانے والی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ دن کا سپیدا نمودار ہو چکا تھا۔ تانگہ گڑھی خیرو پہنچا تو سورج نکل چکا تھا۔ سواریاں تانگے سے اترنے لگیں۔ لالہ فیروز بھی اتر آیا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ سب سے پہلے اس نے سونے کے لئے ایک متوسط سے ہوٹل میں کمرہ لیا۔ نہا دھو کر ناشتہ کیا۔ کمرے میں آ کر سونے کے لئے بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اسے لگا کہ اس کی قمیص کی پہلو والی جیب میں کوئی چیز ہے اسے نکال باہر کرنے کے لئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھ میں مرلی منوہر کے گلے سے اتارا ہوا لاکٹ اور انگلی سے اتاری ہوئی انگوٹھی آ گئی۔ اس کی دانست میں اس نے سارا مال اپنے سے چوری ہو جانے والے بیگ میں ڈال دیا تھا جبکہ یہ دونوں چیزیں اس نے جلدی میں اپنی پہلو والی جیب میں ڈال دی تھیں لہٰذا یوں یہ چیزیں اس کے پاس بچ رہیں۔

اس نے سوچا کہ وہ جب سو کر اٹھے گا تو صرافہ بازار جا کر انہیں بیچ آئے گا۔ کیونکہ اس کے پاس پیسوں کی کمی تھی۔ اس کی آنکھ شام کو کھلی۔ وہ سیدھا صرافہ بازار جا پہنچا۔ دو ایک دکانوں سے سونے کا بھاؤ پوچھا اور اگلی ایک دکان کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ بھاؤ پوچھا جو تقریباً ایک جیسا ہی تھا۔

اس نے لاکٹ اور انگوٹھی کاؤنٹر پر بیٹھے نوجوان سے لڑکے کی جانب بڑھا دی اور کہا کہ وہ انہیں بیچنا چاہتا ہے ان کا وزن کر لو اور جتنے پیسے بنتے ہیں دے دو۔

لڑکا دونوں چیزوں کا وزن کرنے لگا۔ اسی دوران ایک سیٹھ نما آدمی دکان میں آ کر کاؤنٹر پر جا بیٹھا۔ لڑکے نے کہا۔ ''بابو یہ کام آپ سنبھالیں۔ یہ صاحب یہ مال

فروخت کرنا چاہتے ہیں''۔ اور اس نے ساتھ ہی لاکٹ اور انگوٹھی باپ کی طرف سرکا دی۔ باپ نے دونوں چیزوں کو بغور دیکھا پھر سر جھکا کر عینک کے اوپر سے لالہ پر گہری نظر ڈالی اور کہا بیٹھیں مہاراج تشریف رکھیں کیا پئیں گے؟ کہا کچھ نہیں آپ ذرا جلدی سے یہ کام نمٹا دیں۔ صراف نے کہا کہ دراصل مال چیک کرانے کے لئے دوسری دکان پر بھیجا جاتا ہے بس تھوڑی ہی دیر میں وہاں سے چیک ہو کر آ جائے گا۔ ساتھ ہی اس نے کاغذ پر کچھ لکھا، لاکٹ انگوٹھی اور وہ کاغذ دے کر لڑکے کو باہر بھیج دیا اور خود لالہ فیروز سے گپ شپ لگانے لگا۔ دکان کے سامنے سے چائے والا لڑکا گزرا تو صراف نے ایک پاؤ دودھ پتی کا آرڈر بھی دے دیا۔

لالہ کا ماتھا ٹھنکا اور اس کے اندر خطرے کا الارم بج اٹھا۔ اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ دل میں آئی کہ وہ فوری طور پر دکان سے باہر ہو جائے اور بھاگ لے۔ وہ کوئی اناڑی تو تھا نہیں اس طرح کے خطروں کی پیشگی بو پا لیتا تھا اور ان خطرات سے نمٹنا بھی اسے آتا تھا۔

ادھر صراف اسے باتوں میں الجھائے رکھنے کی برابر کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران چائے بھی آ گئی۔ جو صراف نے نہایت لجاجت سے لالہ کو پیش کر دی لیکن لالہ دکان سے بھاگ نکلنے کی فکر میں تھا۔ اس کے پاس چائے پینا تو کیا سوچنے کا بھی وقت نہیں تھا۔

آخر لالہ بغیر چائے پئے اٹھ کھڑا ہوا لیکن آج لالہ کی قسمت کی گنتی الٹی چل رہی تھی۔ اس نے جونہی دکان سے اپنا پہلا قدم باہر رکھا دو ہٹے کٹے پولیس اہلکاروں نے آگے بڑھ کر اسے جکڑ لیا۔ ان کے پیچھے سیٹھ کالی داس بھی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

دراصل یہ دکان سیٹھ کالی داس ہی کی تھی۔ سیٹھ کالی داس نہ صرف خود ایک معروف صراف تھا بلکہ اس بازار کی صرافہ یونین کا صدر بھی تھا۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

ادھر سیٹھ بھی اسی گاڑی سے جیکب آباد سٹیشن پہنچا تھا جس سے لالہ فیروز اترا تھا۔ سیٹھ کو لینے اس کی گاڑی آئی ہوئی تھی جبکہ لالہ تانگہ میں سوار ہوا تھا۔ لہٰذا سیٹھ گرمی خیرو پہلے پہنچ گیا اور گھر پہنچ کر اپنے لٹنے کی خاندان والوں کو خبر کر دی۔

لالہ فیروز جب شام کو اس دکان میں داخل ہوا تو اس وقت وہاں جو نوجوان کاؤنٹر پر بیٹھا تھا وہ سیٹھ کالی داس کا بھتیجا تھا اور اوپر سے سیٹھ کا بھائی آ گیا۔ سیٹھ کے بھائی کو اپنے بھائی سے ہونے والے ہاتھ کا علم تھا اس نے جب لاکٹ اور انگوٹھی دیکھی تو اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی دونوں اشیاء پہچان لیں اور بیٹے کو لاکٹ اور انگوٹھی دوسری ڈکان سے چیک کرانے کے بہانے پکڑا دی اور ساتھ اسے چٹ پر لکھ کر ہدایات دیں کہ وہ اپنے چچا کالی داس کو خبر کر دے کہ اس کا چور ڈکان میں بیٹھا ہے اور وہ فوری طور پر پولیس لے کر ڈکان پر پہنچ جائے اور خود لالہ کو باتوں اور چائے وغیرہ میں الجھائے رکھنے کی کوشش میں لگ گیا تاکہ پولیس کے پہنچنے تک کا وقت حاصل کر سکے۔ سیٹھ کالی داس کو جونہی بھائی کا پیغام ملا وہ پولیس لے کر ڈکان پر آ گیا۔

دوسری جانب لالہ فیروز کی قسمت اسے سیٹھ کالی داس ہی کے شہر لے آئی پھر یہاں تک بس نہ ہوا بلکہ اپنی جیب سے برآمد ہونے والا سیٹھ کی چوری کا بقیہ مال بیچنے کے لئے بھرے بازار میں، انجانے میں اس کی ڈکان میں جا گھسا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سیٹھ کالی داس کا بھی اس شہر سے تعلق تھا۔ نہ ہی اس نے گاڑی میں سیٹھ سے یہ اہم سوال پوچھا تھا۔ ویسے لالہ فیروز نے یہ تو بھانپ لیا تھا کہ خطرہ ہے اس نے خطرے کی بو پا لی تھی لیکن حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اُسے لے ڈوبی۔ اس نے بھاگ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور بھاگا بھی لیکن وقت کے پھیر میں گڑبڑ ہو گئی۔ اس نے جونہی ڈکان سے باہر قدم رکھا پولیس ڈکان کے دروازے پر پہنچ چکی تھی اور اس نے لالہ کو دبوچ لیا، ورنہ دو چار سیکنڈ کے وقفہ میں لالہ ہجوم میں گھل مل گیا ہوتا۔

سیٹھ کالی داس نے اپنا چور پہچان لیا تھا وہ بہت خوش تھا کہ اسے اپنا پورا چوری شدہ مال واپس مل جائے گا۔

لالہ فیروز کو تھانہ لے جایا گیا اور اس پر خیبر میل کے 5 نمبر ڈبہ سے سیٹھ کالی داس اس کی بیوی اور بچے کا سوتے میں تمام تر زیور اور ایک لاکھ روپیہ نقد چرانے کا الزام لگایا گیا۔ لالہ نے پولیس والوں کو بار بار بتایا کہ چوری کیا ہوا مال اس سے کسی اور نے چوری کر لیا لیکن اس کی بات کسی نے نہیں مانی۔

سیٹھ کالی داس اثر و رسوخ والا ہندو بنیا تھا۔ پولیس نے باقی کا مال برآمد کرانے کے لئے لالہ فیروز کو تشدد کی چکی میں پیس ڈالا۔ ادھر لالہ کے پاس مال ہوتا تو برآمد کراتا۔ وہ جس ہوٹل میں آ کر ٹھہرا تھا وہاں اس کے کمرے کی بھرپور تلاشی لی گئی لیکن وہاں سے بھی کچھ نہ نکلا۔ حد یہ کہ لالہ نے سیٹھ کی جو رقم لوٹی تھی وہ بھی بیگ میں جاتی رہی تھی۔ صرافہ بازار کے ڈکانداروں سے لالہ کی شناخت پریڈ بھی کرائی گئی کہ کسی کے ہاں اس نے مالِ مسروقہ بیچا ہو؟ دو ڈکانداروں نے صرف اتنی گواہی دی کہ یہ شخص ان کے پاس آیا تھا لیکن فقط سونے کا بھاؤ پوچھ کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے اپنے پاس پلے سے کوئی مال نہیں دکھایا تھا۔

پولیس نے دو بار لالہ کا جسمانی ریمانڈ لیا لیکن وہ بقیہ مسروقہ مال برآمد کرانے میں ناکام رہی۔ تاہم لاکٹ اور انگوٹھی کی برآمدگی کو بنیاد بنا کر سیٹھ کالی داس کی ایما پر پولیس نے لالہ فیروز کے کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا اور لالہ کو خاصی مدت کی سزا ہو گئی۔

❁

Scanned By BooksPK

آکاس بیل

حویلی سے نکالنے کا ڈراوانہ دیں مجھے، جس حویلی کی شان و شوکت پر آپ اکڑ رہے ہیں اس میں چچا شنکر کا بھی حصہ ہے جو آپ نے دبا رکھا ہے۔

قسط:2 ☆ ---------- محمد رضوان قیوم

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"واہ بھئی واہ! ارے اس گاؤں میں حسن کی دیوی کہاں سے اتر آئی؟" لالہ جی نے بے اختیار خوش ہوکر کہا۔

اب لالہ جی نے دیپا کے حُسن و جمال سے متاثر ہو کر اپنا لہجہ بدلا اور بڑے دھیمے لہجہ میں مخاطب ہوکر اسے کہا۔

"بیٹی ذرا میرے قریب آؤ"۔ ان کے لبوں سے یہ الفاظ سن کر وہاں موجود تمام لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔ دیپا شرماتے ہوئے لالہ کے قریب گئی تو اُس نے دیپا سے چند باتیں کیں۔ دیپا نے شرما شرما کر اسکے جوابات دیئے۔

اسی دوران مکیش نے لالہ کی جانب مخاطب ہوکر کہا۔

"لالہ جی! آپ کا بیٹا کلدیپ میری بیٹی کی جانب ایسے ہی نہیں فریفتہ ہوا تھا، اس نے جب اسے دیکھا تھا تو وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آیا تھا۔ ہاں تو بیٹی دیپا! یہ بھید تو کھول دو کہ کلدیپ کس طرح تمہارے حسن و عشق کا شکار ہوا؟" لالہ جی نے پوچھا۔

دیپا شرما کر خاموش ہوگئی۔

"بولو بیٹی! شرماؤ نہیں"۔ کلدیپ کی ماں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی مجھے یہ تو کم از کم پتا چلے کہ تم اس کی جانب راغب ہوئی تھی یا وہ خبیث"۔

دیپا نے بتلایا کہ میں کانپور شہر میں اپنی خالہ کے پاس رہنے گئی تو وہاں ایک دن اتفاق سے کلدیپ اپنے کسی دوست کے ساتھ خالہ کے گھر آیا تھا۔ میرے خالو دراصل کاٹھ کی چارپائیوں کے بڑے اچھے کاریگر ہیں۔ میرے خالو نے ان دونوں کو اپنے گھر میں بٹھالیا تھا۔ کلدیپ کے دوست نے میرے خالو کو کاٹھ کی تین چارپائیوں کا آرڈر دیا تھا۔ خالو نے ان دونوں کے لئے چائے بنوائی تھی۔ اس وقت دوسرا اتفاق یہ ہوا کہ خالہ اس وقت گھر نہ تھی۔ میں نے ہی ان دونوں کے لئے چائے بنائی تھی۔ میں جب ٹرے میں ان دونوں کے لئے چائے لے کر آئی تو کلدیپ مجھے دیکھ کر چونک گیا اور میرے سراپے کا بڑی سنجیدگی سے جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ پہلے تو میں اس کی نگاہوں کو سمجھنے سے قاصر رہی لیکن جب اس نے دو تین بار مسکرا کر مجھے دیکھا تو میں اُس وقت سمجھی کہ یہ بدنگاہ ہے۔ میں نے جھٹ سے ان دونوں لڑکوں کے ہاتھ میں چھلکتی چائے پکڑائی اور اپنے کمرے میں پریشان کن حالات میں چلی گئی۔ یہ دونوں کافی دیر تک خالو سے چارپائیوں کے بارے میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ مجھے خالو پر اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ انہوں نے مجھے ان دونوں غیر لڑکوں کے لئے چائے بنانے کے لئے کیوں کہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد گھر میں جب میری خالہ آئیں تو میں نے انہیں ساری بات بتلائی۔ خالہ کو بھی غصہ آیا۔ انہوں نے خالو کو اس بات پر بہت لعن طعن کی۔ انہوں نے خالہ کو کہا کہ میں آئندہ احتیاط کروں گا لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ کلدیپ ایک سلجھا ہوا لڑکا ہے۔

دوسری صبح میں جب اپنی خالہ کے ساتھ بازار جا رہی تھی تو کلدیپ ہماری گلی کے نکڑ میں کھڑا ہوا تھا۔ میں نے خالہ کو اس کی نشاندہی نہیں کی تھی۔ میں اُسے نظر انداز کرتے ہوئے خالہ کے ساتھ سڑک کی جانب منہ کرکے چلتی رہی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کلدیپ میرا پیچھا کرتا ہوا بہت قریب آ گیا تو اس نے میری خالہ کو کہا۔

"میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں"۔

خالہ نے اُسے گھور کر کہا کہ تمہارا یہ کیا طریقہ ہے، تم بیچ بازار میں ہم دونوں کا پیچھا کر رہے ہو۔

"دیکھیں، میں ایک شریف خاندان کا شریف لڑکا ہوں"۔ کلدیپ نے کہا۔ "اسی لئے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں"۔

"تم نے جو بھی بات کرنی ہے وہ گھر آ کر کرو"۔ خالہ نے اسے کہا۔

"جی میں کب آؤں؟"

"تم بے شک آج شام کو آ جاؤ لیکن اس شرط پر آنا کہ جب میرے پتی گھر میں ہوں"۔

شام کو کلدیپ خالہ کے گھر آیا اُس نے پہلے خالو کے بارے میں پوچھا۔ وہ کیونکہ گھر میں موجود تھے اس لئے خالہ نے اُسے آنگن میں آنے کی اجازت دے دی۔ کلدیپ انار، انناس اور کافی فروٹ لے کر آیا تھا۔ خالو اس غرض سے اس کے سامنے خاموش بیٹھے رہے کہ وہ اپنے دل کی بات ان کے سامنے کرے۔

کلدیپ نے بغیر شرمائے بڑے اعتماد سے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے آپ مجھے وچن دیں کہ میری بات کا برا نہ مانیں گے اور اگر آپ برا مانیں تو بھگوان کے واسطے مجھ پر طیش زدہ نہیں ہونا اور مجھے تحمل سے جواب دینا"۔

خالو نے اسے کہا کہ تم مجھے کسی شریف خاندان کے لڑکے لگتے ہو مجھے امید ہے کہ تم مجھ سے جو بات کرنے والے ہو وہ مجھے زیادہ بُری نہیں لگے گی۔

کلدیپ خالو کے مزید قریب ہوکر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے دھیمے الفاظ میں اپنے دل کی بات شروع کرتے ہوئے انہیں کہا کہ وہ دیپا کو پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ خالو اس کی باتیں سن کر گہری سوچوں میں پڑ گئے۔

"بیٹا! تم اپنی عمر دیکھو اور جس قسم کی بات تم مجھ سے کر رہے ہو وہ تمہیں زیب نہیں دیتی"۔ توقف کے بعد انہوں نے کلدیپ کو کہا۔ "تم فی الحال اپنی تعلیم پر توجہ دو اور جب تم کسی قابل ہو جاؤ تو اس اہم کام کے لئے اپنے کسی بڑے کو بھیجنا"۔ خالو نے اُسے ذرا سخت الفاظ میں یہ بھی کہا کہ آئندہ یہاں نہ آنا اور اگر تم واقعی دیپا کو پسند کرتے اور اس سے شادی کرنا چاہتے ہو تو تم پر لازم ہے کہ تم اس کا ذکر اپنے بڑوں سے کرو۔

کلدیپ کے جانے کے بعد خالو نے خالہ سے یہ بات ضرور کہی کہ یہ لڑکا شریف ہے لیکن جو یہ دیپا کے بارے میں سوچ رہا ہے وہ قبل از وقت ہے۔

دیپا نے بتایا کلدیپ روزانہ خالہ کی گلی میں آتا تھا۔ ایک آدھ بار میری خالہ نے اس سے پوچھا تھا کہ تمہارا یوں مجنوں عاشقوں کی طرح چکر لگانا ہمیں اچھا نہیں لگتا تو وہ کہتا تھا کہ جب تک دیپا کی جھلک نہ دیکھ لوں مجھے چین نہیں آتا۔

خالہ نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ جتنا وقت تم دیپا کے دیدار کی کے لئے برباد کرتے ہو اگر تم یہی وقت اپنی پڑھائی پر لگاؤ تو تم یقیناً پڑھائی کے میدان میں کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ۔ اگر تم نے یہی وطیرہ اپنائے رکھا تو ہم تمہاری شکایت تمہارے ماں باپ سے کریں گے۔

کلدیپ نے انہیں کہا کہ آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں موقع محل دیکھ کر اپنے ماں باپ سے لازماً بات کروں گا۔ کلدیپ خالہ کے زور دینے پر وہاں سے چلا تو گیا لیکن جاتے جاتے وہ میرے ہاتھوں میں ایک چٹھی دے گیا جو کہ اس کے خون سے لکھی ہوئی تھی۔ اس چٹھی میں اس نے واضح طور پر لکھا تھا۔ "میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا اور میں ہر قیمت پر تجھے حاصل کر کے رہوں گا"۔

میں چند دنوں بعد اپنے گاؤں واپس آ گئی۔

میرے خالو نے ایک چٹھی کے ذریعے کلدیپ کے جنونِ عشق کے متعلق ساری روئیداد میرے پتا کو بتلا دی تھی۔ کلدیپ ایک دن ہمارے گاؤں بھی آیا تھا جہاں میرے پتا نے اُسے یہی کہا تھا کہ وہ اپنے رشتہ کے سلسلہ میں اپنے بڑوں کو بھیجے۔

ایک بار کلدیپ نے مجھے گاؤں کے کنواں کے پاس روکا تھا اور اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کیسا ہوں، کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟ میں نے اُسے اس بات کا تو جواب نہ دیا تھا کہ وہ کیسا ہے لیکن ہاں یہ ضرور کہا تھا کہ اگر میرے ماتا پتا نے آپ کو اور آپ کے بڑوں نے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مجھے پسند کیا تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

دیپا نے سب کے سامنے یہ طویل کہانی سنائی تو لالہ نے اُس سے پوچھا۔

''کیا تمہاری طرف سے کلدیپ کو اظہار محبت ہوا تھا؟''

''بات محبت، اظہار محبت کی نہ تھی''۔ دیپا نے کہا۔

''میں نے اُس سے اس قسم کی کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ خود ہی اس مفروضہ پر قائم ہے کہ میں نے اس سے اظہار محبت کیا تھا''۔

''اس کا مطلب ہے کہ کھوٹ ہماری جانب سے تھا۔ دیپا کا اس معاملہ میں کوئی دوش نہیں ہے''۔ لالہ جی نے برملا اس کا اظہار کیا۔

''بھائی جی! ہم نے آپ لوگوں سے کوئی بات نہیں چھپائی''۔ دیپا کے باپ مکیش نے لالہ جی کو کہا۔ ''جو بات سولہ آنے کھری تھی وہ آپ کے سامنے بیان کردی ہے۔ اب آپ بتلائیں آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ میں یہ بات اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ تاکہ آپ کی جانب سے ہاں یا نہ کوئی فیصلہ کرسکیں''۔

''بھائی! اس کے رشتے کے لئے ہمارے کئی رشتہ داروں، غیروں نے دانت لگائے ہوئے ہیں''۔ دیپا کی ماں نے درمیان میں یہ بات کہی۔

''ہم نے تمہاری لونڈیا کو دیکھ لیا ہے''۔ لالہ جی نے مکیش کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمہاری بیٹی کسی چاند کے ٹکڑے سے کم نہیں۔ لیکن ہم پنڈت سے ان دونوں بچوں کی کنڈلیاں چیک کروائیں گے۔ اگر پنڈتوں نے اپنے علم کے مطابق ہمیں ان دونوں بچوں کی سگائی کی اجازت دے دی تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا اور اگر انہوں نے کوئی اچھا اشارہ نہ دیا تو یہ ہمارے انکار کی مجبوری ہوگی''۔

''اچھا تو آپ ہمیں اپنے فیصلے سے کب تک آگاہ کریں گے؟''

''بس یہی کوئی ہفتہ بعد''۔ لالہ نے کہا۔

واپسی کے وقت لالہ جی نے دیپا کو اپنے پاس بلا کر کچھ لمبے بڑے غور سے دیکھا اور پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پچاس روپے رکھ دیئے۔ اس کے بعد لالہ نے دیپا سے ہلکا سا مسکرا کر سوال کیا کہ بیٹی اگر ہمارے پنڈتوں نے تمہارے حق میں کنڈلی نکال دی تو کیا تم ہماری بہو بننا پسند کرو گی؟

دیپا نے شرماتے اور مسکراتے ہوئے ہلکی سی ہاں میں اپنی گردن ہلا دی۔

واپسی پر مکیش نے لالہ جی اور ہمارے لئے گاؤں کا دیسی گھی، سرسوں کا ساگ، مکھن بطور تحفہ دیا اور وہ اور اس کا بیٹا ہمیں اپنے گاؤں کی حدود تلک چھوڑنے آئے۔

لالہ جی نے میرے ابا اور اماں کو کہا کہ میں عشاء کی نماز کے بعد کلدیپ کی ماں کے ساتھ آؤں گا اور ہم سب باہمی مل کر اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

شام کو لالہ کیدار ناتھ اور سنتو تائی ہمارے گھر آئے۔ ابا نے لالہ جی سے پوچھا کہ گاؤں جا کر اسے کیسا لگا؟

''یار عظیم! اگر سچ پوچھو تو پہلے تو میں دل سے لالہ گاؤں جانا ہی نہیں چاہتا تھا''۔ لالہ جی نے انہیں کہا۔ ''میں اس کے یکسر خلاف تھا۔ میں وہاں خوشی سے نہیں گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے جب سے مکیش کی بیٹی دیکھا ہے تو سچ پوچھو مجھے ایسا لگا جیسے کہ کسی نے گوبر میں زمرد ہیرے کو پھینکا ہوا ہے۔ میرا دل اس امر پر خوش ہے کہ کلدیپ نے گند تو کھایا ہے لیکن سونے کے چمچ سے''۔

''لالہ تُو لمبی تمہید نہ باندھ''۔ ابا نے لالہ جی سے کہا۔ ''صرف یہ بتلا کہ تُو دل سے ان دونوں بچوں کی شادی پر راضی ہے کہ نہیں؟''

''یارا میں دیپا اور کلدیپ کی شادی کرنے

کرنے کا ٹھیک سے فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔ میرا ایک من کرتا ہے کہ کلدیپ کی خوشی اور اس کی پسند کے آگے ہتھیار ڈال دوں لیکن دوسری طرف یہ پہلو بھی دیکھتا ہوں کہ دیپا کے پتا مکیش کا رہن سہن ہمارے رتبہ سے بہت ہلکا اور اُس سے میرا ناطہ جڑنا میری برادری میں میری ناک کٹنے کے برابر ہوگا''۔

''ارے یہ تم ہندوؤں کی برادریوں میں ناک کٹنا، ذات پات کے درمیان تفریق تم لوگوں کو اچھا کام کرنے نہیں دیتی۔ تم مکیش کا سماجی، معاشی رتبہ نہ دیکھو فی الحال یہ دیکھو کہ وہ شریف، بلاغرض معصوم انسان ہے۔ ارے بے وقوف وہ ایک سادہ دیہاتی آدمی ہے اُسے جہاں تم بٹھلاؤ گے بیٹھ جائے گا۔ سب سے بڑھ کر تو یہ دیکھ کہ دیپا کتنی خوبرو، جیسے لاکھوں میں ایک والی لڑکی ہے''۔ ابا نے بے تکلفی سے کہا۔

''ابے تمہارے خاندان میں دور دور تلک عورتوں، مردوں اور بچوں میں کوئی قبول صورت گوری چمڑی والا انسان نہیں۔ تم سارے کے سارے بدشکل، توے کی مانند کالے ہو''۔

لالہ ہنس کر کہنے لگا کہ سالا ذرا کم رکھا کرو تُو نے تو میرے پورے خاندان کے بخیئے ادھیڑ کر رکھ دیئے ہیں۔

اس موضوع پر پوری محفل میں موجود شرکاء کے درمیان طویل بحث مباحثہ اور مشورہ چلتا رہا۔ سب نے لالہ جی کو ذہنی طور پر اس بات پر تیار کیا تھا۔ تُو کچھ نہ دیکھ تو صرف دیپا کا حسن، سادگی، شرافت اور یہ دیکھ کہ وہاں تیرا نبھاہ ہو جائے گا اور لالہ بھیا سب سے بڑھ کر آپ یہ دیکھیں کہ دیپا سے شادی کرنا کلدیپ کی آرزو اور خوشی ہے۔

طویل باہمی مشورہ بحث و مباحثہ کے بعد لالہ نے مجھے کہا کہ یاسو تم جاؤ گھر سے اپنے مجنوں دوست کو بلا کر لاؤ۔

میں بھاگ کر کلدیپ کو بلا لایا۔

کلدیپ بڑے سہمے انداز اور تابعداری کے ساتھ سب کے سامنے آ گیا۔

''بیٹھ جا کسی مجنوں کی اولاد!'' لالہ جی نے آنکھیں نکال کر اسے حکم دیا اور کہا۔ ''مجھے تیرا یہ عشقیہ ڈرامہ ذرا اچھا نہیں لگا۔ تیری عمر ایسے کاموں کی نہیں ہے۔ پڑھنے لکھنے کی عمر میں تو یہ روگ لگا بیٹھا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی بڑا دکھ ہے کہ تُو نے ہمارے خاندان کا نام ڈبونے کے لئے ایک نہایت ہی گھٹیا خاندان میں ناطہ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ تم خود ہی بتاؤ کہ وہ گاؤں، ان کا گھر، پھر معمولی سا کریانہ سٹور...... کسی طرح ہماری شان سے میل کھاتا ہے؟ اسی پر بس نہیں کیا تُو نے بلکہ اس چھوکری کے چکروں میں پڑ کر فیل بھی ہو گیا''۔

''پتا جی! اب تو میں نے میٹرک کر لیا ہے''۔ کلدیپ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''وہ تو مجھے پتا ہے''۔ لالہ جی نے جل کر کہا۔ ''لیکن تُو اس حقیقت کو تو دل سے مان لے کہ تُو نے اپنی زندگی کا ایک قیمتی سال ضائع کر دیا ہے۔ اگر تُو ایک سال پہلے میٹرک کر لیتا تو آج تُو کسی محکمے میں بابو ہوتا''۔

''ستار نے بھی تو مجھ سے پہلے میٹرک کیا تھا۔ اسے کون سی نوکری مل گئی؟'' کلدیپ نے میری طرف اشارہ کر کے جب یہ جملہ کہا تو لالہ نے اس کے کندھوں کو ہلکا سا دھکیلتے ہوئے کہا۔

''اس کی مثال نہ دے''۔ لالہ نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔ ''یہ مسلمان ہے اور تجھے یہ بات نہیں معلوم کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو نوکریاں ڈھونڈنے سے نہیں ملتیں۔ تُو اس وقت صرف اپنی بات کر''۔

''تو پتا جی! آپ نے مجھے یہاں صرف چچا عظیم کے گھر والوں کے سامنے ذلیل کرنے اور یہی بات کہنے کے لئے بلایا ہے؟'' کلدیپ نے غصے سے کہا۔

''یہ تُو مجھ سے کس انداز میں بات کر رہا ہے؟'' لالہ نے طیش کے عالم میں کہا۔ ''میرا تو دل کرتا ہے تجھے ٹھوکریں مار کر اپنی حویلی سے باہر نکال دوں''۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

معاملہ بگڑتے دیکھ کر ابا اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے کلدیپ کو کندھوں سے پکڑ کر اُسے لالہ جی سے دور لے جاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! اس سے پہلے کہ تم دونوں باپ بیٹا کے درمیان بدمزگی ہو جائے تم یہاں سے چلے جاؤ، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے"۔

کلدیپ ابا کے کہنے کے باوجود بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

"حویلی سے نکالنے کا ڈراوا نہ دیں"۔ کلدیپ نے نہایت گستاخانہ لہجے میں لالہ جی سے کہا۔ "آپ جس حویلی کی شان و شوکت پر اکڑ رہے ہیں اس حویلی پر آپ کے چھوٹے بھائی شنکر کا بھی حق ہے جو آپ نے اپنی ہٹ دھرمی سے دبایا ہوا ہے اور دوسرے اس پر ایک حکومتی ادارے آل انڈیا میڈیکل ٹرسٹ کا ملکیتی دعویٰ بھی ہے"۔

کلدیپ کی یہ گستاخانہ باتیں سن کر لالہ جی کا چہرہ غصہ کی وجہ سے آخری حد تک سرخ بلکہ سیاہ ہو گیا۔ اس نے اپنے پاؤں سے جوتی اتاری اور یکے بعد دیگرے اس کے سر، کمر پر کئی وار کئے مگر کلدیپ نے کوئی اثر نہ لیا۔

"میں سب کے سامنے سچ بات کہے بغیر نہ رکوں گا"۔ کلدیپ نے بڑے باغیانہ انداز میں چلا کر کہا۔ "آپ بے شک مجھے جتنا مرضی ماریں بلکہ چاہیں تو جان سے ہی مار دیں"۔

یہ سن کر تو لالہ جی کسی خونخوار جانور کی طرح کلدیپ پر جھپٹ پڑے۔ ابا، اماں نے درمیان میں پڑ کر بڑی مشکل سے کلدیپ کو لالہ جی کے چنگل سے چھڑوایا اور اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔ خدا کے واسطے یہاں سے چلے جاؤ۔ کلدیپ نے اس وقت ابا کی بات مان لی اور چلاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

"ان کا تو دماغ ہمیشہ آسمان پر چڑھا رہتا ہے"۔ کلدیپ کی ماں روتے ہوئے بولی۔ "عظیم بھائی! یہ ایسا انسان ہے جس کے دل میں محبت والی کوئی علامت نہیں بلکہ ہوس، لالچ، نفرت، گھمنڈ بہتا ہے۔ اسے تو اپنی اولاد سے نہیں بلکہ جھگڑے والی بوسیدہ پرانی اینٹوں پر مشتمل حویلی سے لگاؤ ہے۔ مجال ہے کہ آج تک اس نے اپنے بچوں سے میٹھے لہجے میں بات کی ہو"۔

تو اپنی بکواس بند کر حرام زادی!" لالہ کیدار ناتھ نے گرج کر کہا۔ "یہ سب تیرے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے کہ اس کے یہ کرتوت ہیں۔ تو بھی اس حرام خور کے ساتھ یہاں سے دفع ہو جا"۔

"میں یہاں سے دفع نہیں ہوں گی لالہ"۔ اس نے کہا۔ "میں تو اب سنکھیا کھا کر چتا پر جل جاؤں گی"۔

"غصہ میں ایسی جذباتی اور بے عقلی والی باتیں نہیں کرتے"۔ اماں نے بڑی مشکل سے دونوں کو سمجھا بجھا ٹھنڈا کیا۔ دونوں خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"اچھا اب تم دونوں بہت لڑ لئے۔ اب آرام سے بیٹھو اور میری سنو"۔ ابا نے دونوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

لالہ جی سر پکڑے بت بنے ابا کی جانب غور سے دیکھنے لگے۔

ابا نے لالہ جی کو سمجھایا کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کلدیپ بگڑا ہوا اور گستاخ لڑکا ہے لیکن اس کے باوجود اُسے میں بہت بُرا نہیں کہہ سکتا وہ جو باتیں جذباتی گستاخانہ لہجہ میں کر کے گیا ہے، تو ٹھنڈے دل سے سوچ کہ ان باتوں میں کوئی حقیقت ہے یا نہیں۔ اگر کسی نے اس کے کان بھرے ہیں تو بیٹے کو مارنے کی بجائے اس کا ذہن صاف کر۔

"یار عظیم! یہ نا خلف جس حویلی اور اس کے حصے کے دعویدار چچا شنکر اور آل انڈیا میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کے جھگڑے کی بات کر رہا ہے اس کی تجھے حقیقت معلوم ہی نہیں ہے"۔ لالہ جی نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

"تو مجھے اس حویلی کی اصل حقیقت بتلا کہ چکر کیا

ہے؟" ابا جی نے لالہ سے پوچھا۔

"حقیقت یہ ہے کہ یہ حویلی میرے پتا نے ہی بنائی تھی"۔ لالہ جی نے بتانا شروع کیا۔ "میرے پتا نے اپنی زندگی میں ہی شدید بیماری کے دنوں میں اس حویلی کا انتظام اور اس کے ماتحت میں لگی 9 دکانوں کے کرائے اور دیگر معاملات کی ذمہ داری میرے سر تھوپی تھی۔ وہ اچانک مر گئے تو چھوٹے بھائی شنکر رمبا نے مجھے کہا کہ میں اسے ایک لاکھ روپے دوں تو وہ اس حویلی کی وراثت سے دستبردار ہو جائے گا۔ میں نے اسے لاکھ کے ساتھ 10 ہزار روپے فالتو دیئے اس نے اس کے عوض مجھے اشٹام بھی لکھ دیا تھا لیکن وہ کچھ عرصہ بعد اس اشٹام سے مکر گیا اور اسے جعلی قرار دیتے ہوئے مجھ سے حق مانگنے لگا۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ میں نے اُسے اس حویلی کے حصے کے عوض اس کی ڈیمانڈ ایک لاکھ 10 ہزار روپے دیئے ہیں تو وہ نہ مانا اور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس نے مجھ پر عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے اور یہی نہیں اس نے ایک ملی بھگت کے تحت متعلقہ اشٹام فروش کا رجسٹر غائب کروانے کے ساتھ ریکارڈ روم سے میرے حق میں جانے والی تحریریں اڑا دی ہیں۔ یہ کیس برسوں سے انصاف کے لئے ہائی کورٹ میں اٹکا ہوا ہے۔ اسی دوران شنکر نے مجھے ذہنی اذیت دینے کے لئے ایک اور شوشہ چھوڑ دیا ہے......

اس نے آل انڈیا میڈیکل محکمے کو میرے پیچھے اس حویلی کی ملکیت کا دعویدار بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ متعلقہ محکمہ کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ حویلی میرے پتا نے ان کی ملکیتی زمین پر بنائی تھی۔ اس مقدمہ میں جان نہیں ہے لیکن بہر حال مقدمہ تو مقدمہ ہے وہ میں لوئر کورٹ میں چیلنج کیا ہوا ہے"۔

لالہ جی نے ابا کو مزید بتلایا کہ شنکر رمبا کی دو جوان بیٹیاں ہیں اس نے کسی کے ذریعہ یہ پیغام پہنچایا تھا کہ اگر میں اس کی بیٹی سے کلدیپ کی سگائی کر دوں تو وہ اپنے اس حویلی کے دعویٰ سے دستبردار ہو جائے گا بلکہ ایک بار لڑکی

RTM 234574
پولو فین
سیلنگ فین
پیڈسٹل فین
ایگزاسٹ فین
اے، جے پنکھے
سیلنگ فین پیڈسٹل فین
ایگزاسٹ فین
اے۔ جے الیکٹرک انڈسٹری
محلہ نور پور شرقی گجرات
053-3521165, 3601318

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

نے اپنے منہ سے کلدیپ سے اپنی شادی کی مجھ سے اشارتاً بات کی تھی لیکن میں نے اس کی بات کو گول کر دیا تھا۔

"رہا سوال میری بیوی کی جانب سے کی گئی اس بات کا کہ میں گھمنڈی ہوں اور اپنی اولاد سے میٹھے لہجے میں بات نہیں کرتا اور کلدیپ کو مارتا ہوں۔ یہ خیال اور سوچ غلط ہے کہ میں ان لوگوں سے روکھا رویہ رکھتا ہوں۔ یہ بات میرا دل اور بھگوان جانتا ہے کہ میں اپنے کنبے سے کتنا لگاؤ رکھنے کے ساتھ ان کی بھلائی کے لئے کتنا سوچتا ہوں۔ ان کے خیال میں میں گھمنڈی طبیعت رکھتا ہوں، ان کا یہ خیال بھی غلط ہے۔ میں دراصل تھرڈ کلاس منفی ذہنیت کے حامل لوگوں سے اس لئے زیادہ نہیں ملتا کہ وہ ہر وقت اپنی ذہنیت کے مطابق گھٹیا اور بے مقصد بات کرتے ہیں لیکن میں اُن لوگوں سے ضرور ملتا ہوں جو کہ اچھی ذہنیت کے حامل ہو کر کوئی مثبت بات کرتے ہوں"۔

"لیکن یار لالہ تمہیں خواہ مخواہ کلدیپ پر چڑھائی نہیں کرنی چاہئے تھی"۔ ابا نے لالہ سے کہا۔ "وہ جو بھی کچھ ہے تیرا بیٹا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تو سوچو اُس نے دیپا کو چاہ کر ایک خوبصورت غلطی کی ہے"۔

"ہاں، مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ اس خبیث نے بڑی پٹاخہ چھوکری پٹائی ہے"۔ لالہ نے بے شرموں کی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

"یار لالہ! لگتا ہے تیرے دل و دماغ میں ربط نہیں ہے"۔ ابا نے کہا۔ "تُو ایک لمحے کلدیپ کی پسند کے گیت گاتا ہے تو دوسرے لمحے تیری سوچ یکسر الٹی جانب پلٹا کھا لیتی ہے۔ اب مجھے تو اپنے دل و دماغ سے باہم مشورہ کر کے قطعی فیصلہ سنا کہ تُو چاہتا کیا ہے؟"

"عظیم بھائی! آپ یہ بات صرف ان سے ہی کیوں پوچھتے ہیں؟" لالہ کی بیوی نے ابا سے کہا۔ "میں نے کلدیپ کو اپنی کوکھ میں 9 ماہ تلک رکھ کر جنم دیا ہے۔ بے شک ہاں کریں یا "ناں" کریں مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں نے ہر صورت میں دیپا کو اپنی بہو بنانا ہے"۔

"تو کیا کلدیپ کی بارات لاسا گاؤں کی گوبرے اٹی، کچرا زدہ گلیوں میں لے کر جائے گی؟" لالہ جی نے جل کر کہا۔

"تو تم اپنے شہزادے کی بارات انگلینڈ بکنگھم پیلس لے جاؤ"۔ تائی سنتو نے لالہ پر جوابی طنزیہ جملہ داغتے ہوئے کہا۔

"تو بہت بکواس کرنے لگی ہے"۔ لالہ جی نے غصے میں کھولتے ہوئے کہا۔ "میرا دل کرتا ہے ٹکوا لے کر تیرے بدن سے تیری منڈھیا الگ کر دوں"۔

"ہاں ہاں اتنی بُری لگتی ہوں تو ابھی اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو"۔ سنتو نے روتے ہوئے کہا۔

ابا جو ابھی تلک لالہ کیدار ناتھ اور سنتو تائی کی نوک جھونک سن رہے تھے۔ انہوں نے غصے سے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے واسطے تم لوگ اپنا جھگڑا بند کرو یا میرے گھر سے چلے جاؤ۔ تم لوگ مجھ سے مشورہ کرنے آئے ہو یا لڑنے؟"

"یار! ایک تو میں اس عقل کی ماری سے بہت تنگ ہوں۔ یہ بے مقصد ضد لگا کر میرا پارہ چڑھا دیتی ہے"۔

لالہ جی اور سنتو تائی دونوں کلدیپ کی شادی کے معاملہ میں بغیر کسی نتیجے پر پہنچے چلے گئے۔

دوسرے دن اس خبر نے بھونچال کی کیفیت پیدا کر دی کہ کلدیپ گھر سے بھاگ گیا ہے۔ گھر جا کر بھی اس کا اپنے باپ سے خاصا جھگڑا ہوا تھا اور لالہ جی نے اسے گالیاں دی تھیں۔

کلدیپ نے اپنے باپ کا یہ حال دیکھا تو غصے کے عالم میں گھر سے نکل گیا اور پھر واپس ہی نہ آیا۔ تائی سنتو نے رو رو کر بُرا حال کر لیا مگر کلدیپ کا کچھ پتا نہ چلا کہ کہاں گیا ہے۔

(جاری ہے)

انسانی نفسیات کے پس منظر میں جنم لیتی پیچیدہ رشتوں کی سچی کہانی

جانِ آرزو

عروسہ میری کہانی کا حصہ ضرور تھی مگر میں اس کی زندگی میں اہم نہیں تھا۔ اس کی بے اعتنائی میرے جیون میں آتش بھڑکا دیتی تھی۔ ناری کی اسی نار نے میرا کام تمام کر دیا۔ لگتا ہے کہ ابد تک میں اسی آگ میں جلتا رہوں گا۔ کئی تمنائیں اور بھی تھیں مگر جانِ آرزو نے سب کو مات دے دی"۔

ڈاکٹر مبشر حسن ملک ---- 0345-6875404

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں میڈیکل کالج کی پُرشکوہ عمارت میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایڈمنسٹریٹر کے کمرے میں چائے کی پیالیاں مسلسل آ جا رہی تھیں۔ دفتری سرگرمیاں جوبن پر تھیں میں سکیورٹی فورسز کے اپنے ایک کولیگ جہاں داد کے ساتھ یہاں آیا تھا بلکہ جہاں داد کو یہاں بلوایا گیا تھا۔ اس کا لختِ جگر جو تعلیم طب میں سال آخر کا طالب علم تھا، کچھ مسائل کا شکار ہو گیا تھا۔ جہاں داد کو ایڈمنسٹریٹر سے اسی سلسلے میں بات کرنا تھی۔ میرا اثر و رسوخ اس کالج میں موجود تھا اس لئے مدد کرنے ساتھ چلا آیا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں بڑا خوش نصیب واقع ہوا ہوں"۔ جہاں داد نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔ "فورسز کے سب سے نچلے رینک سے میں نے ترقی کی ہے اور موجودہ عہدے تک آن پہنچا ہوں، پھر اولاد بھی ہونہار نکلی ہے، خصوصاً بڑا بیٹا، منان جو اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر صاحب! جس روز میں فورسز سے ریٹائر ہو جاؤں گا اسی ماہ میرا بیٹا ڈاکٹر بن جائے گا اور کنبہ سنبھال لے گا۔ میری خواہش ہے کہ جس روز میں فورسز کو الوداع کہوں، اسی دن میرا بیٹا یونیفارم پہن لے اور فورسز میں میرے لئے فخر کا باعث ٹھہرے"۔ جہاں داد نے سفر کے دوران اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس دم وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ ہم اسی صاحبزادے کے مسائل سلجھانے اس کے ادارے میں بلائے جا رہے تھے۔

ایڈمنسٹریٹر موقع پا کر ہمیں ملحقہ کمرے میں لے گیا اور تنہائی میں معاملہ سمجھانے کی کوشش کی۔

"بچہ ایٹی چیوڈ پرابلم کا شکار ہے"۔ اس نے ہمیں واضح طور پر بتا دیا۔ جہاں داد بوکھلا گیا، وہ یقین کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

ایڈمنسٹریٹر ہمیں سی سی ٹی وی پر بھی لے کر گیا اور ایک کلاس روم کو ہماری توجہ کا مرکز بنا دیا۔ منان کلاس کے آخری بنچ پر تنہا بیٹھا ہوا تھا اور اس دم تدریسی مشاغل سے قطعی بے بہرہ اور غافل نظر آتا تھا۔ اسے خفیہ انداز میں عقب سے فلمایا جا رہا تھا۔ اس کا دھیان صرف ایک لڑکی پر مرکوز تھا جو اس سے اگلی نشستوں میں ذرا فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی اور لیکچر سننے میں محو تھی۔

"منان کی تعلیمی کارکردگی کبھی مثالی ہوا کرتی تھی مگر اب یہ ہر پہلو زوبہ زوال ہو چکی ہے"۔ ایڈمنسٹریٹر نے ہمیں بتایا۔ "کالج کی انتظامیہ نے اس کے شخصی انحطاط کا بھی نوٹس لیا ہے اور مجھے سرپرست سے رابطہ کرنے کی ہدایت کی ہے"۔ اس نے ہمیں سمجھایا۔ "ہم لوگ جو ممکن ہے کر رہے ہیں مگر آپ کی مدد کے بغیر ہم بچے کو نہیں سنبھال سکتے"۔ اس نے حتمی رائے دے دی۔

عبدالمنان کا تعلیمی انحطاط مجھے بھی حیران کر گیا۔

میں بچے کو مدت سے جانتا تھا۔ اب وہ جوان ہو چکا تھا۔ سیدھا سادہ ہوا کرتا تھا۔ کم گو اور پیچھے پیچھے رہنے والا۔ پڑھا کو البتہ ضرور تھا۔ ہمیشہ ہی ہونہار رہا تھا۔ بلا کا ذہین تھا۔ کبھی اعتماد میں کم دکھتا مگر اس کا مستقبل تابناک لگتا تھا۔ اب تین چار ماہ میں ڈاکٹر بننے والا تھا۔

جہانداد بیٹے کو چھٹی دلا کر اپنے ساتھ گھر لے آیا۔

"میں عروسہ کے بغیر نہیں جی سکوں گا"۔ منان نے اپنے باپ کو بتا دیا۔ یہ بات یوں نہ سننے کی خواہش لئے جہاں داد رات بھر جاگتا رہا تھا۔ چائے کی خالی پیالیوں کے بیچ سگریٹ کے اَن گنت ٹکڑے اس کی قریبی میز پر بکھرے ہوئے تھے جو اس کی دل شکستگی اور بے چینی کی غمازی کرتے تھے۔ بے خوابی کے باعث اس کی آنکھوں میں سرخی جھلک رہی تھی۔ بال الجھے ہوئے تھے اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ صبح جونہی منان اس کے سامنے آیا، جہانداد نے اسے دھر لیا۔

"لڑکی کسی شہزادی سے کم نہیں۔ بڑے بیورو کریٹ کی صاحبزادی ہے۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی ہے۔ تمہیں بھلا کس طرح مل سکتی ہے؟" اس نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ابا! میرے لئے دل پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا ہے"

منان نے لاچار اور دکھی لہجے میں کہا۔ "وہ لڑکی میرے لئے زندگی کا روگ بن چکی ہے، میں اسے حاصل کئے بغیر نہیں جی سکوں گا۔ مجھے آئندہ زندگی کی راہیں کٹھن اور الجھی ہوئی دکھائی دیتی ہیں"۔

یہ بات سن کر جہاں داد کے چہرے پر اندیشوں کی قطار لگ گئی۔

"میں اس کنبے کا چھکڑا اک عمر سے کھینچ رہا ہوں، گڈھے میں جکڑے ہوئے مویشی کی طرح"۔ جہانداد نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب میں تھک کر گرنے والا ہوں۔ یہ حقوق العباد تم سے بھی اپنا حصہ مانگیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم زندگی کی راہوں میں کہیں بھٹک رہے ہو"۔ جہاں داد نے بیٹے پر واضح کیا مگر اسے بے اختیار روتا دیکھ کر خود گہرے دکھوں کا شکار ہو گیا۔ اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج پڑیں۔

باپ اور بیٹے کے بیچ بے سکون ملاقات ختم ہو گئی۔

"ماں کی نگاہیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ بچوں کی حسوں کا تجزیہ بھی کر لیتی ہیں۔ تم زیرک تھیں، پھر کیسے یوں نابلد رہیں؟ بچے کی الجھن بھی نہ جان سکیں؟" جہاں داد نے بیوی سے گلہ کیا۔ سیما سہم گئی۔ ذہنی تناؤ نے گھرانے کا احاطہ کر لیا تھا۔ سیما انہی حالات سے خوف کھایا کرتی تھی۔

"میں سال بھر سے جانتی تھی"۔ سیما نے موقعے کی نزاکت دیکھ کر اعتراف کر لیا، پھر کہا۔ "میں اپنے تئیں معاملات گرفت میں لانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں نے بیٹے کو بہت سمجھایا، اس کو ڈانٹا، اس کی منتیں کیں، اسے یہ تک کہا کہ میں نے تمہیں خدا سے مانگ مانگ کر لیا تھا۔ میری خاطر سنور جاؤ۔ میں نے اسے واسطے دیئے، اس کے سامنے روتی رہی، چلاتی رہی۔ اس نے کبھی سنبھلنے کی کوشش بھی کی مگر دوبارہ ٹھوکر کھا کر اسی دلدل میں گر پڑا۔ اس کا ذہنی الجھاؤ مجھے تکلیف دیتا رہا، اس کی ابتر صحت میرا سینہ جلاتی رہی۔ میں گھر کے سکون کی خاطر چپ رہی۔ اب ہار گئی ہوں۔ آج ٹوٹ گئی ہوں، تباہ حال کھڑی ہوں، دماغی انتشار میں بکھر گئی ہوں"۔ سیما نے خاوند کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے برکھا موسلادھار برسنے لگی۔

جہانداد فورسز کا کارندہ تھا۔ اس ناطے نظم اس کی شخصیت کا اہم حصہ تھا اور اس کے رگ و پے میں موجزن نظر آتا تھا۔ اس کے اس شخصی پہلو کی جھلک گھریلو زندگی میں بھی موجود رہتی تھی۔

"تمہیں مجھے اعتماد میں لینا چاہئے تھا"۔ اس نے بیوی سے کھردرے لہجے میں بات کی مگر اس کی حالتِ زار دیکھ کر آخر پسپا ہو گیا اور بے بسی کے عالم میں دروازہ کھول کر دھیرے دھیرے لان کی جانب باہر نکل گیا۔

گزشتہ سالوں میں اَن گنت شامیں اس نے اسی لان میں گزاری تھیں مگر یوں پریشانی میں نہیں بلکہ مطالعہ کرتے ہوئے یا پھر احباب سے گپیں ہانکتے۔ اس کے اس سبزہ زار میں خزاں کبھی نہیں اتری تھی۔

ڈھلتی شام میں نبات و جمادات کے سائے طوالت اختیار کر چکے تھے۔ دور افق پر پھیلے روشنیوں کے نقوش پیچیدہ ادغام میں ڈھل رہے تھے۔ پُرسکون ماحول میں انجانی سی بے سکونی تھی۔ کبھی خاموشی میں ابھرتی پرندوں کی چہکاریں اداسی کا قصہ سنانے لگتیں۔ ہوا میں حدت اور جھونکوں میں موسمی تختی کی کسیلی ملاوٹ تھی۔ سیما خاوند کو تنہائی کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے تعاقب میں باہر چلی آئی۔

"سال ہو گیا، مجھے منان کے کمرے سے سگریٹ کے ٹکڑے ملتے رہے ہیں"۔ اس نے افسردہ لہجے میں خاوند کو بتایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، پھر یک لخت وہ اپنے دامن کے پلو میں بے قابو نظر آئی۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''تو گویا وہ سگریٹ نوشی بھی کرتا ہے؟'' جہاں داد نے چونک کر بیوی کی طرف دیکھا، پھر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ اس کی اپنی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔

''اب تو سگریٹ کے دھوئیں نے اس کا لہو بھی جلا ڈالا ہوگا''۔ سیما زاروقطار رونے لگی۔ جہاں داد بے چینی میں انگلیاں چٹخاتا رہا۔ پھر اس نے جلتا ہوا سگریٹ اپنے پیروں تلے مسل دیا۔ اس کے چہرے پر بے قراری ابھرتی اور نقوش میں سماتی رہی۔

''ایک روز میں اس کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی کہ اس کی بیڈ سائیڈ ٹیبل سے مجھے ولایتی شراب کی دو بوتلیں ملیں''۔ سیما نے انکشاف کیا۔ ''اس وقت وہ خود بھی کمرے میں موجود تھا۔ میں نے اس سے بازپرس کی تو وہ تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ یہی کہتا رہا کہ شراب کسی دوست نے اس کے پاس رکھوائی تھی۔ مذکورہ دوست کا اتہ پتہ بھی نہ بتا سکا۔ میں نے غصے میں آ کر شراب کی بڑی بوتل کھولی اور فوراً کئی گھونٹ حلق میں اتار لئے۔ وہ یک دم پریشان ہوگیا پھر میری طرف لپکا اور شراب کی بوتل میرے ہاتھ سے چھیننے کا جتن کرنے لگا۔ میں نے اسے رائے دی کہ چلو مل کر پیتے ہیں۔ وہ بہت شرمندہ ہوا۔ کہنے لگا کہ امی یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے، میں اسے تلف کردوں گا۔ آپ یہ نہ پئیں''۔

یہ سن کر جہاں داد کے بدن میں کپکپاہٹ سی ابھری اور ماتھے پر پسینہ چھلکنے لگا۔ اس دم وہ سیما کو مہیب طوفانوں میں کھڑا بوسیدہ شجر دکھائی دیا۔

''اسے نشے کی لت کیونکر پڑی ہوگی؟'' جہاں داد بڑبڑایا۔

''ہوسٹل میں گھریلو پابندیوں سے آزادی اور غلط صحبت کی وجہ سے''۔ سیما نے جواب دیا۔

''لخت جگر کی داستان محبت کتنی طویل ہے؟''

''عروسہ ڈیڑھ سال قبل مائیگریشن کے ذریعے اس کی کلاس میں آئی تھی''۔

''کیا عروسہ بھی ہمارے بیٹے کو پسند کرتی ہے؟''

''نہیں''۔

''وہ تو اونچی ہواؤں میں رہتی ہوگی''۔ جہاں داد اپنی اوقات کے بھنور میں ڈوب گیا۔

''ہاں!'' سیما نے تائید کی۔

چند ہفتے بعد جہاں داد دوبارہ میڈیکل کالج میں موجود تھا۔ وہ بیٹے کے سلسلے میں لواحقین ٹیچرز رابطہ میٹنگ میں آیا تھا۔ منان کا تعلیمی کیریئر پیچیدگیوں کا شکار ہو چکا تھا اور اس کے بارے میں اساتذہ مایوس نظر آتے تھے۔

کالج کے ہسپتال میں منان کے طبی ٹسٹ ہوئے تھے۔ نشہ آور ادویہ اور سگریٹ سے نجات دلانے کا پروگرام شروع کیا جا چکا تھا۔ علاوہ ازیں ماہرین اس کے ذہنی تناؤ کا علاج بھی کر رہے تھے۔

جہاں داد کو باور کرایا گیا کہ لڑکا اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی شخصیت میں کئی قسم کے بگاڑ جنم لے رہے تھے۔ اس کا عمومی رویہ جارحانہ ہو جاتا تھا۔ خودرحمی کا بھی شکار تھا اور کم اعتماد رہتا تھا۔ اس ناطے زودرنج بھی ہو چکا تھا۔ عموماً غلط ہوتا مگر غلطی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اکثر بجھا بجھا اور منتشر نظر آتا تھا۔

عشق روگ نے اس کی تخلیقی خوبیوں کو تہس نہس کر دیا تھا اور اس میں اعتماد کا فقدان پیدا ہو چکا تھا جو اس کے مشاہدے اور دیگر تعلیمی امور کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ اس کا توجہی ارتکاز بری طرح متاثر ہوا تھا۔

اس کی متلون مزاجی کے باعث دوست اسے چھوڑ چکے تھے اور وہ کالج سٹاف کے لئے بھی مسائل پیدا کر رہا تھا۔ اس لڑکی کے والدین بھی کالج والوں سے سخت نالاں تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو وہاں محفوظ نہیں جانتے تھے۔

ان دنوں تعلیمی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ امتحانی داخلہ بھجوانے کے لئے ٹسٹ شروع ہونے والے تھے۔ اساتذہ اس ضمن میں مستقبل کے ڈاکٹروں پر کڑی محنت کر رہے تھے۔ منان کو البتہ کچھ ایام کے لئے گھر لوٹنا پڑا۔ دواؤں کے ساتھ اسے آرام کی بھی ضرورت تھی۔

منان گھر پہنچا تو ہر دم اسی کے رویوں کا تذکرہ ہونے لگا۔ کبھی بدمزگی بھی ہو جاتی۔

''مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں''۔ وہ بے رخی سے کہہ دیتا جو اس کے والدین پر گراں گزرتا۔

آخر ایک روز اس کا والد کے ساتھ شدید جھگڑا ہو گیا۔ مباحثے کے دوران جذباتیت، منت سماجت اور بے چارگیوں کے ادوار آتے رہے مگر آخر میں بات ہاتھوں سے نکل گئی۔ منان نے اپنے مؤقف کے حق میں بے سروپا دلائل دیئے، جس پر جہاں داد طیش میں آپے سے باہر ہوگیا، پھر ذہنی تناؤ اور بے بسی نے اسے نیم پاگل کر دیا۔ اس نے جوان بیٹے کو بُری طرح پیٹ ڈالا۔ اسے اس قدر مارا کہ بالآخر خود تھک گیا۔ بیٹا مار کھاتا رہا اور مسلسل روتا رہا، پھر سسکیاں بھرنے لگا۔ اس کے چہرے پر دل شکستگی کی چھاپ ثبت ہوگئی۔

اس پُرسوز واقعے کے بعد جہاں داد کا اپنا دل بھی بجھ گیا۔

''مجھے اپنی بدخصلتی پر وحشت ہونے لگی ہے''۔ اس نے سیما سے کہا اور بچوں کی طرح رو پڑا۔ ڈھلتی شام کے وقت وہ سبزہ زار کی طرف نکل گیا اور اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو نفرت سے دیکھتا رہا جو تلخ لمحوں میں بیٹے پر اذیت کا باعث بنے تھے۔ سیما کبھی اپنے لخت جگر کے پاس بیٹھتی تو کبھی خاوند کو دیکھنے باہر چلی آتی۔ وہ بھی جیتے جی مر گئی تھی۔

گزرتی ہوئی ساعتوں نے رفتہ رفتہ جذبوں کا روپ بدل ڈالا۔ شام گہری ہو چکی تھیں منان اپنے کمرے میں دبکا ہوا تھا جس کے در نیم وا تھے۔ وہ پلنگ کے سہارے زمین پر نیم دراز پڑا تھا۔ اس کا بدن لہولہو تھا جبکہ چہرہ کرب کے آثار سے اٹ گیا تھا۔ جسمانی تشدد اپنی جگہ، اس کی انا بھی بُری طرح مجروح ہوئی تھی۔

جہاں داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا بیٹے کے کمرے میں پہنچ گیا اور قریب بیٹھ کر اس کے بدن پر نرمی سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر اس کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپ ٹپ ٹپکنے لگے۔ اس مرحلے پر بھی خونی رشتوں میں بلا کی محبت موجود تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے شرمندہ بھی دکھتے تھے۔ ہر کسی کو احساس تھا کہ گھرانے کا بندھن زخم زخم ہو چکا تھا۔

رات کا پہلا پہر انجام کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک منان کے کمرے سے چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ بُری طرح کراہ رہا تھا اور ساتھ روتا بھی جا رہا تھا۔ اس دم وہ اذیت میں مبتلا دکھائی دیتا تھا۔ اہل خانہ اس کی طرف دوڑے۔

''میرا دل بیٹھ رہا ہے، سانس لینا مشکل ہوگیا ہے، میں دنیا سے جا رہا ہوں، مجھے بچالیں''۔ اس نے بمشکل کہا۔ بظاہر وہ زندگی سے مایوس نظر آ رہا تھا۔ دوست احباب نے اسے دلاسا دیا۔ ایمبولینس فوری طور پر پہنچ گئی۔ جہاں داد نے بیٹے کو سہارا دیا تو وہ ننھے بچے کی طرح اس کے وجود سے چپک گیا۔

ہسپتال میں منان کا تفصیلی معائنہ کیا گیا۔ ایمرجنسی میں اسے ماہرین نے دیکھا اس کے طبی ٹسٹ کئے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ نوجوان شدید ڈیپریشن کا شکار ہو چکا تھا۔ گھبراہٹ میں اس نے اپنے وجود پر دل کا دورہ طاری کر لیا تھا جسے وہ خود بھی تلخ حقیقت سمجھ بیٹھا تھا۔ اس کا بھرپور نفسیاتی علاج جاری رکھنے کا فیصلہ دیا گیا۔

''تم علم طب میں اپنی ڈگری مکمل کرنے کی کوشش کرو، میں عروسہ کے والدین سے رابطہ قائم کروں گا''۔ اگلے روز جہاں داد نے بیٹے سے سمجھوتہ کر لیا۔ ''کامیابی قدرت کے ہاتھ میں ہے''۔ اس نے یہ واضح کرنے کی

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کوشش بھی کی۔

"کوئی چارہ سازی کرے تو بھی مجھے اذیت پہنچتی ہے"۔ منان نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ حالات کی دلدل سے نکل آنا اس کی بساط سے باہر دکھتا تھا۔ اس پہلو والدین کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ادھر جہاں داد کی ریٹائرمنٹ کی تاریخ بھی آ چکی تھی۔

جہاں داد نے عروسہ کا گھر دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ سنگ مرمر کا عالیشان محل تھا، جس میں سجے ہوئے در شمسی روشنی میں دمک رہے تھے۔ عمارت کے طول و عرض سے سطوت ٹپکتی تھی۔ جہاں داد صدر دروازے کی طرف بڑھا تو عجز میں خود کو اور بھی کم تر محسوس کرنے لگا۔ سیما اس کے ہمرکاب تھی۔ جونہی جہاں داد نے کال بیل پر ہاتھ رکھا، اندر کئی انواع کے کتے بھونکنے لگے۔ پہریدار نے دروازہ کھولا تو بغیر گاڑی کے مہمان پا کر سراپا سوالیہ نشان بن گیا۔ پھر اس کے نقوش میں حیرت بھی ابھر آئی۔ مونچھیں کچھ اور تن گئیں۔

طویل انتظار کے بعد سیما اور جہاں داد کو عمارت میں داخل ہونے کی اجازت ملی۔

مرکزی ہال میں عروسہ کے والد تشریف رکھتے تھے۔ ان کی نشست جاہ و جلال میں بہت بلند تھی۔ ان کی بظاہر دلآویز مسکراہٹ میں بھی انجانا سا دبدبہ تھا۔ وہ تول کر بولتے تھے اور بول کر مخاطب کو ٹٹولتے تھے۔

"میری حیثیت آپ سے بہت کمتر ہے"۔ جہانداد نے دنیا بھر کی عاجزی اپنے لہجے میں سمیٹ کر بات شروع کی۔ "میں آپ کی دختر کا رشتہ تو نہیں مانگ سکتا لیکن اپنا لخت جگر آپ کی غلامی میں پیش کر سکتا ہوں۔ آپ اس کا ہاتھ تھام لیں اور جیسا چاہیں، اس کی پرداخت کر لیں۔ وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل رہا ہے اور شاید اپنی زندگی سے بھی۔ ہم میاں بیوی اسے بھول جائیں گے، صرف اس کی کامرانیوں کی دعا کرتے رہیں گے۔ لڑکا ہونہار ہے، خوبصورت بھی۔ آپ کے زیر سایہ پنپ سکتا ہے۔ آپ ہمارے کنبے پر احسان کر دیں۔ شاید ہی آپ اندازہ کر سکیں کہ ہم کس قدر مجبور ہو کر یہاں آئے ہیں، بیٹے کی تکمیل تمنا کی خاطر"۔

سیما نے سر کی جنبش سے خاوند کی تائید کر دی۔

عروسہ کے والد اس تجویز سے متفق نہ ہو سکے۔ کہا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر چکے ہیں اور اس بندھن پر نظر ثانی بلا جواز ہو گی۔

جہاں داد مایوس ہو کر بیوی کے ہمراہ محل سے باہر نکل آیا۔ اسے لگا جیسے وہ اپنی آخری امید بھی وہیں ہار آیا تھا، جہاں اس کے لخت جگر کی آرزوئیں بکھری پڑی تھیں۔

"قائل ہو چکا ہوں کہ عروسہ سے میرا ناطہ غیر منطقی ہے مگر کیا کروں، میں جذبوں کے سمندر میں اس طرح بہہ رہا ہوں کہ ان طغیانیوں پر بس نہیں رکھتا"۔ منان نے والدین کی ناکامی پر رنجیدہ دلی سے تبصرہ کیا۔

اگلے روز وہ کالج چلا گیا۔ اب جہاں داد کو بیٹے کے بارے میں کھٹکا سا لگا رہتا تھا۔ وہ اندیشوں میں گھر چکا تھا کہ نہ جانے کب اس کا بیٹا غیر متوازن جذبوں کی رو میں بہہ کر کوئی ایسی حرکت کر دے گا جو خود اسے اور خاندان کو بُری طرح تباہ کر دے گی۔ ایک ناخوشگوار واقعہ چند روز بعد ہی رونما ہوا، جو کسی المیے سے کم نہیں تھا۔

منان جرأت پروانہ کرتے ہوئے عروسہ کے گھر پہنچ گیا اور لڑکی کے والد سے ملا۔ کہا کہ وہ عروسہ کی محبت میں انتہا کو پہنچ چکا ہے اور اس کے بنا اپنے مستقبل کا تصور بھی نہیں کر سکتا بلکہ وہ ادھورا اور محروم جیون بے معنی سمجھتا ہے۔ اس نے باور کرایا کہ وہ حصول مقصد کے لئے کوئی بھی قربانی دے سکتا ہے اور اگر اسے عروسہ مل گئی تو وہ باہمی کائنات میں رنگ آمیزی کے لئے ہستی کی بازی بھی لگا سکتا ہے۔ اس نے عروسہ کے والد کو اپنی عمر بھر غلامی کا یقین دلایا اور کہا کہ وہ ہمیشہ ان کا فرمانبردار اور احسان مند رہے گا۔ عروسہ کے والد نے اس کی ذہنی کیفیت بھانپ لی اور اس دم اسے حکمت عملی سے ٹال دیا۔

اگلے روز منان پر قہر نازل ہو گیا۔ کالج کی انتظامیہ نے اسے دھر لیا۔ اس کے خلاف شدید ایکشن لیا جا سکتا تھا مگر ذہنی عارضے نے اسے کسی قدر بچا لیا، پھر بھی اس کے تعلیمی کیریئر پر وارننگ تھوپ دی گئی۔ اس واقعے کے بعد منان کی ذہنی کیفیت اور بھی بگڑ گئی۔ وہ اپنی بربادی اور موت کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔ اب دنیاوی امور سے اس کا بڑی حد تک قطع تعلق ہو چکا تھا۔

جہاں داد اپنے بیٹے کی کسی دوسرے شہر مائیگریشن کے لئے سرگرم ہو گیا۔ اب وہ خود بھی انتقال رہائش کے لئے تیار تھا۔ بیٹے کو زندگی میں واپس لانا اب سیما اور اس کی اوّلین ترجیح بن چکی تھی۔

صبح بیدار ہو کر گھر سے باہر نکلا تو میں نے جہاں داد کے گھر افراد کا جم غفیر دیکھا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ لگا رات کوئی المیہ پیش آ چکا تھا۔ میں جہاں داد کو ڈھونڈتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں نظر آیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بے حس کھڑا تھا، مجھے سامنے پا کر حواس باختہ ہو گیا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر اس کے لب کپکپا کر رہ گئے۔ میں نے اس کا بازو تھاما تو احساس ہوا کہ اس کا وجود بھی لرز رہا تھا۔ میری حسیں اس کی ناگفتہ بہ حالت پر مرکوز ہو گئیں۔ جہاں داد بھاری قدموں کے ساتھ بیٹے کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

کمرے کے وسط میں ایک لاش پڑی تھی، خون آلود، جواں سال منان کی لاش، جس کے چہرے پر ابدی اندوہ طاری تھا۔ ایسا ہی غم جہاں داد کے نقوش میں بھی سما گیا تھا۔

گزشتہ سرد رات منان نے اپنے دوست کے گھر خودکشی کر لی تھی۔ اس سلسلے میں اس نے متفرق کوششیں کی تھیں، زہر کھایا، پنکھے سے لٹکا اور بالآخر اس نے اپنی کلائیوں کی رگیں کاٹ دیں۔ وہ انتہائی اذیت ناک موت سے ہمکنار ہوا تھا۔ جہاں داد نے بیٹے کی خون آلود تحریر بھی مجھے دکھائی، جس میں لکھا تھا:

"نہیں سمجھ پایا کہ انسان اپنی خواہشوں کے پیچھے پاگل کیوں ہو جاتا ہے؟ یہاں تک کہ کبھی خود اپنی اکائی پر بھی اختیار نہیں رہتا۔ عروسہ میری کہانی کا حصہ ضرور تھی مگر میں اس کی زندگی میں اہم نہیں تھا۔ اس کی بے اعتنائی میرے جیون میں آتش عجز کا دیتی تھی۔ ناری کی اسی نار نے میرا کام تمام کر دیا۔ لگتا ہے کہ ابد تک میں اسی آگ میں جلتا رہوں گا۔ کئی تمنائیں اور بھی تھیں مگر جانِ آرزو نے سب کو مات دے دی"۔

اس سانحے کے بعد یہ دکھی خاندان اپنے آبائی گاؤں منتقل ہو گیا۔ بہت روز بیچ میں گزر گئے۔ ایک دن سر راہ جہاں داد سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دیا۔ میں نے خیریت پوچھی تو کہنے لگا۔

"نصیبوں کا ایک جرم کا دل میں سنبھال رکھا ہے"۔

میں نے ہمدردی میں اسے گلے لگایا تو وہ رو پڑا۔ پھر کہنے لگا۔ "بیٹے کا غم کسی پہلو چین نہیں لینے دیتا۔ کہانی کا ایک حزیں پہلو مجھے اکثر بلا دیتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اس نے خودکشی کرنے سے پہلے میرا خیال کیوں نہیں کیا؟ کیا میری محبت اسے یاد نہیں آئی تھی؟ کیا واقعی اس کا پیار میرے لئے ختم ہو چکا تھا؟ ہم سب کا بھی تو اس کے ساتھ تعلق گہرا تھا"۔

جہاں داد آج بھی اپنے سوال کا جواب تلاش کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ "انسانی رشتے فطرتاً بے حد پیچیدہ ہوتے ہیں۔ کبھی سمجھ میں بھی نہیں آتے اور لہو کی وقعت کو بھی بے معنی کر دیتے ہیں"۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

غزل

ممتاز ہاشمی

اُس شوخ کی آنکھوں پہ مر جائیں جو کسی روز
دو نیلے سمندروں میں اُتر جائیں جو کسی روز

فرقت کی شبِ غم سے گزر جائیں جو کسی روز
تصویر کی صورت وہ سنور جائیں جو کسی روز

آنکھوں میں چمک آئے ہونٹوں پہ تبسم ہو
رسما ہی سہی ہم اُن کے گھر جائیں جو کسی روز

اغیار یہ چاہیں گے گلشن میں ہو ویرانی
آنگن کو گلابوں سے بھر جائیں جو کسی روز

یورش ہو خیالوں کی اور رات کا سناٹا
ہم اپنے ہی سائے سے ڈر جائیں جو کسی روز

عقاب صفت ہیں ہم، پہاڑوں پہ ٹھکانا ہے
مر جائیں اگر گھر میں، ٹھہر جائیں جو کسی روز

ممتاز مہک اٹھے گلشن میری سانسوں سے
خوشبو کی طرح یہاں پہ بکھر جائیں جو کسی روز

حضرت شاہ دولہ دریائیؒ

اس میں شک نہیں کہ مسلمان کشور کشاؤں نے برصغیر کو بزور شمشیر فتح کر کے ہندی عوام کو نئے طرز حیات اور نئی تہذیب سے رُوشناس کر دیا، تاہم یہ بات بھی مبنی بر حقیقت ہے کہ اسلامی تعلیمات کی ترویج و ترقی صوفیائے کرام کی مساعی جمیلہ کی مرہونِ منت رہی ہے۔ ہند میں بسنے والے ہر مسلمان درویش بے ریا نے مسلکِ محبت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے عوام کے دلوں کو مسخر کیا اور دینِ فطرت کے اس عطر بیز پہلو سے سارا ماحول مہک اٹھا۔ ان خدا دوست بندوں میں شاہ دولہ دریائیؒ کی ذات گرامی مینارۂ نور کا درجہ رکھتی ہے

اختر حسین شیخ

www.bookspk.net
Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ خوبصورتی کا شہکار وہ ہرن، ہر خطرے سے بے نیاز دکھائی دیتا تھا حالانکہ وہ شکارگاہ میں تھا۔ جانور اپنی چھٹی حس کی بنا پر خطرے کی بو پا کر چوکنے ہو جاتے ہیں لیکن منفرد ہیئت کذائی کا حامل وہ مست خرام غزال تو گویا کنجِ عافیت میں "ٹہل" رہا تھا اور حیران کن بات یہ ہوئی کہ اس منفرد ہرن کو دیکھ کر شکاری اپنا وظیفہ بھول گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے شکار کرنے والے خود شکار ہو چکے ہوں۔ مغل شاہنشاہ نورالدین جہانگیر شاہدرے کے نواحی علاقے میں اپنے مصاحبوں کے ہمراہ شکار کھیل رہا تھا، جب اسے یہ "کلاہ پوش" ہرن دکھائی دیا۔ مغل بادشاہ نے اس سے پیشتر ایسا جنگلی جانور کبھی دیکھا ہی نہیں تھا جس نے ٹوپی پہن رکھی ہو۔ کلاہ ٹوپی یا دستار تو انسانوں کے پہناوے ہیں جو گنبد سر کی زینت دوبالا کرتے ہیں اور اگر وہ سر کسی شہنشاہ کا ہو تو اسے "تاج" سے سجا دیا جاتا ہے۔ مذکورہ ہرن نے جو ٹوپی پہن رکھی تھی اس میں "کوڑیاں" ٹانکی ہوئی تھیں اور رنگین کوڑیوں کے یہ نقش و نگار ٹوپی کی زیبائش میں اضافہ کر رہے تھے۔ مغل شہنشاہ جہانگیر اور کلاہ پوش غزال ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے اور اسی صورت حال نے جہانگیر کو ورطۂ حیرت میں ڈبو رکھا تھا۔ مصاحب کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ مصاحب کورنش بجا لا کر لب کشا ہوا۔ "حضور! یہ ہرن آوارہ یا جنگلی نہیں بلکہ اس کا تعلق سید کبیرالدین شاہ دولہ دریائی گنج بخش کے آستانے سے ہے۔ سید موصوف بلند مرتبت ولی اللہ ہیں"۔

یہ کہہ کر مصاحب نے ولی اللہ کا مفصل تعارف پیش کیا اور درویش کی لاتعداد کرامات بھی حاکم وقت کے گوش گزار کیں۔ حاکم وقت نے مصاحب کا بیان پوری توجہ سے سنا۔ درویش سے ملاقات کی شدید خواہش کے ساتھ ساتھ جہانگیر کے دل میں "اندیشہ ہائے دور دراز" نے بھی جنم لیا، کیونکہ مصاحب نے درویش کو "ہر دلعزیز" بھی قرار دیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ دنیاوی حکمران، جنگی ساز و سامان، افواج کثیر وغیرہا کے ہوتے ہوئے بھی اندر سے ہمیشہ خوفزدہ ہی رہتے آئے ہیں۔ ہوا کے معمولی جھونکوں سے ان کو اپنا تخت شاہی ڈولتا محسوس ہوتا ہے۔ تاہم جہانگیر نے فکر و اندیشے کے اظہار سے گریز کرتے ہوئے شوقِ ملاقات کا اظہار کیا اور کہا۔

"واقعی جن کے "کلّے" مضبوط ہوں وہ ہر خطرے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اس غزال کو دیکھو۔ شکاریوں کے نرغے میں کھڑا ہے مگر ڈر خوف سے مکمل آزاد ہے، کیونکہ اس کا تعلق بلند مرتبت آستانے کی مالک ہستی سے ہے۔ ایسی ہستیوں کے متعلق ہی تو ارشاد ربانی ہے۔ "خبردار! خدا دوست حضرات، خوف و خطر اور حزن و ملال سے آزاد قرار دیئے جاتے ہیں"۔ یہ ہرن اپنے تعلق کے سہارے قلانچیں بھرتا کالے کوسوں کا سفر طے کر کے گجرات سے یہاں آ پہنچا ہے۔ بادولت اسے بھی درویش کی کرامت خیال کرتے ہیں"۔ یہ کہہ کر جہانگیر نے اپنے مصاحبوں کو حکم دیا۔ "اس مست خرام غزال کو بطور مہمان روک لیا جائے اور درویش سے ہماری ملاقات کا اہتمام کیا جائے"۔

حکم حاکم کی تعمیل ہوئی تیز رفتار پیادے گجرات کی طرف چل دیئے اور "دربخت" نامی ہرن کو شاہی ملازموں نے روک لیا۔ ادھر شاہدرے میں یہ کارروائی ہو رہی تھی۔ اُدھر گجرات میں درویش حق شناس نے اپنے عقیدت مندوں سے ارشاد فرمایا۔ "پہاؤ" (لاڈ پیار، شفقت اور مہر و محبت کے اظہار کے لئے پنجابی زبان میں مخاطب کو 'پہاؤ' کہا جاتا ہے اور حضرت شاہ دولہ دریائی کا یہ تکیہ کلام تھا) دیکھو تو، ہمارے 'دربخت' نے کیا گل کھلایا ہے۔ دریا کے اس پار جہانگیر بادشاہ تک جا پہنچا ہے اور مغل شاہنشاہ نے اس ناچیز سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ اس کے پیادے گجرات کی طرف چل دیئے ہیں۔ غروب

آفتاب سے پہلے وہ یہاں پہنچ جائیں گے لہٰذا ان کی دعوت کا انتظام ہونا چاہئے"۔

عقیدت مندوں کو کامل یقین تھا کہ درویش کی ہر بات سچی ہوتی ہے لہٰذا وہ مہمانوں کی خاطر و مدارات کا اہتمام کرنے لگے اور چراغ جلے (بوقت شام) شاہی ہرکارے بھی پہنچ گئے۔ شاہی قاصدوں نے وہ رات آستانۂ درویش پر بسر کی اور دوسرے روز شاہ دولہ دریائی قاصدوں کے ہمراہ شاہدرے پہنچے۔ شہنشاہوں سے اولیائے کرام کی ملاقات کوئی اچنبھے والی بات نہیں۔ بعض اوقات تو یہ ملاقات سرکش گھوڑے کو لگام دینے کے زمرے میں آتی رہی ہے۔ یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ درویش دنیاوی حکمرانوں سے دنیاوی آسائشوں کے طلبگار نہیں ہوا کرتے کیونکہ ان کی نگاہوں میں ماسوا کی حقیقت صفر ہوا کرتی ہے۔ بہرحال، حضرت شاہ دولہ لاہور پہنچے تو انہوں نے ضروری اشیاء منگوا کر مغل شہنشاہ کے لئے "من" تیار کیا (پنجابی میں بڑے حجم کی روٹی کو من کہتے ہیں) یہ اس سچائی کی طرف اشارہ تھا کہ اے حاکم وقت! انسان کی بنیادی ضرورت صرف روٹی تھی، ہے اور رہے گی۔ غریب سے غریب اور امیر سے امیر شخص کے درمیان ایک ایک دو وقت کی روٹی کا فرق ہوا کرتا ہے۔ اگر یہ نہ ملے تو پھر امیر و غریب دونوں اپنی اوقات پر آ جاتے ہیں۔

لوگ بھوکے ہوں تو یہ عقدہ کھلے
کون کتنا صاحب کردار ہے

لہٰذا انسان کو اپنی "اوقات" فراموش نہیں کرنی چاہئے اور بنیادی ضرورت پوری ہو جائے تو دوسروں کی حق تلفی سے گریز ہی مناسب ترین رویہ ہے۔

درویش نے یہ "من" جب مغل بادشاہ کو پیش کیا تو درباری حیران رہ گئے۔ تاہم درویش نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ جہانگیر حاکم وقت تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ملکہ نور جہاں کے اختیارات مغل شاہنشاہ سے کم نہیں تھے۔ اہل دانش تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اصل حکمران ہی ملکہ نور جہاں تھی۔ چنانچہ شاہ دولہ دریائی اور جہانگیر کی ملاقات کے وقت ملکہ نور جہاں بھی موجود تھی۔ دونوں نے نورانی چہرے والے خدا دوست کو دیکھا تو ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے۔ جہانگیر کی حسن پرستی کوئی راز والی بات نہیں مگر جس جلوے کا نظارہ اس کی نگاہوں نے کیا وہ چیز ہی کچھ اور تھی۔ درویش کے نورانی چہرے سے سب کی نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ میاں بیوی نے سن رکھا تھا کہ شاہ دولہ کے آستانے پر لنگر جاری رہتا ہے اور رفاہِ عام کے کاموں پر بھی بے تحاشا خرچ آتا ہے۔ جہانگیر نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق سوال کیا۔

"آپ نے پارس پتھر کہاں سے حاصل کیا ہے؟"

مطلب یہ تھا کہ درویش کے پاس ضرور پارس پتھر ہے جس کی مدد سے سونا بنا کر جملہ مصارف برداشت کئے جاتے ہیں۔

"میرا پارس پتھر میری فقیری ہے"۔ حضرت شاہ دولہ نے جواب دیا۔ عوام الناس آج تک یہی سمجھتے رہے ہیں کہ درویش کا مطلب تھا کہ وہ صدقہ خیرات پر گزر اوقات فرماتے ہیں۔ یہی مفہوم مختلف قلمکاروں نے بھی ادا کیا ہے لیکن ہمیں اس سے شدید اختلاف ہے۔ شاہ دولہ دریائی جیسی ہستی کے لئے صدقہ خیرات پر گزر بسر کرنے کا تصور بھی سوئے ادب ہے۔ درویش نے کائنات کے سب سے بڑے ہادی حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حدیث مبارکہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یعنی "الفقر و فخری" میرا فقر میرے لئے باعث فخر ہے۔ تاہم اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد یہ بھی ہے کہ "کاد الفقر ان یکون کفرا" (تنگ دستی انسان کو در کفر تک لے جا سکتی ہے)۔ دونوں احادیث کا مفہوم سمجھنے کے لئے عقل سلیم کی

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ضرورت ہے اور اس بحث میں الجھنا موضوع سے ناانصافی بلاوالی بات ہوگی لہٰذا آمدم برسرِ مطلب......

جہانگیر درویش کی شخصیت سے خوفزدہ ہوگیا۔ اس میں سرِفہرست موصوف کی ہردلعزیزی تھی۔ چنانچہ ملکہ نور جہاں کے مشورے سے حاکم وقت نے فیصلہ کیا کہ شاہ دولہ دریائی کا کام تمام کر دیا جائے۔ حکم شاہی کے مطابق زہریلا سبز پیرہن تیار کیا گیا۔ خیال یہی تھا کہ زہریلا لباس پہنتے ہی درویش کے جسمانی مسام سارا زہر چوس لیں گے اور جب زہریلا مل جسم میں سرایت کر جائے گا تو شاہ دولہ دریائی کا خاتمہ یقینی ہوگا لیکن ہوا یہ کہ زہریلا لباس درویش کا بال بھی بیکا نہ کر سکا۔ سرکاری درباری حماقت مآبوں کے لئے یہ صورت حال حیران کن بلکہ باعث تشویش تھی۔ تاہم اس صورت حال کو اتفاق گردانتے ہوئے دوسرا نسبتاً زیادہ زہریلا لباس تیار کرایا گیا۔ یہ لباس بھی درویش نے ہنسی خوشی پہننے کے بعد زندہ سلامت رہ کر حاکم وقت کو سخت شرمسار کر ڈالا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ کوئی لیٹی رکھے بغیر درویش کو زہریلا شربت پلا کر ہلاک کر دیا جائے۔

ادھر شربت تیار ہو رہا تھا، ادھر وہ تختِ شاہی جس پر مغل شہنشاہ جہانگیر براجمان تھا، یکلخت لرزنے لگا نہ صرف تخت بلکہ سارا راج محل بُری طرح ہلنے لگا جیسے زیر و زبر کر دینے والے زلزلے کی زد پر آ گیا ہو۔ بعض جہالت مآبوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے واقعی کسی شدید زلزلے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ یہی کچھ درویش اور دنیاوی حاکم کی ملاقات کے وقت ہوا لیکن اب مغل بادشاہ کے ہوش ٹھکانے آ چکے تھے لہٰذا اس نے شاہ دولہ کی عظمت کو صدقِ دل سے تسلیم کر لیا اور اظہارِ عقیدت کے طور پر اشرفیوں کی دو تھیلیاں پیش کیں۔ درویش نے وہ تھیلیاں شاہی ملازموں میں تقسیم کر کے اپنی افتادِ طبع کا اظہار کر دیا۔ شہنشاہ نے دوسرا جال پھینکا اور خانقاہ کے لئے پانچ ہزار بیگہ اراضی کی پیشکش کی مگر درویش نے کمال فراست سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا۔ ”ناچیز کو اراضی وغیرہ کی ضرورت نہیں“۔ اور فسادِ شر کو دور کرنے کے لئے یہ بھی کہا۔ ”اگر ضرورت محسوس ہوئی تو پھر کبھی دیکھا جائے گا“۔ مغل شہنشاہ لاجواب ہو چکا تھا لہٰذا بصد احترام رخصت کرنے پر مجبور ہو گیا۔

O

سید کبیرالدین جو برِصغیر میں شاہ دولہ دریائی کے نام سے مشہور ہوئے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں 1581ء کو پیدا ہوئے۔ موصوف کے والد محترم عبدالرحیم خاں کا تعلق لودھی خاندان سے تھا جو برِصغیر پر 1451ء تا 1526ء حکمران رہا۔ شاہ دولہ کے والد محترم سلطان ابراہیم لودھی کی اولاد میں سے تھے جو بہلول شاہ لودھی کا پوتا تھا۔ بہلول شاہ نے 894ھ بمطابق 1488ء میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ خاندان مذکورہ کے آخری شہنشاہ ابراہیم لودھی کو مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر نے 1526ء میں شکست دے کر ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد رکھی۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو شاہ دولہ دریائی کا تعلق پٹھان قبیلے سے بنتا ہے۔ تاہم سرزمین گجرات (پنجاب) کے گوجروں کے بقول درویش موصوف گوجر خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ نعمت خاتون سلطان سارنگ گکھڑ کی پڑپوتی تھیں۔ شاہ دولہ دریائی کا ددھیالی خاندان تو کسی تعارف کا محتاج نہیں تاہم ننھیالی خاندان کا مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے۔

سلطان سارنگ گکھڑ اور گکھڑ خاندان کی تاریخ سے آگاہی کے لئے ”کیگوہرنامہ“ نامی کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے جسے رائے زادہ دیوان دنی چند نے تالیف کیا۔ مذکورہ کتاب میں مرقوم ہے کہ سلطان ہاتھی کی وفات کے بعد گکھڑوں کی سرداری سلطان سارنگ کے

حصے میں آئی۔ مغل خاندان اور گکھڑوں میں ایسا رشتہ اخوت استوار ہوا جو زمانے کے نشیب و فراز سے متاثر نہ ہو سکا۔ دولت خاں کے ایما پر جب مغل شہنشاہ بابر نے سلطان ابراہیم لودھی کے خلاف شمشیر آبدار بے نیام کی تو یہ رشتہ کھل کر سامنے آ گیا۔ بابری لشکر نے دریائے سندھ کے کنارے پڑاؤ ڈالا تو بابر سے سلطان سارنگ اور سلطان آدم کو اپنی مدد کے لئے پکارا۔ یہ گکھڑوں کی مغلوں سے وفا کا امتحان تھا۔ سلطان سارنگ اور آدم نے دوست کی آواز پر فوراً لبیک کہا۔ اس طرح بابر نے آزمائش پر پورا اترنے والوں سے پائیدار رشتہ استوار کر لیا۔ بابر نے جب زیب تن کی ہوئی پوستین اتار کر سارنگ خاں کو پہنا دی تو رشتہ اخوت میں شک و شبے کی گنجائش نہ رہی۔ تاریخ گواہ ہے کہ گکھڑوں نے اس رشتے کا حق ادا کر دیا۔

نصیرالدین ہمایوں کا ستارہ گردش میں آیا تو گکھڑوں نے اس وقت بھی اس رشتے پر آنچ نہ آنے دی۔ چنانچہ سوری خاندان سے گکھڑوں کی سات سال تک مسلسل معرکہ آرائی کا سبب یہی رشتہ اخوت قرار دیا جاتا ہے۔ جنگ کے شعلے بھڑکے تو سوری افواج کا پلڑا بھاری رہا۔ سلطان سارنگ اور آدم نے ایک پہاڑی مقام پر ڈیرے ڈال دیئے۔ سارنگ نے اپنے بیٹے کمال خاں کو افغانوں کے پاس مصالحتی ملاقات کے لئے روانہ کیا جسے افغانوں نے گرفتار کر کے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔ جہلم کے قریب میدان کارزار گرم ہوا تو سلطان سارنگ اپنے 16 عدد بیٹوں کے ساتھ مغل دوستی پر قربان ہو گیا۔ افغانوں نے کھال کھچوا کر اس کی لاش قلعہ روہتاس کے مرکزی دروازے پر لٹکوا دی۔ (شیر شاہ سوری نے مغلوں کے سدباب کے لئے جہلم کے قریب قلعہ روہتاس تعمیر کرایا تھا) سلطان سارنگ کی شکست کے بعد اس کا خاندان پابند سلاسل ہوا۔ اسیروں میں سلطان سارنگ کی ایک پوتی بھی تھی جس کی گود میں شیرخوار بچی نعمت خاتون تھی اور یہی وہ نعمت خاتون ہے جسے شاہ دولہ دریائی کی والدہ ماجدہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

سلطان سارنگ کی پوتی اور غازی خاں کی بیٹی اپنی شیرخوار بچی کے ہمراہ دہلی پہنچا دی گئی۔ رفتہ رفتہ مغل خاندان کا ستارہ گردش سے نکل آیا اور ہمایوں تختِ دہلی پر دوبارہ قابض ہوا۔ 1556ء میں نصیرالدین ہمایوں کی وفات کے بعد جلال الدین اکبر تخت نشین ہوا تو عبدالرحیم لودھی اس زمانے میں شاہی ملازمت میں تھے۔ اکبر کے پہلے سال جلوس کے فوراً بعد نعمت خاتون اور عبدالرحیم لودھی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے اور 25 برس بعد 1580-81ء میں شاہ دولہ دریائی اس عالم رنگ و بو میں تشریف لائے۔

عالم فانی میں آتے ہی شاہ دولہ دریائی کو یتیمی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی سال ان کے والد عبدالرحیم لودھی سفرِ آخرت اختیار کر گئے۔ بیوہ نعمت خاتون کو اپنے خاندان کی عظمت رفتہ کا احساس تھا آخر وہ سلطان سارنگ کی پڑپوتی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ یتیم بیٹے کو اپنے ساتھ لے کر وہ اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین پر پہنچ جائے۔ موصوفہ کا خیال یہی تھا کہ ”پھاس“ کی سرزمین (عہدِ حاضر میں جہلم اور راولپنڈی کا علاقہ) نامہربان ثابت نہیں ہوگی۔ اسی سرزمین پر اس کے خاندان کا طوطی بولا کرتا تھا لیکن جب وہ پھاس پہنچی تو اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ یہ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو جانے والی بات تھی۔ اس زوال نصیب خاندان کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ نعمت خاتون کو ایک چھوٹے سے گاؤں سہالہ نے خوش آمدید کہا لیکن بدنصیبی نے یہاں بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ پانچ برس تک مسلسل چکی پیس کر اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پالنا پڑا۔ گویا شاہ دولہ دریائی کی آزمائش کا آغاز بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

محنت شاقہ کے باوجود جب سہالہ کی سرزمین نعمت خاتون پر تنگ ہوگئی تو سفر وسیلہ ظفر کے مصداق وہ "کالا" نامی گاؤں میں چلی گئیں۔ یہاں بھی وہی دکھ بھرے دن اور آزمائش کی طویل راتیں تھیں۔ چار سال مزید دکھ جھیلنے کے بعد نعمت خاتون نے 1590ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔ وہ خود تو دکھوں سے آزاد ہوگئیں مگر اپنے کمسن بیٹے کو لاوارث چھوڑ گئیں۔ اب شاہ دولہ یتیم بھی تھے اور یسیر بھی۔ یتیم و یسیر بچہ تو عام حالات میں بھی خشک پتے کی طرح ہواؤں کی زد پر ہوتا ہے اور یہاں تو بچے کے ننھیال ددھیال کی جانب سے کوئی پُرسان حال نہیں تھا، گزر اوقات کیسے ہوتی۔ عام کتب میں یہی لکھا ہے کہ بچے نے گداگری کا ارادہ کرلیا یا گداگری سے وہ پیٹ پالنے لگا۔

شاہ دولہ کی پرورش ناز و نعم سے ہونے لگی لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ سامان کی فراوانی بچے کی شخصیت میں بگاڑ پیدا کرنے کے بجائے نکھار پیدا کرنے لگی۔ عموماً یہی دیکھا گیا ہے کہ محرومیوں کے بعد فراوانی میسر آ جائے تو انسان راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے لیکن شاہ دولہ دریائی تو اوائل عمری سے سمندر جیسے ظرف والے ثابت ہوئے اور ظرف دریاؤں کا چھلکا کرتا ہے سمندروں کا نہیں۔

مہتہ کھیما کا تعلق قانون گو طبقے سے تھا، ادھر بچے کی ذہانت کا یہ عالم کہ جس شئے پر ایک بار نگاہ پڑ گئی وہ ذہن کے کورے کاغذ پر محفوظ ہو کر رہ گئی۔ دور ابتلا تھا یا جیسا کہ بعد کے حالات نے ثابت کیا، اندر کی صفائی مطلوب تھی، دربدر خاک بسر ہوتے ہوتے شاہ دولہ مستقبل کے گنج بخش، سیال کوٹ پہنچ گئے جہاں ایک متمول وڈیرے مہتہ کھیما سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ مہتہ کھیما کے ہاں دنیاوی ساز و سامان کی بہتات تھی مگر پروردگار نے اسے اولاد جیسی نعمت سے محروم رکھا ہوا تھا۔

گویا قدرت نے شاہ دوالہ دریائی کے لئے حالات کو سازگار بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مہتہ کھیما بچے کی نشست و برخاست دیکھ کر متاثر ہوا تو بھولی بھالی صورت نے اس کے دل میں گھر کرلیا۔ اس طرح بچے کی سابقہ محرومیوں کا، پرورش کی حد تک ازالہ ہوگیا۔ گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو قدرت نے غیر مسلم شخص کے دل میں بچے کے لئے جذبہ ترحم پیدا کر کے اہل دنیا کو دکھا دیا کہ کارخانہ قدرت کو چلانے والا قادرِ مطلق واقعی جو چاہے کرسکتا ہے، وہ سبب کے علاوہ مسبب الاسباب بھی ہے۔ یہ الگ بات کہ عصرِ حاضر میں اسے "فوٹوگرافک میموری" کہا جاتا ہے۔ قانون گوؤں نے شاہ دولہ کی ذہانت سے استفادہ کرنے کا فیصلہ کیا اور "توشہ خانے" کا انتظام و انصرام ان کے سپرد کردیا گیا۔

شاہ دولہ کو "دریائی" کہنے یا کہلائے جانے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ موصوف دریا دل واقع ہوئے تھے۔ منصور حلاج کے دست راست شبلیؒ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ وہ کتنے فیصد زکوٰۃ ادا کرے، شبلیؒ کا جواب کتب تصوف میں محفوظ ہے، انہوں نے فرمایا۔ "اگر تمہارا تعلق نیک افراد کے گروہ سے ہے تو احکام شریعت کے مطابق سو میں سے اڑھائی درہم زکوٰۃ ادا کر کے اپنے مال کو پاک صاف بنالو لیکن اگر تم "مقربین" میں سے ہو تو اس ترتیب کو الٹ دو۔ یعنی اڑھائی رکھ کر ساڑھے ستانوے درہم راہِ خدا میں دے ڈالو۔ بشرطیکہ تمہیں اڑھائی درہم کی اشد ضرورت درپیش ہو ورنہ بہتر ہے کہ درہم و دینار سے فوراً نجات حاصل کرلو۔ کیونکہ زندگی 'مال' سے نہیں 'اعمال' سے بنتی ہے"۔ شاہ دولہ دریائی اسی مقولے پر عمل کرنے والے ثابت ہوئے۔ توشہ خانہ زیرِ تسلط آیا تو سوال کرنے والوں کو بن آئی جس نے جو مانگا وہ حاضر کردیا۔ کوئی سائل خالی ہاتھ نہ جاتا۔ رفتہ رفتہ توشہ خانہ خالی ہونے لگا اور محتاج لوگ پیٹ بھر کر کھانے

لگے۔ قانون گوؤں نے استفسار کیا تو شاہ دولہ نے حقیقت کا اظہار کردیا لیکن کسی نے اس اظہارِ حقیقت کا اعتبار نہ کیا۔ اس طرح یہ لوگ موصوف کے خلاف ہوگئے اور ان کو طرح طرح کی اذیتیں دینے لگے۔ یہ الگ نوعیت کی آزمائش تھی۔

قانون گوؤں کی اذیتیں ناقابلِ برداشت ہوگئیں تو شاہ دولہ نے ذہنی و جسمانی تکالیف سے نجات حاصل کرنے کی خاطر دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔ "توشہ خانے کی دولت، اسی توشہ خانے میں زیرِ زمین دفن ہے، مجھے وہاں لے چلو اور زمین کھود کر دولت حاصل کرلو"۔ یہ سنتے ہی سزا دینے والوں نے ہاتھ روک لئے اور شاہ دولہ کو لے کر توشہ خانے میں آ گئے۔ حیات شاہ دولہ پر لکھی جانے والی تمام کتب میں یہی مرقوم ہے کہ شاہ دولہ دریائی نے توشہ خانے میں پہنچتے ہی خنجر آبدار اپنے پیٹ میں گھونپ لیا۔ اس کارروائی سے سب کے ہوش اڑ گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر شاہ دولہ ہلاک ہو جاتے تو قانون گوؤں پر اقدام قتل کا مقدمہ دائر ہو جاتا اور ان کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اربابِ اختیار کو کون یقین دلاتا کہ ہلاک ہونے والے نے خودکشی کی ہے۔

شاہ دولہ کے مذکورہ اقدام کی توجیہہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اصل میں موصوف نے سزا دینے والوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اگر توشہ خانے کا سامان ہم نے اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر فروخت کیا ہے تو لو ہم اپنے پیٹ ہی کا خاتمہ کئے دیتے ہیں۔ بہرحال قانون گوؤں پر اربابِ اختیار کا خوف طاری ہوا تو زخمی کی جان بچانے کے لئے بھاگ دوڑ ہونے لگی۔ تلاش بسیار کے بعد ایک ماہر طبیب کی خدمات حاصل کی گئیں اور زخمی کو موت کے منہ سے کھینچ لانے کی کاوشیں ہونے لگیں۔ مسلسل تین ماہ تک شاہ دولہ صاحبِ فراش رہے تب جا کر کہیں وہ زخم مندمل ہوا۔ قانون گوؤں کے خوف کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے نہ صرف شاہ دولہ کو آزاد کردیا بلکہ موصوف کو نقل مکانی کر جانے پر راضی بھی کرلیا۔ شاہ دولہ دریائی نے کون سا سامانِ سفر باندھنا تھا۔

پلے رزق نہ بنھدے پنچھی تے درویش
جنہاں تقویٰ رب دا اوہناں رزق ہمیش

کے مصداق شاہ دولہ سیالکوٹ کے نواحی گاؤں سنگھوئی (بعض کتب میں سنگروہی بھی آیا ہے) کی طرف چل دیئے جہاں مردِ حق شناس شاہ سیدن یا سیدا سرمست کا آستانہ تھا۔

شاہ دولہ سیدا کے دربار میں حاضر ہوئے تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے مسافر منزل پر پہنچ گیا ہو۔ سیدا مست الست نے پہلی نگاہ ہی میں شاہ دولہ دریائی کو گھائل و قائل کرلیا اور اس طرح شاہ دولہ نے اپنے جملہ اختیارات مست الست مرد کے حوالے کر دیئے۔ راہِ سلوک کا پہلا سبق ہی یہ ہے کہ مرشد کی رضا کو بلا چون و چراں تسلیم کرلیا جائے اور اپنے قول و فعل سے اس کا ثبوت پیش کیا جائے اور دوسری یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ مرشد کے احکام کو من و عن بجا لایا جائے خواہ وہ احکام بظاہر ناقابل فہم دکھائی دیتے ہوں۔

شاہ دولہ نے اپنی فراست سے معلوم کرلیا کہ منگو نامی مرید کو شاہ سیدا کا تقرب حاصل ہے لہٰذا ضروری تھا کہ مرشد کے دل میں گھر کرنے کے لئے منگو مرید کو رام کیا جائے۔ چنانچہ شاہ دولہ تندہی سے منگو کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ بھگتی مارگ یا رہِ عشق جسے سفر سلوک کہا جاتا ہے، دنیاوی سفر سے قطعاً مختلف ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کاروبار عشق میں نفع و نقصان کا معیار ہی بدل جایا کرتا ہے۔ اسی معیار کو اپناتے ہوئے شاہ دولہ نے اپنے مرشد اور مرید مرشد کا تقریب حاصل کرنے میں دن رات ایک کر دیئے۔ حد یہ کہ اپنے منظورِ نظر حضرات کی خاطر دریوزہ گری تک سے گریز نہ کیا۔ یہ کانٹوں پر رقص

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کر کے یار منانے والی بات تھی۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی شاہ دولاہ کاسۂ گدائی لے کر گرد و نواح میں نکل جاتے اور جو کچھ حاصل ہوتا اسے لا کر مرشد کے سامنے رکھ دیتے۔ مرشد کے بعد ان کے مقرب منگو کی باری آتی۔ منگو شکم آسودہ ہو جانے کے بعد کاسۂ گدائی شاہ دولہ کی طرف سرکا دیتا۔ اس طرح بچے کھچے ٹکڑے شاہ دولہ کے حصے میں آتے جن سے پیٹ تو کیا بھرتا کھانے کی رسم ضرور پوری ہو جاتی۔ ''داستانِ شاہ دولہ'' میں مرقوم ہے کہ خیرات کو تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہاتھ کا میل کچیل قرار دے کر اس سے گریز کی تلقین فرمائی ہے۔ لہٰذا ان کی نگاہِ کرم کے طالبان اس پیشے کو کس طرح پسند کر سکتے ہیں۔ آخر ایک روز شاہ سیدا نے اظہار مدعا کرتے ہوئے کہا۔ ''شاہ دولہ ہمارا پیٹ خیرات کے ٹکڑوں سے بھرنے کو کامیابی خیال کرتا ہے۔ محنت مزدوری کر کے کھلاتا تو خوب ہوتا''۔ یہ سنتے ہی شاہ دولہ نے کاسۂ گدائی ایک طرف رکھ دیا اور مرشد کے تجویز کردہ راستے پر چل نکلے۔

سیالکوٹ میں ایک قلعہ تعمیر ہو رہا تھا، تعمیر کا طریق کار یہ تھا کہ پرانی عمارات کی بنیادیں کھود کر سنگ و خشت کا حصول ہوتا اور یہی اینٹیں قلعے کی تعمیر میں استعمال کی جاتیں۔ پرانے زمانے کی عمارتیں اور ان کی بنیادیں اتنی مضبوط ہوا کرتی تھیں کہ کھدائی کرنے والوں کو دانتوں پسینہ آ جاتا۔ مشہور ہے کہ طاقتور سے طاقتور اور تجربہ کار سے تجربہ کار مزدور دو تین گز مربع سے زیادہ کھدائی نہیں کر سکتا تھا اور مزدوری ایک ٹکہ فی مربع گز ہوا کرتی تھی (یعنی 2 پیسے فی مربع گز)۔ شاہ دولہ نے خدا کا نام لے کر کھدائی کا آغاز کیا تو ٹھیکے داروں کے تخمینے دھرے کے دھرے رہ گئے، پہلے روز گرفتار لو نے ستر مربع گز زمین کھود ڈالی اور حاصل شدہ اینٹوں کا انبار لگا دیا۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی لیکن اس کا کیا علاج کے سب کچھ سب

کے سامنے تھا۔ افسران بالا و اعلیٰ نے اسے مافوق الفطرت کارنامہ قرار دیا اور حساب کی رُو سے ستر ٹکے شاہ دولہ کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ مزید حیران کن بات یہ ہوئی کہ مزدور نے ستر ٹکوں کے بجائے صرف چار ٹکے وصول کئے اور باقی رقم یہ کہہ کر واپس کر دی۔ ''فقیر کو صرف چار ٹکوں کی ضرورت ہے اور ضرورت سے زائد مال و زر باعث فساد ہے''۔ شاہ دولہ کے صرف اسی عمل سے ان کی افتادِ طبع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چار ٹکے لے کر انہوں نے مرشد کے کام و دہن کی دعوت کے لئے لذیذ کھچڑی تیار کروائی اور کھچڑی بھری تھالی یا طشت بصد احترام ان کی خدمت میں پیش کر دیا لیکن راہِ سلوک کے مسافر سے یہاں ایک چوک ہو گئی، حلال کمائی سے حاصل کی ہوئی کھچڑی پیش کرتے وقت شاہ دولہ نے فخریہ لہجہ میں کہا کہ انہوں نے ستر مربع گز زمین کھود ڈالی تھی۔ یہ تعلّی مرشد کو پسند نہ آئی۔ حقیقی تربیت کا انداز ہی یہ ہوا کرتا ہے کہ سالک کو لغزشوں سے پاک صاف کر کے اس کے سینے کی تطہیر فرما دی جائے۔ چنانچہ شاہ سیدا نے کمال سلیقے سے یہ فریضہ انجام دیا۔ موصوف نے زیرِ لب مسکرا کر اپنا سیدھا ہاتھ شاہ دولہ کے سامنے کر دیا۔ مرشد کی ہتھیلی آبلوں سے بھری ہوئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کھدائی میں مرشد اپنے مرید کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔

شاہ دولہ نے مرشد کی ہتھیلی دیکھ کر سرِ نیاز خم کر دیا۔ اسی پر بس نہیں ہوئی، شاہ سیدا نے پس خوردہ کھچڑی کے چند لقمے شاہ دولہ کو عنایت فرما دیئے۔ شاہ دولہ نے پہلا لقمہ منہ میں ڈالا تو سیدھے ہاتھ کی درمیانی انگلی گویا چکی کے دو پاٹوں کے بیچ آ گئی۔ درد کی شدت سے شاہ دولہ کا رنگ اڑ گیا۔ یہ ایسی آزمائش تھی جسے واویلا مچائے بغیر برداشت کرنا بے حد ضروری تھا۔ ہر پل درد میں اضافہ لے کر آتا لیکن شاہ دولہ نے بھی اس دردِ لا دوا کا مقابلہ

کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ الگ بات کہ نہ دن کو چین ملتا نہ رات کو آرام، دکھ بھرے شب و روز گزرنے لگے۔ آخر ایک روز منگو کو رحم آ گیا اور اس نے مرشد سے درخواست کی۔ ''حضور! شاہ دولہ کی تکلیف دور فرمائی جائے''۔ شاہ دولہ نے بھی اپنے پیر بھائی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ مرشد نے بھی غالباً اندازہ لگا لیا تھا کہ مرید کی اصلاح ہو چکی ہے لہٰذا حکم ہوا کہ مرید بوچڑ خانے جائے اور تازہ ذبح شدہ گائے کی انتڑیوں میں ہاتھ ڈال دے۔ انگلی کا درد اگر عجیب تھا تو علاج عجیب تر لیکن شاہ دولہ کو یقین تھا کہ دردِ انگشت یا علاج سب ظاہری علامتیں ہیں، اندر کی بات کچھ اور ہے۔ عقلی توجیہہ تلاش کرنے یا ''کرید'' میں مبتلا ہونے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ شاہ دولہ بھاگم بھاگ بوچڑ خانے پہنچے اور حکم مرشد پر عمل پیرا ہوئے۔ انتڑیوں میں ہاتھ ڈالتے ہی سارے دکھ دور ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ شاہ دولہ 24 گھنٹے مسلسل گہری نیند سوتے رہے۔ آنکھ کھلی تو درد کے ساتھ دردیلی انگلی بھی غائب ہو چکی تھی۔ شاہ دولہ نے سکھ کا سانس لیا۔ ایک انگلی کی قربانی کوئی معنے نہیں رکھتی تھی۔ مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شاہ سیدا نے صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

''عزیزم! یہ درد بھی ضروری تھا اور انگلی کا کٹ جانا بھی کیونکہ تمہارے اندر غرور، گھمنڈ اور خود غرضی بھری ہوئی تھی جو راہِ سلوک کے مسافروں کو زیب نہیں دیتی۔ اب قادرِ مطلق کی مرضی کے عین مطابق تمہارا سینہ ان الائشوں سے پاک صاف ہو چکا ہے اور تمہارے دل میں خلقِ خدا سے مہر و محبت اور ہمدردی کا جذبہ رچ بس گیا ہے۔ خدا سے محبت کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس کی مخلوق سے صدقِ دل کے ساتھ پیار کیا جائے۔ عزیزم! تم نے اپنے آپ کو میرا منظورِ نظر اور معرفتِ الٰہی کا حقدار ثابت کر دیا ہے''۔

شاہ دولہ نے محسوس کیا کہ ان کا اندر روشن ہو گیا ہے۔ شاہ سیدا کا تعلق سہروردی سلسلے سے تھا (جسے چشتیہ، قادریہ سے بھی ملایا جاتا ہے) اس طرح شاہ دولہ بھی اسی سلسلے سے منسلک ہو گئے۔ عطا اور طلب کے مراحل طے ہونے لگے، یہ سلسلہ بارہ سال تک چلتا رہا۔ مرید نے مرشد کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ راہِ سلوک میں ایک پل کی غفلت مہلک ثابت ہوتی ہے اور بعض اوقات اس غفلت میں دستِ قدرت بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اب ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ سیدا سرمست کا آخری وقت آیا تو دستِ قدرت کی کارروائی کی تفصیل کھل کر سامنے آ گئی۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ منگو اپنے مرشد کا چہیتا مقرب تھا اور عام خیال یہی تھا کہ ''دلقِ درویش'' اسی کے نصیب میں ہو گی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، شاہ سیدا سرمست کو خبر ہو گئی کہ ان کا آخری وقت آ چکا ہے لہٰذا وہ بارِ امانت حقدار کو منتقل کرنے کے لئے بے چین ہو گئے۔ انہوں نے آواز دی ''کوئی ہے؟'' اتفاق کی بات کہ تمام مریدانِ باوفا گہری نیند سو چکے تھے صرف شاہ دولہ گوش بر آواز تھے۔ مرشد سے لگن کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا تھا۔ موصوف نے فوراً جواب دیا۔ ''حضور! دولہ حاضر ہے''۔

''جاؤ اور منگو کو فوراً بلا لاؤ''۔ مرشد نے دلی خواہش کا اظہار کیا۔ شاہ دولہ بھاگم بھاگ منگو کے پاس پہنچے اور انہوں نے مرشد کی خواہش اپنے پیر بھائی کے گوش گزار کی مگر حیران کن بات یہ ہوئی کہ منگو نے لیت و لعل سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''بھائی! رات کافی بیت چکی ہے، مجھے آرام کرنے دے''۔ یہی وہ پل بھر کی غفلت ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا تھا۔ مرشد نے تین بار منگو کو طلب فرمایا مگر شاید بدنصیبی نے اس کے خانۂ دل میں ڈیرا ڈال رکھا تھا، تینوں بار منگو نے شاہ دولہ کے ساتھ خدمت

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مرشد میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ خوش نصیبی صرف ایک بار در پر دستک دے تو کافی سمجھی جاتی ہے مگر یہاں تو تین بار در دل کھٹکھٹایا گیا تھا۔ آخر کافی انتظار کے بعد جب مرشد نے پھر آواز دی تو شاہ دولہ نے بصد احترام جواب دیا۔ ”حضور دولہ حاضر ہے“۔

مرشد نے دولہ پر ایک نظر ڈالی اور رضائے ربی کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ ”ہر کہ را مولا بدہد شاہ دولہ گردا“ (جسے اللہ سرفراز کرے وہی شاہ دولہ بن جاتا ہے)۔ یہ کہہ کر شاہ سیدا نے اپنی گدڑی دولہ کے حوالے کر دی اور اسی روز سے وہ ”شاہ دولہ“ بن گئے۔ حیات شاہ دولہ پر لکھی گئی تمام کتابوں میں ”دلق فقر“ کی سپردگی کے ضمن میں یہی مرقوم ہے۔ مختلف الفاظ کا مفہوم بھی ایک ہی ہے جسے مختصر اور خوبصورت انداز میں یوں کہا جا سکتا ہے۔ ”شاہ دولہ“ (جسے دے مولا)۔ یہی فقرہ راقم نے اپنے بزرگوں سے سنا جو حافظے میں محفوظ رہ گیا۔

گدڑی وصول کرنے کے بعد ”شاہ دولہ“ نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ منگو بزور بازو متاع فقیر چھین لے گا۔ تاہم اب دولہ چونکہ شاہ دولہ بن چکے تھے لہٰذا مرشد نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ”شاہ دولہ! اگر کوئی زبردستی پر اتر آئے تو یہ متاع فقر زمین پر رکھ کر اعلان کر دینا کہ جس میں ہمت ہو اسے اٹھا کر دکھائے“۔

مرشد کی تسلی سے شاہ دولہ کو دلی اطمینان حاصل ہو گیا کہ وہ کامیاب و کامران قرار دیئے جا چکے ہیں۔ ویسے بھی یہ دنیاوی شہنشاہیت تو ہے نہیں جس کی خاطر افواج کو حرکت میں لایا جاتا ہے۔ قتل و غارت گری، خون خرابہ یا چھینا جھپٹی کا درویشی سے کیا تعلق؟ خدمت مرشد کا پہلا فیض یہ ہوا کہ شاہ دولہ کی زبان میں حد درجہ تاثیر پیدا ہو گئی۔ جو بات منہ سے ادا ہو جاتی وہ پتھر پر لکیر ثابت ہوتی لیکن اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

طلوع آفتاب کے بعد سب کو خبر ہو گئی کہ شاہ سیدا سرمست سفر آخرت اختیار کر چکے ہیں۔ منگو کو اپنی غفلت کچوکے لگانے لگی، تاہم اسے یقین تھا کہ مرشد سے اس کے دلی لگاؤ اور خوشگوار تعلقات کا ایک زمانہ گواہ تھا۔ کسی پیر بھائی میں جرأت نہیں تھی کہ منگو کے مقام کو چیلنج کر سکے۔ تمام مریدوں نے مرشد کی تجہیز و تکفین میں اشک آلود آنکھوں اور سوگوار دلوں سے حصہ لیا۔ شاہ سیدا جب زیر زمین سو گئے تو منگو نے حسب توقع ”متاع فقر“ پر قبضہ جمانا چاہا مگر حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ ان کی نگاہوں کے سامنے پڑی ہوئی پیوند لگے کپڑوں کی گدڑی منوں وزنی بن گئی، منگو تو اس کا ایک کونہ بھی ہلا نہ سکا۔ پھر اس نے اپنے حواریوں کو پکارا۔ عجیب تماشا تھا مریدان سیدا سرمست مل کر زور لگا رہے تھے مگر وہ متاع فقر کو اٹھانے میں ناکام رہے۔ آخر شاہ دولہؒ نے آگے بڑھ کر دائیں ہاتھ سے گدڑی اٹھا لی اور چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے بڑے اطمینان سے پہن لی۔ بیشتر حضرات نے تسلیم کر لیا کہ حقدار کو اس کا حق مل گیا ہے مگر منگو اور اس کے چند ساتھیوں نے عظمت شاہ دولہ کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کدورت، دل کے ایک دروازے سے داخل ہو جائے تو درویشی دوسرے دروازے سے رخصت ہو جایا کرتی ہے۔ یہی کچھ وہاں بھی پیش آیا۔

شاہ دولہؒ اب دوررس بصارت اور گہری بصیرت کے مالک بن چکے تھے۔ اپنے ہم مرشد بھائیوں سے الجھنے کو تضیع اوقات تصور کرتے تھے لہٰذا وہ منظر سے غائب ہو گئے لیکن سیالکوٹ کی فضاؤں کو خیرباد نہ کہہ سکے۔ ان ہواؤں میں مرشد کی مہک رچی بسی تھی لیکن اجالے اور خوشبو کو مقید نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شہرت ہی ان کے قیام کی نقیب بن گئی۔

اپنے مرشد کے وصال کے سات برس بعد شاہ دولہ دریائی 1022ھ میں گجرات تشریف لے آئے۔ کیپٹن

اے سی ایلیٹ کی تحریر کے مطابق (موصوف 1899ء تا 1902ء ضلع گجرات کے ڈپٹی کمشنر رہے) یہ نقل مکانی 1022 ہجری کا واقعہ ہے۔ شاہ سیداؒ کا وصال 1015ھ میں ہوا لہٰذا یہ نقل مکانی بعید از قیاس قرار نہیں دی جا سکتی۔ ہندوستان پر اس وقت نورالدین جہانگیر کی حکمرانی تھی۔ مغل شہنشاہ بحیثیت مجموعی اہل اللہ کے عقیدت مند گردانے جاتے ہیں۔ جہانگیر سے حضرت شاہ دولہ دریائی کی ڈرامائی ملاقات کا ذکر، اس داستان کے آغاز میں کیا جا چکا ہے جس کی تفصیل قلمی نسخہ ”کرامت نامہ“ مشتاق رام میں دیکھی جا سکتی ہے جو زمانے کی دست برد سے تاحال محفوظ رہا ہے۔ اس ملاقات پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا گیا ہے کہ کسی ہرن کا گجرات سے شاہدرہ چلا جانا از حد دشوار ہے اور پھر ٹوپی پوش ہرن نے دریا کیسے عبور کر لیا؟ اس کا مدلل جواب دیا جا سکتا ہے لیکن طوالت کے خوف سے ہم اسے مناسب خیال نہیں کرتے صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

شاہ دولہ دریائی کئی ایک لحاظ سے منفرد ولی اللہ ہو گزرے ہیں۔ پہلی انفرادیت یہ ہے کہ وہ واحد بزرگ ہیں جن کے آستانے پر زندہ انسانوں کا چڑھاوا پیش کیا جاتا ہے۔ یہ فاتر العقل چڑھاوے شاہ دولہ کے چوہے کہلاتے ہیں۔ ان چڑھاوں کی حقیقت کا تفصیلی جائزہ بے حد ضروری ہے۔ ان کی دوسری انفرادیت رفاہ عامہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے۔ آپ نے لاتعداد عمارات تعمیر کروائیں۔ ان میں مساجد، تالاب، کنوئیں اور پل سرفہرست ہیں۔ پلوں کا بطور خاص شہرہ ہوا کیونکہ ان سے امیر غریب یکساں استفادہ کرتے ہیں۔

سامنے کی بات ہے کہ اگر کوئی صاحب کرامت بزرگ شوریدہ سر دریا کی لہروں پر چل کر دریا عبور کر لیتا ہے تو اس میں عوام کی خدمت کا کون سا پہلو سامنے آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک مخلص دریا پر پل تعمیر کروا کے خلق خدا کو دریا پار کرنے کی سہولت فراہم کر دیتا ہے تو اس مخلص شخص کی بے لوث خدمت کا اعتراف ضرور ہونا چاہئے۔ واضح رہے کہ جس دور سے اس داستان کا تعلق ہے اس میں ذرائع نقل و حمل کی کمی کے باعث ندیاں نالے اور دریا عبور کرنا بڑا دشوار ہوا کرتا تھا۔ گجرات شہر کے مشرقی دروازے کی جانب نالہ شاہ دولہ پر اور گوجرانوالہ کی ڈیک نامی نہر پر تعمیر کئے جانے والے پلوں کو کافی شہرت ملی۔ رفاہ عامہ کے کاموں میں حصہ لینے والے محنت کشوں کو محنتانے کی ادائیگی فوراً ہو جایا کرتی تھی۔ اس سلسلے میں شاہ دولہ دریائی کو یاد تھا کہ محنت کش کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری ادا کی جانی چاہئے اور یہ بات مستند ہے کہ مذکورہ تعمیرات کے لئے شاہ دولہ دریائی کسی سے مالی تعاون طلب نہیں کیا کرتے تھے تو کیا ان کے پاس خدائی خزانہ تھا؟ موصوف کو قدیم کھنڈرات کا سراغ لگانے کا ملکہ حاصل تھا لہٰذا اپنی تعمیرات کے لئے ضروری سامان ان جگہوں سے کھود نکالا کرتے تھے۔ گوجرانوالہ کی ڈیک ندی پر پل کی تعمیر سے ایک کہانی وابستہ ہے جس کا لب لباب پیش خدمت ہے۔

مغل شہنشاہ شاہجہان کی سوئے کشمیر آمدورفت کے دوران ایک بار شہزادہ دارا شکوہ اور حوری بیگم کا نجی سامان ڈیک ندی عبور کرتے ہوئے پانی میں بہہ گیا۔ ساز و سامان سے لدے ہوئے شاہی جانور باڑھ پہ آئی ندی کی نذر ہوئے تو شہنشاہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ضلع کے فوجدار بدیع عثمان کو حکم ملا کہ شاہی قافلے کی واپسی تک اس شوریدہ سر ندی پر پل تعمیر ہو جانا چاہئے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق سارے ضروری کام پس پشت ڈال کر فوجدار نے پختہ پل کی تیاری کا آغاز کر دیا

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

لیکن فوجدار کی ناقص حکمتِ عملی کی وجہ سے پکی اینٹیں دستیاب نہ ہوسکیں۔ فوجدار نے وہی کیا جو صاحبانِ اقتدار عموماً کیا کرتے ہیں۔ اس نے خشت سازوں کو مقید کر کے شاہی حکم عدولی کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی قافلے کی واپسی تک پل کا آغاز ہی نہ ہو سکا۔ فوجدار سے جواب طلبی ہوئی تو اس نے دوٹوک الفاظ میں اعتراف کر لیا کہ مذکورہ پل کی تعمیر اس کے بس کی بات نہیں لیکن اس اعتراف کے ساتھ فوجداری نے یہ بھی کہا کہ یہ کام صرف اور صرف حضرت شاہ دولہ ہی کر سکتے ہیں۔ یہ سنتے ہی حاکم وقت نے حکم دیا کہ شاہ دولہ کو حاضر کیا جائے۔ چنانچہ حکم شاہی کے غلام حضرت شاہ دولہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑی فراست سے انہیں پالکی میں بٹھا کر ڈیک ندی کی طرف چل دیئے۔ شاہ دولہ جانتے تھے کہ سرکاری پیادے شاہی حکم کے غلام ہیں لہٰذا انہوں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''اس پالکی وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں، ہم نے یہ کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے''۔

شاہ دولہ منزل مقصود پر پہنچے تو پہلا کام یہ کیا کہ خشت سازوں کی رہائی کا پروانہ حاصل کیا۔ خشت ساز آزاد ہوئے تو شاہ دولہ نے ان کی شکایات رفع فرمائیں۔ اس طرح مطلوبہ پکی اینٹوں کے پزاوے دھواں اگلنے لگے اور مشکل کام کا آغاز ہو گیا۔ اس کار گراں کی راہ میں بڑی رکاوٹ ایک بدفطرت جادوگر یا گورو تھا جو اپنی ماورائی طاقتوں کو بروئے کار لا کر کئے کرائے پر پانی پھیر دیتا۔ چنانچہ جس برق رفتاری سے دن کی روشنی میں کام کی تکمیل ہوتی شب کے اندھیرے میں اسی عجلت سے تکمیل شدہ کام برباد ہو جاتا۔ (بعض کتب میں گورو کی جگہ ''جن'' کا لفظ استعمال ہوا ہے) بہرحال جادوگر، جن یا گورو سے شاہ دولہ دریائی کا مناظرہ ہوا اور نیک طینت بزرگ نے بدفطرت ''جن'' پر قابو پا کر اسے چونے کے حوض میں گردن تک ڈبو دیا اور نئے عزم سے کام کا آغاز ہو گیا۔ اس دشواری کے علاوہ شاہ دولہ کو ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔

بوٹا نامی ایک زمیندار کو اس گھاٹ سے کافی آمدنی ہوا کرتی تھی اور ظاہر ہے پل کی تعمیر کے بعد یہ کمائی ختم ہو جاتی تھی لہٰذا پل کی تعمیر زمیندار کے مفاد میں نہیں تھی۔ شاہ دولہ اور دیگر کارکن مجوزہ پل سے کچھ فاصلے پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ بدطینت زمیندار نے وہ بند ہی کاٹ دیا جس کی اوٹ میں درویش اور ان کے ساتھی قیام پذیر تھے۔ اس حرکت کا مقصد یہ تھا کہ ندی کا پانی پل تعمیر کرانے والوں کو بہا کر لے جائے گا۔ اس طرح نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری لیکن شاہ دولہ دریائی اپنی فراست سے اس طوفان کا سدِباب کر چکے تھے۔ انہوں نے ڈیرہ ڈالتے ہی ایک حفاظتی بند بنوا لیا تھا۔ اس طرح جب سیلاب آیا تو مذکورہ ڈیرہ محفوظ رہا۔ سازش تو ناکام ہو گئی لیکن زمیندار کی یہ حرکت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ شاہجہان کو خبر ہوئی تو وہ جلال میں آ گیا۔ اس نے حکم دیا کہ بوٹے کو پابہ زنجیر شاہی دربار میں حاضر کیا جائے۔ اس حکم کے ساتھ زمیندار کی سزا کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ مجرم کا سر قلم کر کے نیم کے پیڑ سے لٹکایا جانا تھا۔ شاہ دولہ دریائی اس سزا کے حق میں نہیں تھے لہٰذا ان کی کاوشوں سے زمیندار کی جان بچ گئی۔ یہ موت کے منہ سے واپس آنے والی بات تھی لہٰذا مذکورہ زمیندار صدقِ دل سے تائب ہوا اور پل کی تعمیر میں ہر ممکن امداد فراہم کرنے لگا۔ اس طرح ڈیک ندی کا پل مکمل ہوا اور شاہ دولہ دریائی گجرات لوٹ آئے۔

صوفیاء کے ہاں سالکوں کے مختلف درجات، مقامات اور وظائف ہوتے ہیں۔ مثلاً قطب وہ ہستی ہے جس کے ذمے کسی بستی کا نظام ہوتا ہے۔ چکی کے پاٹ کے عین درمیان والی میخ کو بھی قطب کہتے ہیں جس کے گرد چکی کا پاٹ گھومتا ہے)۔

شاہ دولہ گجرات لوٹے تو سیدن نامی ایک فقیر بھی کہیں سے آ نکلا اور یہ نعرہ لگانے لگا کہ وہ شہر گجرات کا روحانی سربراہ قطب ہے۔ ایک بستی میں ایک سے زیادہ بزرگ صلح سلامتی سے رہ سکتے ہیں مگر سیدن فقیر کی منزل خدمتِ خلق کے بجائے آرام و آسائش کا حصول تھا۔ شاہ دولہ کو اس جھوٹے درویش کا پول کھولنا پڑا۔ سیدن فقیر کو جانے کیا دکھایا گیا کہ وہ خوفزدہ ہو کر منظر سے غائب ہو گیا اور پھر کبھی دکھائی ہی نہ دیا۔

ریاست جموں کے علاقے راجور میں دختر کشی کی رسم بدعروج پر تھی۔ نام نہاد غیرت مند لوگ بچی کے پیدا ہوتے ہی اسے ہلاک کر دیا کرتے تھے۔ راجور کا راجہ چتر سین حضرت شاہ دولہ کا عقیدت مند تھا جو حیران کن بات ہرگز نہ تھی۔ مسلک محبت کی وجہ سے شاہ دولہ کے عقیدت مندوں میں غیر مسلم افراد کی تعداد کم نہیں تھی۔ چتر سین کے ہاں ایک خوبصورت بچی پیدا ہوئی۔ راجہ نے اسے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو شاہ دولہ نے سختی سے منع کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ بچی تو 'مادرِ شاہ' بننے والی ہے۔ موت فی الحال اس کا مقدر نہیں''۔ اس طرح وہ بچی موت کے منہ سے بچ نکلی۔ شاہجہان کشمیر کے دورے پر آیا تو وہ بچی خوبصورت نوجوان دوشیزہ بن چکی تھی۔ چتر سین نے وہ بچی شہنشاہ کی نذر کر دی اور شاہجہان نے اس کا عقد شہزادہ اورنگزیب سے کر دیا اور بیگم بائی کے نام سے چتر سین کی بیٹی مغل خاندان میں شامل ہو گئی۔ بیگم بائی کے بطن سے شہزادہ معظم پیدا ہوا جس نے اورنگزیب کے بعد ہندوستان پر 1707ء سے 1212ء تک حکومت کی۔

بیگم بائی سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد شہزادہ اورنگزیب، شاہ دولہ دریائی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اصل میں وہ جاننا چاہتا تھا کہ شاہجہان کے بعد تخت دہلی پر کون رونق افروز ہوگا۔ حالات دارا شکوہ کے حق میں تھے۔ شہزادہ مراد بھی تخت کا دعویدار تھا۔ بہرحال اورنگزیب نے ایک خوبصورت بلی، ایک عدد مرغ زریں اور ایک عصا درویش کی خدمت میں پیش کیا۔ واضح رہے کہ شاہ دولہ دریائی جانوروں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ کلاہ پوش ہرن والا واقعہ پیش کیا جا چکا ہے۔ اورنگزیب کا خیال تھا کہ اگر درویش نے عصا واپس کر دیا تو یہ اس کی تخت نشینی کا اعلان ہوگا۔

شہزادہ اورنگزیب جب درویش کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو درویش نے نہ صرف اٹھ کر اس کا استقبال کیا بلکہ اسے جلالت مآب کا خطاب بھی دیا۔ شہزادے کی نذر قبول کرنے کے بعد درویش نے عصا واپس کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ ''خوش ہو جاؤ، یہ عصا تمہارے بااختیار ہونے کی سند ہے''۔

شہزادہ مطمئن ہو کر واپس آیا اور اس نے سارے واقعات اپنی بیوی بیگم بائی کے گوش گزار کئے۔ بیگم بائی نے جواباً اپنی پیدائش والا واقعہ بیان کیا کہ درویش نے اسے بادشاہ کی ماں بننے کی پیشینگوئی بہت پہلے کر دی تھی۔

تخت نشینی کے بعد اورنگزیب نے درویش سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا تو درویش نے اپنے انداز میں ملاقات کی۔ اس رات اورنگزیب کھانا تناول فرما رہا تھا کہ ایک ہاتھ شریک طعام ہو گیا۔ عمر رسیدہ شخص کے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی کٹی ہوئی تھی۔ شاہ دولہ کا عقیدت مند بخت آور نامی ایک شاہی ملازم بھی وہاں موجود تھا۔ اورنگزیب نے ہاتھ دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تو بخت آور نے بصد احترام کہا۔ ''حضور! یہ ہاتھ تو پیر و مرشد شاہ دولہ دریائی کا ہے''۔ اورنگزیب نے درویش کو ظاہر ہو جانے کی درخواست کی۔ شاہ دولہ نے ظاہر ہو کر شہنشاہ کو دعائے خاص سے نوازا۔

حضرت شاہ دولہ سے منسوب تخلیقی کرامت کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں جو آج تک کسی اور بزرگ سے منسوب نہ ہو سکی۔ یعنی کبھی کسی مزار پر آدم زاد کا چڑھاوا

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دیکھنے سننے میں نہیں آیا۔ شاہ دولہ کے بیشتر عقیدت مندوں کا یقین ہے کہ بے اولاد خواتین اگر صدق دل سے منت مانیں کہ موصوف کی دعا کے طفیل ان کی گود ہری ہو جائے تو ایسا ممکن ہے۔ تاہم گود ہری ہو جانے کے بعد ان کو اپنا پہلا بچہ آستانہ شاہ دولہ کی نذر کرنا ہو گا جس کا سر چھوٹا، کان لمبے اور شکل چوہے جیسی ہو گی۔ یہ بچے مکمل طور پر مخبوط الحواس ہوتے ہیں اور ان سے گداگری کا کام لیا جاتا ہے لیکن عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ کوئی بزرگ، مخبوط الحواس بچوں کی پیدائش کا ذمہ دار ہو سکتا ہے اور حضرت شاہ دولہ جیسا انسانیت نواز، جانوروں تک سے پیار کرنے والا شخص ایسی کرامت کا مالک کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو ایک لحاظ سے سُوئے ادب کے زمرے میں آتا ہے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ چھوٹے سر کے بچوں کو مزار پر چھوڑ جانے کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ تاہم اس کرامت کا ذکر کسی کرامت نامے میں نہیں ملتا۔ مغل شہنشاہ جہانگیر نے ''تزک جہانگیری'' میں برصغیر کی عجیب سے عجیب تر باتوں کا ذکر کیا ہے لیکن مذکورہ چوہوں کا ذکر کہیں نہیں۔ شاہجہان نامہ اور وقائع عالمگیری ایسی تاریخ کی بڑی کتابیں بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ کسی غیر ملکی سیاح نے بھی اس حیرت انگیز کرامت کا ذکر نہیں کیا حالانکہ غیر ملکی سیاح تو کرید کرید کر ''انہونی'' باتوں کو منظرِ عام پر لانے میں مشہور ہیں۔

اصل بات یہ ہو سکتی ہے کہ شاہ دولہ چونکہ انسانیت نواز تھے لہٰذا جن بچوں کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہوتا وہ انہیں اپنے سائے میں لے لیتے ہوں گے۔ لوگ تو ناقابلِ قبول بچوں کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر پھینکنے سے گریز نہیں کرتے اور یہاں تو محفوظ اور مقدس ایک ایسی جگہ تھی جہاں کوئی اس مسلوب الحواس بچوں کو سنبھالنے والا موجود تھا۔ ایک بار رسم پڑ گئی تو شاہ دولہ دریائی کے وصال کے بعد بھی یہ رسم جاری رہی۔ مرزا اعظم بیگ کی تحقیق کے مطابق 1857ء سے 1866ء کے دوران چودہ عدد چوہیاں اور چوہے حضرت شاہ دولہ کے مزار پر پہنچائے گئے۔

خورد سری یا مائیکرو سفالوجی (Microcephology) ایک مرض ہے جس پر عصرِ حاضر میں کافی تحقیق ہو چکی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں اس پر کافی حد تک قابو پایا جا چکا ہے تاہم اس کا قلع قمع نہیں ہو سکا۔ غیر زبانوں میں اس طبی اصطلاح کا ہونا ہی ہمارے لکھے کا ثبوت ہے کہ خورد سری برصغیر یا پاکستان کے شہر گجرات تک محدود نہیں، یہ بیماری سمندر پار بھی پائی جاتی ہے اور سمندر پار بسنے والی مائیں حضرت شاہ دولہ کی کرامت سے یقیناً واقف نہیں۔

تولید و توارث کے کروموسوم (Cromo Somes) (جسیمے) جوڑا جوڑا ہوتے ہیں لیکن اگر ان میں ایک تیسرا کروموسوم آ شامل ہو تو اس سے سہ زوجی (Trisomy) صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے جس سے انسان کا عصبی نظام متاثر ہو کر دماغی نقص کا باعث بن جاتا ہے۔ مذکورہ سہ زوجی کیفیت آ کر 21ویں جوڑے میں پیدا ہو تو اسے منگولزم کہتے ہیں۔ یہ بچے مکمل مسلوب الحواس نہیں ہوتے مگر ان کی آنکھیں نسبتاً چھوٹی اور بھنچی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس طرح پانچویں جوڑے کے کروموسوم کے کسی حصے کا نقصان پذیر ہو جانا بچے کی خورد سری کا باعث بن جاتا ہے۔

ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرایا گیا تو زندہ بچ جانے والی حاملہ عورتوں سے 25 فیصد خواتین نے خورد سر بچوں کو جنم دیا۔ علم الارحام (رحمِ مادر سے متعلق علم) کی بیشتر کتب تصدیق کرتی ہیں کہ خورد سری ایک مرض ہے جس کا سبب وائرس ہوتے ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق مرگی کے مرض میں مبتلا خاتون خورد سر بچے کو جنم دے سکتی ہے۔

خورد سر بچے کی نشوونما بھی عام صحت مند بچوں سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ انسانی کھوپڑی، فٹ بال کی طرح

ہوتی ہے جو چمڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی خاص ترتیب سے سلائی کر کے بنایا جاتا ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے سر کی ہڈیاں الگ الگ ہوتی ہیں اب اگر بوجوہ دماغ کی افزائش رک جائے یا وہ ہڈیاں وقت سے پہلے جڑ کر دماغ کی نشوونما روک دیں تو نہ صرف یہ کہ بچے کا سر چھوٹا رہ جاتا ہے بلکہ وہ ہمیشہ کے لئے دماغی صلاحیتوں سے محروم بھی ہو جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں احتیاطی تدابیر کے ذریعے اس بیماری پر کافی حد تک قابو پایا جا چکا ہے۔ یرقان میں مبتلا ہو جانے والے بچے اس مرض کا شکار ہو سکتے ہیں۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ بچوں کا یرقان اب پاکستان میں بھی لاعلاج نہیں رہا لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خورد سری پر ہم نے بھی کافی حد تک قابو پا لیا ہے۔ شاہ دولہ دریائی نے بڑی طویل عمر پائی جو عام طور پر 150 برس بتائی جاتی ہے۔ آپ مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگزیب عالمگیر کے ہم عصر تھے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آپ کی پیدائش اکبر اعظم کے 25ویں سال جلوس 1581ء میں ہوئی اور وصال 1087ھ بمطابق 1676ء کو ہوا تو آپ کی عمر مبارک پچانوے سال بنتی ہے۔ ''خدا دوست'' کے تاریخی اعداد کی رُو سے آپ کا وصال 1676ء ہی میں ہوا۔ میاں محمد بخش مثنوی ''سفر العشق'' میں فرماتے ہیں۔

مگر شکاری کرے تیاری، باغ چہ چڑیاں ہرناں

جو چڑھیا اوس ڈھنا اوڑک جو جمیاں اس مرنا

موت ایسی حقیقت ہے جس سے مفر نہیں شاہ دولہ دریائی کو اپنے سفرِ آخرت کے آثار دکھائی دیئے تو آپ نے اپنے مرید خاص بھاون شاہ کو طلب فرمایا اور بارِ امانت اسے سونپ کر اپنا جانشین مقرر کیا۔ آپ کا مزار بھاون شاہ صاحب نے تعمیر کرایا 1867ء میں مزار کی کرسی بلند کر کے تعمیرِ نو کی تکمیل ہوئی۔ مزار کی موجودہ تعمیر قاضی سلطان محمود کی عقیدت کا نتیجہ ہے۔ شاہ دولہ دریائی کا عرس ہر سال 19 اور 20 جون کو منایا جاتا ہے۔ مزار کے صدر دروازے پر لکھے ہوئے درج ذیل شعر سے موصوف کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

توحید آں عارف حق گزیدہ

بگو شاہ دولہ بجنت رسیدہ

عصرِ حاضر میں مزار شریف محکمہ اوقاف کے پاس ہے تاہم گدی نشین سید اعجاز حسین شاہ صاحب ہیں جو اپنے بزرگوں کی روایات زندہ رکھنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔

ماخذ

1- منزل نہ کر قبول (سفرنامہ پنجاب) محمد داؤد طاہر
2- شاہ دولہ دریائی، حیات و تعلیمات- شریف کنجاہی
3- گجرات، عہد بعہد- کیپٹن اے سی ایلیٹ / ترجمہ مفتی محمد ریاض
4- ضلع گجرات، تاریخ و ثقافت تے ادب- ڈاکٹر احمد حسین احمد قریشی قلعہ داری
5- دیس پنجاب- اکبر ملک
6- مکمل تاریخ کشمیر- محمد الدین فوق
7- تحقیقات چشتی- نور احمد چشتی
8- معلومات عامہ- ڈوگر اینڈ سنز لاہور
9- شاہ دولہ دریائی گنج بخش- ایس ایم نسیم چودھری

O*O

انتقال

''حکایت'' کے دیرینہ قاری محترم **ماسٹر سعید احمد عباسی چھپالی ضلع بلغ**، قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔

(شجاع احمد عباسی)

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

غزل

دستگیر شہزاد

اندھے بل ہیں سانپ کی ہے ذات کالی
غار میں بیٹھو دیکھا کرو برسات کالی

دھوپ رگوں میں پارہ دریا ٹھاٹھیں مارے
آئی شام کی بہتی ہوئی سوغات کالی

سورج چاند نے رو رو کھوئے اپنے چہرے
گھور اندھیرا گہری شام رات کالی

اُس کی قسمت ہاتھی دانت کے سارے مہرے
میرے نصیب میں کالے شہ اور مات کالی

اُڑ جا آج ہے زد پر تُو اے خواب پرندے
تیرہ شبی ہے اور لگتی ہے گھات کالی

قطرہ قطرہ زہر بیاباں جگ مگ جگنو
جنگل جنگل بادل اور برسات کالی

میرا خواب تھا چاند کا شہر گہن میں آیا
بوجھل رات تھی نکلی تھی بارات کالی

اپنی خلقت نے غافل اصطبل کا باسی
شیر کے جبڑے توڑ دے اس کی لاش کالی

ایک تاثر ایک کہانی

ایک بے زبان گھوڑی اور ایک معصوم بچی کی محبت کا عجیب قصہ جس کا انجام المناک ٹھہرا۔

وقار احمد ملک

دینو کو جوان ریلوے اسٹیشن کے باہر ایک بوڑھے بوڑھ کے درخت کے ساتھ تانگے کو باندھ کر چوک میں گھوم پھر کر سواریاں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے۔ صبح سے سواریوں کا انتظار کرتے کرتے سہ پہر ہو چلی ہے۔ شاید شدید گرمی نے لوگوں کو سفر کرنے اور گھر سے نکلنے سے روک رکھا ہے۔ چوک خلاف معمول ویران ہے۔ سامنے شربت اور لسی کی دوکان میں دو تین افراد کوئی گھنٹہ بھر سے باہر کی لو سے بچنے کے لئے پنکھے کے نیچے بیٹھے ہیں۔ دوکاندار اس انتظار میں ہے کہ وہ کب باہر نکلیں اور وہ پنکھا بند کر کے بجلی کی بچت کر سکے۔ دینو کی نگاہیں بھی ان لوگوں پر لگی ہوئی ہیں کہ شاید ان کو بس اڈے یا شہر کے کسی علاقے میں جانا ہو۔ وہ اس دوکان میں نہ ہوتے تو شاید دینو کب کا تانگے کی پچھلی نشست پر سو چکا ہوتا۔ دینو کی آنکھیں گرمی کی شدت کے باوجود نیند

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے بوجھل ہیں۔ دوراتوں سے وہ جی بھر کر سو نہیں سکا۔

دو دن قبل دینو کے ہاں پہلے بیٹے کی پیدائش ہوئی ہے۔ زچہ بچہ کے اخراجات پورے کرنے کے لئے وہ اب ڈبل شفٹ یعنی دن رات کام کر رہا ہے۔ حالانکہ اس کا بوڑھا گھوڑا اس مشقت کو برداشت نہیں کر پا رہا۔ کبھی کبھار وہ اپنے گھر چکر لگا کر نومولود کالے بلونگڑے سے بچے کو دیکھ آتا ہے۔ دو بیٹیوں کی پیدائش سے اسے جو ذہنی صدمہ ہوا تھا اس کی اب کافی حد تک تلافی ہو چکی ہے۔ وہ جب حسرت بھری نگاہوں سے بلونگڑے کو دیکھتا ہے تو اس کی بیوی کو عجیب قسم کی طمانیت محسوس ہوتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ دو بیٹیوں کی پیدائش سے وہ کتنا پریشان تھا۔ اس کی اس پریشانی کو اضطراب کی شکل اس وقت ملی جب اس نے اپنے اڈے کے ساتھی کوچوانوں سے طرح طرح کی باتیں سنیں۔ دوسری بیٹی کی پیدائش کے بعد تو وہ دو دن تک شرم کے مارے اڈے پر بھی نہ جا سکا تھا۔

اس کو یاد تھا کہ وہ ان دنوں جمعہ کی نماز پڑھنے گیا تو مولوی صاحب نے تقریر کے دوران بیٹیوں کی برکت کے بارے تقریر کی اور ان کو والدین کے لئے رحمت قرار دیا تو تھوڑی دیر کے لئے دینو کا احساسِ ندامت ختم ہو گیا۔ مولوی صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ بیٹیاں اپنا رزق لے کر آتی ہیں اور الٹا والدین کے رزق میں برکت کا باعث بنتی ہیں۔ انہی دنوں دینو نے نئی گھوڑی لی تھی۔ گھوڑی پستہ قد لیکن مستعد گھوڑوں کی نسل سے تھی۔ گھوڑی کے گھر آنے سے اس کا کاروبار چمک اٹھا۔ گھوڑی کو وہ پیار سے گلابو کہتا تھا۔ گلابو کے آنے سے گھر کے حالات بدلنا شروع ہو گئے۔ گلابو کو اگر دن رات بھی تانگے میں جوتا جاتا تو بھی اس کی طبیعت پر گراں نہ گزرتا۔ دینو تھک جاتا تھا باگیں ہلا ہلا کر لیکن گلابو دوڑتے دوڑتے نہ تھکتی۔ گلابو پر پورا گھر ناز کرتا تھا۔ فاطمہ جو دینو کی بڑی بیٹی تھی کی تو گلابو سے گہری محبت ہو گئی تھی۔ بابا جب شام کو کام سے واپس آتا تو آمنہ اور فاطمہ کو تانگے پر قریبی گلیوں کا چکر ضرور لگواتا۔ فاطمہ گلابو کی ایک ایک حرکت کا بغور جائزہ لیتی۔ گلابو دُم ہلاتی تو فاطمہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔ وہ ہنہناتی تو یہ کھلکھلانے لگتی۔ وہ سرپٹ بھاگتی تو فاطمہ کے جسم میں بھی تھرتھلی مچ جاتی۔ فاطمہ کی دلچسپیوں کا محور گلابو ہی تھی۔ جب دینو گھر آتا اور گلابو کو پیپل کے درخت کے نیچے باندھ دیتا تو فاطمہ گھر بار سے بے نیاز گھوڑی کی خدمت میں لگ جاتی۔ نلکے سے بالٹی بھر کر اس کو نہلواتی پیپل کے نیچے اس کے آنے سے پہلے جھاڑو دیتی، اس کے آگے گھاس ڈالتی اور بالٹی میں صاف پانی ڈال کر اس کو پلاتی۔ گھوڑی بھی فاطمہ کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتی اور اپنی محبت کا اظہار اپنے بھورے بھورے کان ہلا کر کرتی۔ جب دیر تک گلابو کے کان لہراتے رہتے تو فاطمہ کے ساتھ ساتھ تمام گھر والے اس منظر سے محظوظ ہوتے۔

ایک مرتبہ سردیوں میں فاطمہ بیمار پڑ گئی اور گلابو کی طرف نہ جا سکی۔ گلابو نے بار بار ہنہنا کر اپنی دوست کی غیر موجودگی کا اظہار کیا۔ جب کافی دیر تک فاطمہ پیپل کے درخت کے نیچے نہ آئی تو وہ بے زبان بھی مایوس ہو کر بیٹھ گئی۔ اس دن آمنہ پانی لے کر آئی اور گلابو کو پلانے کی کوشش کی۔ گلابو نے ایک نظر اٹھا کر دیکھا جیسے پانی پلانے والی کو پہچان رہی ہو۔ پہچاننے میں دیر نہ لگی کیونکہ گلابو نے پانی پینے سے صاف انکار کر دیا۔ آمنہ نے بہت کوشش کی، چمکارا، سہلایا، تھپتھپایا لیکن پانی پلانے میں ناکام رہی۔ معاملات اس وقت سنجیدہ ہو گئے جب دینو گھاس ڈالنے آیا تو گھوڑی نے گھاس کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ دینو کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ گھر میں موجود جانوروں کے لئے مخصوص دو کیپسول اس نے گھوڑی کے منہ میں زبردستی ڈال دیئے لیکن افاقہ نہ ہوا۔ دینو پریشان ہو گیا۔ اس کی پریشانی کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کا گزر بسر کسی جانور کے بل بوتے پر ہو اور وہ جانور بیمار پڑ جائے۔ فاطمہ اپنے کمرے میں بخار سے نڈھال پڑی تھی۔

جب اس کی طبیعت قدرے بحال ہوئی تو اس نے اپنے کمرے میں امی اور ابو کی گفتگو کو سننا شروع کیا۔ موضوعِ گفتگو کوئی اور نہیں بلکہ اس کی عزیز ترین دوست گلابو تھی۔ گلابو کا نام سن کر بیمار چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ امی ابو گلابو کی بیماری اور اس کے کھانے پینے سے انکار کی باتیں کر رہے تھے۔ فاطمہ کو صورتِ حال سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ اس نے اچانک بھاری بستر کو اتارا اور جست لگا کر چارپائی سے نیچے اتری۔ دینو اور اس کی بیوی کو سمجھ نہ آئی کہ فاطمہ کو اچانک کیا ہو گیا ہے۔ فاطمہ والدین کو نظر انداز کرتے ہوئے باہر بھاگی۔ پل بھر میں وہ گلابو کی کچی کوٹھڑی میں تھی۔ یہ کوٹھری کبھی ایک باڑہ تھی جب دینو نے بہت ساری بکریاں پالی ہوئی تھیں۔ شام کے وقت موسم سرما کے باوجود اس ویران کوٹھڑی میں پُرلطف بادِ نسیم چلنا شروع ہو گئی جس سے دو بے چین بیمار روحوں کو قرار آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں گلابو پانی بھی پی رہی تھی اور گھاس بھی کھا رہی تھی۔ دینو اپنی بیوی کے ہمراہ اس جادوگری کو سراسیمگی کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ اس اَن پڑھ کوچوان کو کیا پتہ کہ محبت میں کیا کیا کرامات پنہاں ہوتی ہیں۔

گلابو کی مشقت اور بیٹیوں کی برکت سے دینو کا کچا گھر چند سالوں میں پختہ ہو گیا۔ دینو کا تانگہ تیز رفتاری کی علامت تھا۔ سواریاں اس کو دوسرے تانگوں پر ترجیح دیتی تھیں۔ دوسرے کوچوان دینو کی گھوڑی کی وجہ سے دینو سے رشک اور حسد کرنے لگے تھے۔ دینو بھی گلابو کو خوب لاڈ کراتا۔ اس کی دھوپ چھاؤں کا خیال رکھتا۔ اس کو پیاسا اور بھوکا نہ رہنے دیتا۔ دینو نے اب اس کی خوراک میں چنوں کی خاصی مقدار بڑھا دی تھی۔ جس سے گلابو کی صحت اور استعداد میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ گلابو کی کھرلی ہمیشہ دانوں یا گھاس سے بھری رہتی۔ گلابو کی کھرلی بھی فاطمہ کے لئے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ روزانہ اس کو پائپ لگا کر دھوتی۔ دن کو پیپل کے درخت کے نیچے اور رات کو باڑے میں لے جاتی۔ بابا نے جب کھرلی کے نیچے پہیے لگائے تو فاطمہ کا کام آسان ہو گیا۔

اس مرتبہ عید آئی تو دینو سارے خاندان کو تانگے میں بٹھا کر بازار لے گیا۔ پہلی مرتبہ دینو نے بیوی اور بیٹیوں کو جوتے، کپڑے اور چوڑیوں کے ساتھ مٹھائیاں وغیرہ لے کر دیں۔ دینو کی بیوی اس پُرمسرت موقع پر بہت خوش تھی۔ لیکن فاطمہ کچھ سنجیدہ اور قدرے خاموش تھی۔ ماں نے اس بات کو محسوس تو کیا لیکن اس کا تذکرہ نہ کیا کہ شاید میرا وہم ہو۔ شام کو سواریوں سے بھرا تانگہ واپس گھر آ گیا۔ فاطمہ بدستور چپ چپ تھی۔ اس نے عید کا سامان خاموشی سے اپنے چھوٹے سے ٹرنک میں رکھا اور لیٹ گئی۔ کچھ دیر کے بعد اچانک اٹھی اور بھاگ کر کمرے میں جا کر اپنا ٹرنک کھول لیا۔ اس نے اپنا سرخ دوپٹہ نکالا اور بھاگ کر گلابو کی کوٹھڑی میں داخل ہوئی اور دوپٹہ اس کے گلے میں ڈال دیا۔ گلابو اگلے دونوں پاؤں زور زور سے زمین پر پٹخ کر اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگی۔ فاطمہ کا مرجھایا ہوا چہرہ اچانک کھل اٹھا۔

فاطمہ کا کمرہ گلابو کی کوٹھڑی کے ساتھ ہی تھا۔ فاطمہ کی فرمائش پر اس کے کمرے میں ایک چھوٹا سا سوراخ بنا دیا گیا تھا جو فاطمہ اور گلابو کے درمیان رابطے کا ایک ذریعہ بن گیا تھا۔ فاطمہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کا دیدار کرتی رہتی۔ جب تک گلابو جاگتی رہتی فاطمہ کو بھی نیند نہ آتی۔ گلابو سو جاتی تو فاطمہ کا کمرہ بھی سو جاتا۔

عید آئی تو ہر فرد پُرمسرت دکھائی دے رہا تھا۔ فاطمہ اور آمنہ نے رنگین لباس زیبِ تن کئے، پاؤڈر اور لپ سٹک سے اپنے معصوم حسن میں نمایاں اضافہ کیا۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

نیلے پیلے ننھے منے دوپٹے دونوں کے سروں پر خوب جچ رہے تھے۔ آمنہ کی پونیوں میں مقید زلفیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ فاطمہ نے پونیاں خود نہ پہنیں بلکہ گلابو کی گردن کے بالوں میں اڑس دیں۔ لمبے لمبے بھورے اور کالے بالوں میں رنگین پونیوں نے گلابو کو بارات والی گھوڑی بنا دیا تھا۔ گھوڑی بھی پوری طرح عید کی خوشیوں میں شامل ہو چکی تھی۔ عید کی شام پورا خاندان تانگے پر شہر کے واحد پارک میں گیا۔ گھر سے پارک کافی دور تھا۔ فاطمہ حسب معمول فرنٹ سیٹ پر براجمان تھی۔ اس کی نگاہوں کا مرکز عید کی خوشیوں اور رنگینیوں میں نہائے ہوئے شہر کی بجائے اس کی محبوب گھوڑی تھی۔ وہ گلابو کے تھرکتے ہوئے اعضاء، بڑے بڑے کان، گردن میں موجود دوپٹہ اور پونیوں کو مسرت انگیز انداز میں تکے جا رہی تھی۔ دینو کو جوان اپنی بیٹی کے جذبات کو نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ آخر اس کو ایک بے زبان جانور سے کیوں عشق ہو گیا ہے۔ کیا اس دنیا میں محبت کے قابل اور کچھ نہیں بچا؟

عید کو گزرے چند ہی دن ہوئے تھے۔ دینو حسب معمول اپنا تانگہ سواریوں سے لادے ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔ شہر کے بڑے چوراہے کو تانگے نے ابھی عبور کیا ہی تھا کہ اچانک گھوڑی کا پاؤں کیلے کے چھلکے سے پھسلا اور وہ انتہائی زوردار انداز میں دھڑام سے کالی سڑک پر گر گئی۔ تانگے کے دونوں بمب ٹوٹ گئے۔ سواریاں محفوظ رہیں لیکن گلابو شدید زخمی ہو گئی۔ اس کی دائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بڑی مشکل سے دینو تانگے اور گھوڑی کو گھر تک لایا۔ کماؤ جانور کا علاج شروع ہو گیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ تھوڑی بہت جمع پونجی چند دنوں میں ہی ختم ہو گئی۔ خرچ جاری تھا لیکن آمدن رک چکی تھی۔ حالات دن بدن سنجیدہ ہوتے گئے۔ دینو نے پیٹ کاٹ کر دو ہفتوں تک گلابو کا علاج کرایا لیکن جانوروں کے ڈاکٹروں کے مطابق اسے کم از کم چار ماہ مکمل علاج اور آرام کی ضرورت تھی۔ جب انسانوں کا رزق تنگ ہو جائے تو جانوروں کو کون پوچھتا ہے۔ دینو نے اب گلابو پر توجہ دینا کم کر دی۔ دوسرے معنوں میں اب وہ گھوڑی کی ٹانگ جڑنے سے ناامید ہو چکا تھا۔ گلابو کا نہ صرف علاج بند ہوا بلکہ اس کا کھانا پینا بھی کم کر دیا گیا۔ سب سے پہلے اس کی خوراک کا لازمی جزو چنے بند کر دیئے گئے۔ پھر آہستہ آہستہ گھاس بھی کم ہوتا گیا۔ ایک ہڈی تو ٹوٹ چکی تھی اب دوسری ہڈیاں بھی نظر آنا شروع ہو چکی تھیں۔

حادثے والے دن جب گلابو کو گھر لایا گیا تو فاطمہ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ بار بار گلابو کی زخمی ٹانگ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سب سے چھپ کر ایک مرتبہ تو ہڈی کو ٹٹولا بھی تھا اور ٹوٹی ہوئی جگہ کو اپنی نازک انگلیوں سے محسوس کیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ٹوٹی ہوئی جگہ کو یک جا کرنے کی بھی کوشش کی لیکن ناکام رہی تھی۔ گلابو کی نم آنکھیں اس کی بے بسی کو ظاہر کر رہی تھیں۔ وہ جانور جو چوبیس گھنٹے خوشی خوشی کام کرنے پر تیار تھا اب بے بس ہو کر ایک قدم بھی نہ چل سکتا تھا۔ ہر صبح جب سات بجے اس کے جوتنے کا وقت ہوتا تو وہ مقدور بھر کوشش کر کے اٹھنے کی کوشش کرتی لیکن جب ناکام ہو جاتی تو اپنی ناکامی پر غصے کا اظہار زور زور سے ہنہنا کر کرتی۔ اس کا بس چلتا تو ہوائی جہاز بن ہواؤں میں اڑنے لگتی لیکن افسوس کہ کیلے کے ایک چھوٹے سے چھلکے نے اس کی پرواز اس سے چھین لی تھی۔

آخر وہ وقت آ گیا جس کا ڈر تھا۔ اس دن دینو گلابو کے کھانے کو کچھ نہ لایا۔ چنے تو کب کے بند ہو چکے تھے آج گھاس بھی ختم ہو گئی۔ گلابو جو پورا دن کبھی اپنی کوٹھڑی میں اور کبھی پیپل کے درخت کے نیچے فضول بندھی رہتی پورا دن یا تو فاطمہ کے ساتھ وقت گزاری کرتی یا پھر گھاس کا انتظار کرتی رہتی۔ شام تک وہ بھوک سے نڈھال ہو جاتی اور گھاس دیکھ کر روزہ دار کی افطاری کی طرح بے چین ہو کر گھاس کھانا شروع کر دیتی لیکن آج اسے کیلے سے پھسلنے کی سزا فاقے کی شکل میں مل رہی تھی۔ فاطمہ آج خاموش تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ایک طرف گھر کے حالات ناگفتہ بہ تھے تو دوسری طرف اس بے زبان سے اس کے خاندان کا غیر انسانی سلوک۔ فاطمہ نے پیپل کے چند پتے گھوڑی کے آگے ڈالے جس کو اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ مایوس ہو کر وہ اپنے بستر میں آن گری۔ نہ جانے کون سا وقت تھا جب اس کی روتے روتے آنکھ لگ گئی۔

آدھی رات کے وقت جب سارا شہر خاموش ہو چکا تھا اور سردی اپنے زوروں پر تھی اچانک گھوڑی نے اپنے پاؤں زمین پر پٹخنا شروع کر دیئے۔ اس نے عجیب انداز میں چیخنا بھی شروع کر دیا۔ دینو نے اس کی کوٹھڑی میں جا کر رسی پکڑی اور گلابو کو گھر سے باہر گلی میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ لنگڑی گلابو بے گھر ہو چکی تھی۔ دینو نے دروازہ بند کیا اور بستر میں گھس کر سو گیا۔ دو گھنٹے تک گلابو اپنے ٹاپوں سے دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ پھر آواز تھم گئی۔ ادھر فاطمہ حسین خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ گلابو کی ٹانگ ٹھیک ہو گئی ہے اور وہ اپنے بابا کے ساتھ تانگے پر بیٹھے کسی ”لانگ ڈرائیو“ پر جا رہے ہیں۔ گھوڑی کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز ہے۔ سڑک پر اس کے آہنی کھر چنگاریاں پیدا کر رہے ہیں۔ اس کی دُم یوں متحرک ہے جیسے اس کے ساتھ بجلی کے تار لگا کر اس کو برقا دیا گیا ہو۔ فاطمہ کے ہنسنے کی آواز نے ساتھ چارپائی پر سوئی ہوئی آمنہ کو جگا دیا۔ وہ حیران تھی کہ جانے اس کی بہنا کن سہانے سپنوں میں کھوئی ہوئی ہے۔

صبح جب فاطمہ کی آنکھ کھلی تو اس کو یہ سوچ کر بہت افسوس ہوا کہ گلابو کی صحت یابی محض ایک خواب تھا۔ وہ بھاگی بھاگی باڑے میں پہنچی لیکن باڑہ خالی تھا۔ وہ پیپل کے نیچے پہنچی وہاں بھی گھوڑی نظر نہ آئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کو رات والی سب کہانی کا پتہ چل گیا۔ گلابو کی طرح فاطمہ بھی بے بس تھی اور سوائے چپکے چپکے روتے کے کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ فاطمہ بغیر کچھ کھائے پیئے چپکے سے آمنہ کے ساتھ سکول روانہ ہو گئی۔ اس کی مٹھی میں دس روپے کا ایک نوٹ تھا جو اس کی ماں نے زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ چند ٹیڑھی میڑھی گلیاں مڑنے کے بعد ایک بڑا سا میدان عبور کر کے وہ سکول کی طرف رواں دواں تھیں کہ اچانک بوڑھے بوڑھ کے درخت کے نیچے ان کو گلابو سوئی ہوئی نظر آئی۔ فاطمہ کے قدم چلتے چلتے رک گئے۔ آمنہ بھی تھوڑی دیر کے لئے رکی لیکن سکول سے لیٹ ہونے کے خطرے کے باعث وہ آگے چل پڑی۔ فاطمہ کا جسم کانپنے لگ گیا اور سر میں چکراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ بستہ نیچے رکھ کر ایک اینٹ کے اوپر تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئی اور گلابو کو دیکھتی رہی۔

گلابو سکون کی نیند سو رہی تھی۔ اس کی گردن میں رنگین پونیاں پھیکی پڑ چکی تھیں۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا خم واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ گلابو کے کمزور جسم کی ہڈیاں باہر کو نکل آئی تھیں۔ فاطمہ دیر تک ہاتھوں کے پیالے میں سر رکھے چکراتی ہوئی ہوئی نگاہوں سے تمام منظر دیکھتی رہی۔ چشم تصور میں اس نے تھوڑی دیر کے لئے ماضی کی طرح فراٹے بھرتے ہوئے تانگے کی سواری کی بھی

آئین قدرت

قدرت کا یہ مسلمہ آئین ہے کہ جو لوگ قدرت کے آئین کے مطابق اپنی زندگی بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیتے ہیں، قدرت اُن کے نام کبھی ضائع نہیں ہونے دیتی۔

عبدالرشید نوری۔ ہیڈ راجکاں

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کوشش کی لیکن گھوڑی کی موجودہ حالت کو دیکھ کر وہ دیر تک سیر کا مزہ نہ لے سکی۔ اچانک کسی خیال کے ذہن میں ابھرنے پر فاطمہ میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے بستے میں سے دس روپے نکالے، بستے کو اینٹ پر رکھا اور سامنے گلی کی طرف بھاگ پڑی۔ میدان خالی تھا۔ تھوڑی دور گندے جوہڑ میں جہاں محلے بھر کا غلیظ پانی اکٹھا ہوتا تھا چند بطخیں تیر رہی تھیں۔ دور ایک کچے مکان کے باہر ایک بوڑھا بوسیدہ سی چارپائی پر گرم دھوپ کے مزے لے رہا تھا۔ اس کے پاس ایک خارش زدہ کتا زمین پر لیٹا پڑا تھا۔ چند ہی منٹوں میں فاطمہ جواں گلابو کی طرح دوڑتی ہوئی گلی سے نمودار ہوئی۔ اس کے سر پر تازہ گھاس کا ایک گٹھا تھا۔ گلابو کے قریب آ کر اس نے دھپ کی آواز کے ساتھ گھاس اس کے سامنے گرا دیا۔ گھاس کے گرنے کی جانی پہچانی آواز کو سنتے ہی گلابو کی آنکھیں کھل گئیں۔ خوشبودار تازہ گھاس کو غیر متوقع طور پر سامنے پا کر وہ اس پر پل پڑی۔ چند منٹوں میں ہی اس نے گھاس کا صفایا کر دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ آنکھوں میں نمکین پانی ابھرا اور جدائی عمل میں آ گئی۔

جب فاطمہ سکول میں پہنچی تو دوسرا پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔ اچھا ہوا کہ آج پہلے پیریڈ والی ٹیچر چھٹی پر تھی جس سے فاطمہ کا دیر سے آنے کا کسی نے نوٹس نہ لیا۔ البتہ آمنہ کو سب پتہ تھا۔ اور وہ جان بوجھ کر خاموش رہی۔ بہنیں تو ویسے بھی بہنوں کے راز چھپانے میں شہرت رکھتی ہیں۔

دینو کا ایک بوڑھا چچا رحیم داد ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا۔ رحیم داد بھی کوچوان تھا۔ اس نے تمام عمر تجرد گزار دی تھی۔ چیت کے مہینے میں اسی برس کی عمر میں رحیم داد فوت ہو گیا۔ وہ گھر کا اکیلا فرد تھا جس کا واحد رشتہ دار دینو ہی تھا۔ اس کے گھر میں اور تو کوئی قابلِ ذکر چیز ورثہ میں دینو کو نہ ملی لیکن ایک ادھیڑ عمر گھوڑے کا مل جانا ہی دینو کے لئے غنیمت تھا۔ دینو کا تانگہ دوبارہ چل پڑا۔ اگرچہ یہ نیا گھوڑا کسی طرح بھی گلابو کے ہم پلہ نہیں تھا۔ یہ ایک گھنٹہ چلتا تو دو گھنٹے آرام کرتا۔ پھر بھی اس کی موجودگی فاقہ زدہ گھرانے کے لئے ایک غنیمت تھی۔ چند ماہ بعد مالک نے اس کو چاند سے بیٹے سے نوازا تو دینو اور اس کی بیوی کی خوشیوں کی کوئی حد نہ رہی۔ تھوڑی آمدن کے باوجود وہ مختصر سا گھرانہ صبر شکر کے ساتھ ایک پُر مسرت زندگی گزار رہا تھا۔ نومولود سب کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔ لیکن اب تانگے گھوڑے سے دلچسپی کسی کو نہیں رہی تھی۔ خاص کر فاطمہ کو تو اب پرانے تانگے اور اس نئے بڈھے گھوڑے سے نفرت سی محسوس ہوتی تھی۔

شدید گرمیوں کے دن ختم ہوئے تو کمروں کی ٹھنڈک از سرِ نو بڑھنا شروع ہو گئی۔ ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔ راتوں کو سرد جھکڑ چلا کرتے۔ دینو کے گھر میں موجود پیپل کے درخت کے پتے کبھی سرگوشیاں کرتے ہوئے معلوم ہوتے تو کبھی پیڑ سے ٹوٹ کر صحن میں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑا کرتے۔ تیز ہوا فاطمہ اور آمنہ کے کمرے کے کواڑوں پر پوری رات دستک دیتی رہتی۔ پرانے دروازوں میں موجود درزوں اور سوراخوں کو دینو نے سریش اور لکڑی کے ٹکڑوں سے بھر دیا تھا تاکہ سرد ہوا کی سوئیوں جیسی چبھن سے اس کا خاندان بچا رہے۔ اسے خاص طور پر ننھے نصیرالدین کی فکر تھی جس کی عمر چند ماہ ہی تھی۔ نصیر ہی دینو کی امیدوں کا محور اور خوشیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ کمروں میں دیر گئے تک کوئلے دہکتے رہتے۔ جب ان کی حرارت ختم ہو جاتی تو دینو احتیاط سے ان کوئلوں کی انگیٹھیوں کو کمروں سے باہر رکھ دیتا تاکہ ان کی مضر گیس سے سب محفوظ رہیں۔

فاطمہ کی ملاقات کبھی کبھی گلابو سے گلیوں یا سکول والے میدان میں ہو جاتی تھی۔ فاطمہ اس کو دیکھ کر فوراً

وہاں سے کھسکنے کی کوشش کرتی۔ وہ اس جانور سے آنکھ نہ ملا پاتی۔ گلابو کا گزر بسر اب گلیوں اور میدانوں میں پڑے کوڑا کرکٹ پر تھا جس سے اس کی گرتی ہوئی صحت اور تیزی سے بگڑنا شروع ہو گئی تھی۔ گلابو اب ہڈیوں کا پنجر بن چکی تھی اور اس کی ٹانگ کا خم اور زیادہ ہو گیا تھا۔ ایک دن فاطمہ نے گھر میں پڑی مولیوں کے چھلکے اور کچھ دوسری باسی سبزی لفافے میں ڈالی اور میدان میں سوئی گلابو کے سامنے پھینک دی۔ گلابو جو بھوک سے نڈھال پڑی تھی اس پر پل پڑی۔ کئی دنوں کی بھوک وہ چند ساعتوں میں مٹانا چاہتی تھی۔ ابھی اس نے دو نوالے ہی لئے تھے جب قریب کرکٹ کھیلتے ہوئے بچوں کی ایک گیند اچھلتی ہوئی آئی اور سیدھی گلابو کی آنکھ پر لگی۔ بیٹنگ سائیڈ کے کھلاڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ گلابو کی وجہ سے ان کا چوکا رک گیا۔ دو کھلاڑی بلے لے کر مشتعل انداز میں آئے اور اندھا دھند گلابو کی بوڑھی ہڈیوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ گلابو کی دائیں آنکھ جہاں گیند لگی تھی، میں سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن لڑکوں کا غصہ اس کی تکلیف سے زیادہ تھا۔ دو اور لڑکے بھی پہنچ گئے جنھوں نے بڑے بڑے ڈنڈے اٹھا رکھے تھے۔ ہڈیوں پر بلوں اور ڈنڈوں کی ضربوں سے عجیب آوازیں آ رہی تھیں۔ چہرہ، گردن، سر، پشت، گردن، ٹانگیں غرض ہر عضو حملے کی زد میں تھا۔ تڑاخ تڑاخ کی آواز سے ہڈیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ لڑکوں نے جب جی کی بھڑاس نکال لی اور گالیاں بکتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئے تو گلابو نیم بے ہوش ہو کر زمین پر گر چکی تھی۔ آنکھ سے نکلنے والا خون زمین پر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی بھی بڑے بڑے قطرے آہستہ آہستہ دائیں آنکھ سے ٹپک رہے تھے۔ پورا جسم ساکن تھا۔ فاطمہ کی لائی ہوئی باسی سبزی جو تھوڑی دیر پہلے گلابو انتہائی شوق سے کھا رہی تھی اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھی۔ مولیوں کے چند پتے اس کے ادھ کھلے منہ میں سے واضح طور دکھائی دے رہے تھے جو اس کے پیٹ کے دوزخ کا حصہ بننے سے بچ گئے تھے۔ اس کے قریب پڑی ہوئی ایک سوکھی ہوئی مولی کو خون کے چند دھبوں نے گندا کر دیا تھا۔ سرخ و سبز رنگ اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔

فاطمہ گھر پہنچی تو اس کی طبیعت ناساز تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کو تیز بخار ہوا اور وہ بستر میں جا پڑی۔ موسم ابر آلود تھا۔ سہ پہر سے ہی گھنے بادلوں نے آسمان کو گھیر رکھا تھا۔ عصر کے وقت تیز ہوا چلنا شروع ہوئی۔ دینو کے صحن میں کھڑا پیپل کا درخت جس کو خزاں نے برہنہ کر دیا تھا اپنی ٹنڈ منڈ شاخوں اور ٹہنیوں کے ساتھ دائیں بائیں دھیرے دھیرے رقص کناں تھا۔ مغرب کے وقت بوندا باندی شروع ہوئی جو آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئی۔ سردیوں کی بارش میں ایک تسلسل اور روانی ہوتی ہے۔ یہ بارش بڑی وضعدار قسم کی بارش ہوتی ہے۔ اتنی وضعدار کہ بعض اوقات ہفتہ ہفتہ آپ کی مہمان بنی رہتی ہے۔ اس بارش میں شائستگی، نرمی، نفاست اور پاکیزگی ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ اس گھرانے پر برس رہا تھا لیکن فاطمہ بخار میں تڑپ رہی تھی۔ جسم تو بخار میں تپ ہی رہا تھا اس کے دل و دماغ سے بھی شعلے نکل رہے تھے۔

عشاء کے وقت جانے فاطمہ کو کیا سوجھی کہ وہ حسبِ عادت جھلنگے سے اٹھی اور سہمے سہمے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر آ گئی۔ بارش تھم چکی تھی لیکن آسمان ابھی بھی ابر آلود تھا۔ اس نے گھر کا دروازہ کھولا اور گلی میں آ گئی۔ گلی ویران تھی۔ دور نکڑ پر ایک میلا سا بلب ہلکی سی ملگجی روشنی دے رہا تھا۔ گلی کے دونوں طرف کی نالیاں بارش کے پانی سے لبالب بھری بہہ رہی تھیں۔ بائیں طرف اس نے نگاہ ڈالی تو دور تک اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کچھ فاصلے پر اس کو ایک ڈھیر سا دکھائی دیا۔ وہ حیران تھی کہ یہ ڈھیر کس چیز کا ہے اور اچانک کہاں سے آ گیا ہے۔ وہ اس لئے بھی حیران تھی کہ یہ ڈھیر دن کے وقت

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

موجود نہیں تھا۔ غور کرنے پر ڈھیر آہستہ آہستہ ہلتا ہو احساس ہوا۔ فاطمہ ڈر گئی اور مکان کے اندر بھاگ آئی۔ ابھی وہ کنڈی چڑھا ہی رہی تھی کہ اس کو گھوڑی کے ہنہنانے کی پژمردہ سی آواز سنائی دی۔ کنڈی ایک سیکنڈ میں کھل چکی تھی۔ وہ ڈھیری گلابو کا زخموں سے چُور جسم تھا جس کی واحد حرکت شدید سردی کی وجہ سے جسم کے اوپر طاری ہونے والی شدید کپکپاہٹ تھی۔ فاطمہ اور گلابو آمنے سامنے تھیں۔ دو پرانی سہیلیاں از سرِ نو دو بدو تھیں۔ آنکھیں چار تھیں۔ اندھیرے کے باوجود سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ جذبوں کو سمجھنے کے لئے انرجی سیور یا ٹیوب لائیٹس کی روشنیاں درکار نہیں ہوتیں۔ فاطمہ کو بابا کا ڈر بھی تھا کہ کہیں اس کو دیکھ نہ لے۔ وہ گھر گئی اور پالک کا بھرا ہوا شاپر اٹھا کر لے آئی جو کل کے پکانے کے واسطے دینو ایک دن پہلے ہی لے آیا تھا۔ ابھی اس نے ساگ گلابو کے آگے ڈالا ہی تھا کہ بابا کے کھانسنے کی آوا زسنائی دی۔ وہ بھاگ کر اندر چلی گئی۔ آہستگی سے کنڈی بند کی اور اپنے کمرے میں جا کر بستر میں گھس گئی۔ بستر میں گھسنا ہی تھا کہ نیند کی مدہوش کیفیت اس کے اوپر طاری ہوگئی۔

آدھی رات کو بارش کا سلسلہ پھر شروع ہوا جو صبح تک جاری رہا۔ دینو شب بھر دروازے پر ہلکی ہلکی دستک کی آواز سنتا رہا۔ آدھی رات کے بعد اس آواز نے دینو کو سونے بھی نہ دیا۔ صبح جب دودھ لانے کے لئے دینو نے دروازہ کھولا تو حیران رہ گیا۔ دروازے کے ساتھ گلابو مردہ حالت میں لیٹی پڑی تھی۔ دینو بھاگ کر اندر آیا اور بیوی کو سارا واقعہ سنانے لگا۔ آمنہ اور فاطمہ بھی جاگ اٹھی تھیں۔ فاطمہ بھی تمام گھر والوں کے ساتھ باہر آ گئی۔ گلابو انتہائی بھونڈے انداز میں دروازے کے ایک طرف مری پڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں ابھی بھی ان کے دروازے کے ساتھ لگی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہی زخمی ٹانگیں شب بھر رین بسیرا کی بھیک مانگتی رہی تھیں۔ اس گھر کے اندر جہاں اس کی زندگی کے بیش قیمت برس بسر ہوئے تھے، اس گھر کے اندر جس گھرانے کی اس نے زندگی بھر انتھک وفا سے خدمت کی تھی، اس گھر کے اندر ایک رات شدید سردی سے بچنے کے لئے دستک جس میں اس کی عاشق بھی رہتی تھی اور معشوق بھی، اس گھر کے اندر جہاں اس کا اپنا باڑہ تھا، اس کی اپنی کھرلی تھی جس کو اب پیپے بھی لگ چکے تھے، اپنا پیپل کا درخت تھا لیکن اس سب کے باوجود گھر کا دروازہ نہ کھلا۔ گلابو نے بھی ہمت نہ ہاری اور مرتے دم تک دستک دیتی رہی۔ ڈھیٹ پن کی انتہا تھی یہ بھی۔

مطلع صاف ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں سورج نکل آیا۔ سارا ماحول دھلا دھلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ جب دینو تانگہ لے کر کام پر روانہ ہوا تو فاطمہ ابھی بھی گلابو کے پاس بیٹھی تھی۔ دینو نے چلتے تانگے سے فاطمہ کو آواز لگائی کہ جاؤ سکول کے لئے تیار ہو جاؤ، میں راستے میں میونسپلٹی کے جمعداروں کو کہتا جاؤں گا کہ مردہ گھوڑی کو گلی میں سے اٹھا لیں۔ فاطمہ نے الوداعی نگاہیں گلابو پر ڈالیں۔ گلے کی پونیاں بے رنگ ہو کر سیاہ ہو چکی تھیں۔ جسم کی کئی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی چمڑے سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گلابو کی ایک آنکھ ابھی بھی سرخ تھی جبکہ دوسری آنکھ سے پانی رواں تھا۔ گلابو اور فاطمہ میں جدائی کا باعث بننے والی ٹانگ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی ابھی بھی واضح طور پر شکستہ دکھائی دے رہی تھی۔ پالک لفافے سمیت گلابو کے منہ میں نظر آ رہی تھی۔ گلابو نے شاید اس کو کھانے کی کوشش کی تھی لیکن جانور ہونے کے ناطے وہ لفافے میں پڑی گانٹھ نہ کھول سکی جس سے پالک کا ساگ لفافے سمیت اس کے منہ میں ہی رہ گیا۔ فاطمہ نے آہستگی سے اپنی آنکھوں کو موندا اور واپس گھر میں آ گئی۔

***

ٹکرے کی عورت

عورت کے لیے سب سے اہم چیز اُس کی عزت ہے۔ بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر ہے۔

☆ -- نوید اسلام صدیقی

پچھلے اتوار عاطف صاحب تشریف لے آئے۔ آپ کو سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے لیکن ابھی بھی ایک منظم اور مربوط زندگی گزار رہے ہیں۔ باقاعدگی سے روزانہ شیو کرنا، نیا استری شدہ جوڑا پہننا، سبزی منڈی جانا، پانچوں نمازیں مسجد میں ادا کرنا، ہر ایک کے ہاں غمی خوشی میں شریک ہونا۔ محبت کرنے والے مخلص انسان ہیں، ہفتہ دس دن بعد ملنے ضرور آ جاتے ہیں۔

سبزی منڈی عاطف صاحب کے گھر سے پانچ منٹ کی واک پر ہے۔ عاطف صاحب نہ صرف اپنے گھر کا بلکہ دو چار پڑوسیوں کا بھی سودا سلف خرید لاتے ہیں، اُن کا خیال ہے کہ زیادہ مال اکٹھا لینے کی وجہ سے اچھی خاصی رعایت ہو جاتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ دوکاندار بھی آدمی کو اہمیت دیتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ چند دن قبل میں منڈی گیا تو میں نے دیکھا کہ وہاں پولیس کی کچھ گاڑیاں موجود ہیں اور سپاہی اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ دو ایمبولنس بھی ایک سائیڈ پر کھڑی نظر آئیں۔ میں خطرے کی بو سونگھ کر واپس آ گیا۔ اگلے دن سبزی منڈی گیا، کوئی خاص بات نظر نہ آئی، میں جس دکاندار سے سودا لیتا ہوں وہ اکیلا ہی اپنی دکان پر بیٹھا تھا، میں سیدھا اُس کے پاس چلا گیا، میں نے اُس سے پوچھا کہ کل کیا ہوا تھا، بڑی پولیس اِدھر آئی ہوئی تھی، دو ایمبولنس بھی کھڑی تھیں۔ کہنے لگا آپ کو معلوم ہے اِدھر ایک پہلوان نما، لیسی تڑنگی، کالی بجھنگ، وحشی سی عورت ہوا کرتی تھی، اُس کا

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نام رانی تھا، اُس نے کل حاجی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور پھر خود بھی زمین پر گر کر مرگئی۔ کہتے ہیں اُس نے زہر کھالیا تھا اور زہر کا ٹیکہ بھی خود کو لگالیا تھا۔

اور یہ سب کچھ اُس نام نہاد، بغیر حج والے حاجی کی وجہ سے ہوا ہے۔ حاجی انتہائی شرارتی آدمی تھا، آپ کو شاید معلوم ہی ہوگا کہ وہ سبزی منڈی کی کمیٹی کا صدر بھی زبردستی بنا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ نام نہاد حاجی والی کیا بات ہے، حاجی حاجی ہوتا ہے، یہ نام نہاد کیا ہوا۔ اُس نے ہنستے ہوئے بتایا، تین چار سال قبل اِس محمد دین نے ہر ایک کو بتانا شروع کر دیا کہ میں نے حج پر جانے کی نیت کرلی ہے، اِس نے داڑھی رکھ لی، لیکن حج پر نہیں گیا، کہتا تھا پیسے کچھ شارٹ ہیں، اور اُدھار لے کر حج کرنا مناسب نہیں ہے۔ لوگوں نے اس کو بلاوجہ حاجی حاجی کہنا شروع کر دیا، اگلے سال پھر اس نے اعلان کیا کہ مجھے مولوی صاحب نے مسئلہ بتایا ہے کہ حج اسی کا قبول ہوتا ہے جو پانچ وقت کا نمازی ہو، اب میں نماز کی عادت ڈال رہا ہوں۔ غرض اسی طرح کے ڈرامے کرتا رہتا۔ بغیر حج کیے اپنے آپ کو حاجی کہلواتا رہا۔ کرتوت ایسے کہ شیطان بھی شرمائے۔ اگر میں اس کے کارنامے آپ کو بتاؤں تو آپ بھی کانوں کو ہاتھ لگائیں۔ بہت ہی بے غیرت انسان تھا۔

وہ لڑکی جس نے خودکشی کی ہے، وہ تقریباً سال قبل اپنے شوہر کے ساتھ یہاں منڈی میں آئی تھی۔ سات آٹھ ماہ قبل اُس کے شوہر کو ایک ٹرک سے مال اتارتے ہوئے حادثہ پیش آگیا تھا، وہ پیازوں کی بوریوں کے نیچے آگیا تھا اور دم گھٹنے سے بیچارہ مرگیا تھا۔ یہ عورت پھر بھی یہیں رہتی رہی۔ یہ بہت جرأت اور ہمت والی عورت تھی، ہر وقت کہتی تھی کہ عورت کے لیے عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ کام کرنے کی بہت تیز تھی، مردوں کے مقابلے میں دگنا کام کرتی تھی اور کام کی رفتار بھی اُن سے زیادہ تھی۔ ٹرکوں سے سامان اتروانا اس کا خاص شغل تھا، فالتو وقت میں دُکانداروں کی سبزیاں سیٹ کر دینا، اُن کو پانی لگا دینا، کوڑا کرکٹ علیحدہ کر دینا، اس طرح کے کام کرتی رہتی تھی۔ کام کے معاوضے کے طور پر سبزی پھل وغیرہ لے لیتی تھی جو بعد میں سستے داموں مختلف محلوں میں جاکر فروخت کرآتی تھی، علاوہ ازیں کام کے معاوضے کے طور پر چائے، کھانا اور پیسے بھی قبول کرلیتی تھی۔ حاجی روزانہ اس کو دوپہر کا کھانا دیا کرتا تھا یہ حاجی کا احسان مانتی تھی اور اُس کی دکان کو ہر وقت سجا کر، صاف ستھرا رکھنے میں حاجی کی مدد کرتی تھی۔

ایک دو ماہ قبل دن کے گیارہ بارہ بجے اچانک شور سا مچا، میں نے دیکھا کہ سب لوگ حاجی کی دکان کے سامنے جمع ہیں، میں بھی اُدھر چلا گیا، وہاں جا کر دیکھا کہ سب لوگ ہنس رہے ہیں اور رانی نے حاجی کا گریبان پکڑا ہوا ہے۔ اور بار بار کہہ رہی ہے، او بے غیرت، بے حیا تجھ میں نہ شرم ہے نہ حیا ہے، میں تجھے ایسا سبق پڑھاؤں گی کہ تُو مرتے دم تک یاد رکھے گا۔ او مکار حاجی، مجھے ہاتھ لگاتے تجھے شرم نہ آئی، کیا تیری بیوی مرگئی ہے جو تُو اِدھر اُدھر ہاتھ مارتا پھرتا ہے۔ میں بھی تیری بیٹیوں کی طرح ہوں، خدا کا خوف کر۔

سب دوکاندار اِس ڈرامے کو انجوائے کر رہے تھے اور حاجی بھیگی بلی بنا ہوا تھا، آخر میں آگے بڑھا، میں نے کہا: رانی بیٹی، بس بہت ہوگیا، تُو اسے اب چھوڑ دے۔ رانی نے میری بات کی لاج رکھ لی اور اسے چھوڑ کر ایک طرف ٹانگوں میں سر رکھ کر رونے لگی۔ روتے روتے اونچی آواز میں کہہ رہی تھی: ہائے بدنصیبی، کیا قسمت میں ذلیل و خوار ہونا ہی لکھا ہے۔ یا اللہ یہ کیسا تیرا جہان ہے، جہاں چلے جاؤ مرد کی شیطنت سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ پھر وہ چپ ہوگئی اور اُٹھ کر ایک طرف چل پڑی۔

حاجی کے ساتھ جو کچھ ہوئی، اُس پر وہ اندر ہی اندر تلملاتا رہا، آخر اُس کے شیطانی ذہن میں ایک سکیم آئی، وہ ایک دن کسی کو بتائے بغیر تھانے چلا گیا، اور اُن کو بتایا کہ یہاں منڈی میں ایک آوارہ عورت رہتی ہے، جس کا بدمعاشوں، چوروں، ٹھگوں کے کسی بڑے گروہ سے تعلق ہے۔ یہ عورت معلوم نہیں کہاں سے آئی ہے، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ وہاں بھی وارداتیں کرتی رہی ہے، باتوں باتوں میں ایک دن مجھے بتا رہی تھی کہ میں نے ایک بدکار کو ہلاک کر کے اُس کی لاش غائب کر دی تھی۔ آپ لوگ ایسا کریں کل دو تین سپاہی منڈی میں آئیں اور اعلان کریں کہ گورنمنٹ کا سخت آرڈر آیا ہے کہ تمام لوگ اپنے اپنے شناختی کارڈ چیک کروائیں، اور جن کے شناختی کارڈ نہیں ہیں وہ فارم مکمل کریں اور شناختی کارڈ بنوائیں۔ اس طرح اِس عورت کا پتہ معلوم ہوجائے گا، پھر وہاں کے تھانے سے معلوم کیا جائے کہ اُس علاقے میں کوئی قتل کا واقعہ ہوا تھا۔

قصہ مختصر، اِس طرح چکر چلا کر حاجی نے اُس غریب عورت کا پتہ معلوم کرلیا یہ کسی قبائلی سردار کے علاقے سے یہاں آئی ہوئی تھی۔ وہاں کے سردار کا بیٹا قتل ہوا تھا۔ وہاں کی پولیس سے حاجی نے رابطہ کیا اور بتایا کہ ایک آوارہ عورت یہاں منڈی میں رہتی ہے جو اُس کی خواہش کو پورا نہ کرے اُس کی بے عزتی کرتی ہے۔ اپنا نام رانی بتاتی ہے، پولیس والوں نے بتایا کہ سردار کی ایک نوکرانی سال بھر سے بھاگی ہوئی ہے، اُس کا نام رانی ہے، ہوسکتا ہے یہ وہی ہو۔ چند دنوں بعد وہاں کے سردار کے آدمی اور تھانے کا عملہ لاہور آگیا۔

ابھی اُن کی گاڑیاں منڈی سے باہر کھڑی تھیں، یہ وہ جگہ ہے جہاں کچھ چرسی اور ہیروئن پینے والے ہر وقت بیٹھے رہتے ہیں۔ پولیس والوں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اشارے سے بلایا۔ ایک نشئی اٹھ کر گاڑی کے پاس آیا، گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے پوچھا کہ یہاں ایک عورت رانی ہوتی ہے، اُس سے ملنا ہے۔ اُس آدمی نے کہا کہ ہاں ہوتی ہے، ابھی کچھ دیر قبل یہاں کھڑی تھی میں اپنے ساتھیوں سے معلوم کر کے بتاتا ہوں کہ وہ کدھر گئی ہے۔ وہ ساتھیوں کے پاس واپس گیا اور کہا کہ رانی ہماری محسن ہے، وہ ہمیں مارکیٹ سے پھل لا کر دیتی ہے، ہمیں نشے کے ٹیکے لگا دیتی ہے، ہمیں کوٹھیوں سے جاکر پہننے کے لیے کپڑے لادیتی ہے، آج ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس کو پولیس سے بچائیں۔ میں جا کر رانی کو متنبہ کرتا ہوں، جاتے جاتے اِن کو کہہ جاتا ہوں کہ ابھی اُس کو لے کر آتا ہوں۔ گاڑی والے سے اس نے بات کی، گاڑی والے نے کہا شاباش اسے لے آؤ، پھر ہم تم کو انعام بھی دیں گے۔

اُس نے جا کر رانی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا، رانی نے چوری چوری ایک جگہ سے دیکھا تو پولیس کی گاڑی کے ساتھ کھڑی کار میں اُسے سردار کا نواسا بیٹھا نظر آیا۔ فوری طور پر اس نے فیصلہ کیا کہ ان لوگوں کے ساتھ جانے کی صورت میں عزت محفوظ نہیں رہے گی۔ اُس نے پاس کھڑے نشئی کو کہا کہ اچھا بھائی خدا حافظ، تمہارے آگاہ کرنے کا بہت بہت شکریہ، یہ بات اپنے تک رکھنا کہ ان لوگوں کے ساتھ جا کر میری عزت محفوظ نہیں رہ سکتی، تم ان کو باتوں میں لگائے رکھنا، میں اتنے میں اپنے پاس رکھا ہوا زہر نکال کر کھالوں گی اور احتیاطاً زہر کا ٹیکہ بھی لگالوں گی۔ اس کے علاوہ حاجی کو جاتے جاتے سبق بھی پڑھا جاؤں گی۔ اچھا خدا حافظ۔

اُس نے اپنے سامان میں کھانے والا زہر رکھا ہوا تھا، اُس کی ساری مقدار اکٹھی ہی پھانک لی، زہر کا ٹیکہ بھی لگالیا۔ اور پسٹل جو اُس نے کافی عرصہ سے چھپایا ہوا تھا، وہ لوڈ کر کے حاجی کی دکان کی طرف چل پڑی۔ دور سے ہی آوازیں دینی شروع کر دیں، حاجی میرے گاؤں

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

سے پولیس آگئی، جلدی آ۔ حاجی بیٹھا تھا ایک دم خوشی سے کھڑا ہوگیا۔ کہنے لگا، او دو ٹکے کی عورت، او حرام زادی، بڑی آئی عزت والی آج رات تیری عزت کا جنازہ نکل جائے گا، اور تیرا دماغ بھی زمین پر آجائے گا۔ رانی بھوکی شیرنی کی طرح گرجی، او حاجی سن لے، میرے جیتے جی کوئی میری طرف بری نیت سے دیکھ نہیں سکتا۔ میں اپنی عزت کی خاطر اپنی جان دے رہی ہوں اور اے بے غیرت، آج شام کو تیرے گھر سے تیرا جنازہ اٹھے گا۔ اور یہ کہتے کہتے رانی نے اپنے دوپٹے کے نیچے سے پسٹل نکالا اور تین گولیاں حاجی کی چھاتی میں اتار دیں۔ حاجی نے ایک چیخ ماری اور زمین پر گر کر تڑپنے لگ گیا۔ اسی اثناء میں رانی بھی زمین پر گر گئی۔ دو پولیس کے سپاہی دوڑتے ہوئے ان کی طرف آئے، میں بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ رانی کے آخری الفاظ یہ تھے، اور یہ میں نے خود سنے، عورت کے لیے سب سے اہم چیز اُس کی عزت ہے۔ بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر ہے۔

۱۱۲۲ کو فون کیا گیا، جلد ہی دو ایمبولنس پہنچ گئیں، پہلے ہم یہاں قریبی ہسپتال لے گئے، ہسپتال والوں نے دونوں کی موت کی تصدیق کردی۔ پھر منڈی کے دو دکاندار دونوں کی لاشوں کو علاقے کے تھانے میں لے گئے، تھانے میں نہیں گیا تھا، عشا کی نماز کے بعد حاجی کا جنازہ تھا میں اُس میں گیا تھا، حاجی کی چار جوان بیٹیاں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں معلوم ہوا کہ کسی بیٹی کی بھی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے، احمق آدمی کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔

سبزی منڈی اور فروٹ منڈی میں تھوڑا سا فاصلہ ہے۔ یہ المناک حادثہ پیش آنے سے ایک دن قبل کی بات ہے رانی پہلے اِدھر ہی دوکانوں کے آگے صفائی کر رہی تھی، پھر فروٹ منڈی چلی گئی۔ حاجی تو پہلے کافی دیر اسے جاتے دیکھتا رہا، پھر اچانک ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنسا۔ کہنے لگا میری پوری زندگی میں اتنی بے عزتی کبھی نہیں ہوئی، جتنی اس دو ٹکے کی عورت نے اُس دن پوری منڈی میں سب کے سامنے کردی۔ میں نے بھی ادھار نہیں رکھا، ایسا بدلہ لیا ہے کہ مزہ آگیا۔ پیسہ تو کافی لگ گیا لیکن ایک دو دن میں اس کے دماغ سے عزت کا بھوت اتر جائے گا، آئندہ کوئی دوسری عورت عزت عزت کا ڈھول پیٹنے سے پہلے سو دفعہ سوچے گی۔ شکل دیکھو، ان بھوتنیوں کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے، بڑی آئی عزت والی۔ اور یہ کہہ کر حاجی نے پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے شروع کردیے۔ سب پوچھتے رہے بتاؤ کیا بات ہے کہنے لگا بس تھوڑا صبر کرو، سب کچھ آپ کے سامنے ہوگا، بہت مزہ آئے گا۔

ہاں دوسری خاص بات یہ ہوئی کہ وہ لوگ جو آئے تھے اُن کا ایک ساتھی کسی دکان سے پھل وغیرہ خرید رہا تھا۔ دکاندار نے اس سے پوچھا کہ آپ اُن لوگوں کے ساتھ نہیں گئے؟ وہ کہنے لگا میں سردار کے ایک کام کے سلسلے میں لاہور میں دو چار دن کے لیے ٹھہر گیا ہوں، لاہور میں میرے عزیز رہتے ہیں اُن کے گھر قیام کروں گا اِس لیے یہ پھل وغیرہ اُن کے بچوں کے لیے خریدا ہے۔

ایک دکاندار نے پوچھا آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ یہ عورت کون ہے؟ اِس نے وہاں کس کو قتل کیا تھا اور کیوں قتل کیا تھا؟ سردار کے اُس ملازم نے بتایا: اِس لڑکی کی ماں بھی سردار کے ڈیرے پر کام کرتی تھی، جب وہ جوان تھی، ایک دن سردار صاحب نے اُس کی طبیعت صاف کردی، اور بیچاری اپنی عزت گنوا بیٹھی، بہرحال یہ ہمارے ہاں ایک عام بات ہے، وہاں عام غریب عورتوں کی عزت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ پیدا ہوئی تو اس حرام کی اولاد کو سب نے حرامی حرامی کہنا شروع کردیا، آہستہ آہستہ یہ لفظ بگڑ کر رامی بن گیا۔

سردار نجانے کیوں اس لڑکی سے بہت پیار کرتا تھا، شاید اس کا ضمیر اسے کچوکے لگاتا ہو۔ یہ بھی گھر میں شہزادیوں کی طرح رہتی تھی۔ ہر وقت کھاتی پیتی رہتی، کھا کھا کر گول گپا بن گئی تھی، مردانہ کھیلوں میں بہت دلچسپی لیتی تھی۔ ہر ایک اس سے دور ہی رہنا پسند کرتا تھا۔ ہر ایک کے گلے پڑنے کو تیار، ایک آفت سمجھی جاتی تھی۔ سردار کی بیگم ہر وقت ٹی وی لگا کر بیٹھی رہتی، یہ بیگم صاحبہ کے پیر دباتی، ان کی کنگھی کردیتی، بس یوں سمجھ لیں اُن کی پرسنل سیکرٹری تھی۔ سردار کے ساتھ جنگل میں جاکر پسٹل اور رائفل چلانے کا شوق پورا کرتی رہتی۔ ایک دفعہ شور مچا تھا کہ سردار کا نیا پسٹل غائب ہوگیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ اِس رانی نے اپنے پاس چھپایا ہوا تھا۔ اور یہی اس نے حاجی پر فائر کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

ایک دن صبح صبح ہی سردار کا بیٹا ریاض اچانک غائب ہوگیا۔ دوپہر تین بجے تک کسی نے زیادہ پرواہ نہ کی، لیکن پھر سب کو فکر ہوئی کہ کدھر چلا گیا ہے۔ وہ کبھی گھر سے بتا کر باہر نہیں گیا تھا، کسی کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور کب آئے گا لیکن عام طور پر دو بجے تک دوپہر کا کھانا کھانے ضرور آجاتا تھا، اب جب تین بج گئے تو پریشانی ہونا لازمی بات تھی۔ ہر ایک دوسرے سے پوچھ رہا تھا کہ ریاض کدھر ہے، لیکن کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔

چند دن قبل ریاض کا قریبی قصبے میں کسی دوسرے سردار کے بیٹے سے جھگڑا ہوا تھا، گھر والوں نے الزام لگا دیا کہ ریاض کو انہی لوگوں نے گم کیا ہے، پولیس کافی تحقیقات کرتی رہی، لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ اِس واقعے کے دو تین مہینے بعد رامی اچانک غائب ہوگئی، لیکن کسی نے زیادہ اہمیت نہ دی۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک شتر بے مہار عورت ہے کہیں چلی گئی ہے، دھکے کھا کر ایک دن واپس آجائے گی۔ ہوا یہ تھا کہ کچھ دنوں سے سردار کی بیگم صاحبہ نے نوٹ کیا تھا کہ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی ہے، انہوں نے اس کو ڈانٹا اور کہا تھا کہ ان دنوں تمہارے دماغ میں کوئی شیطانی فتور آیا ہوا ہے، جوانی سب پر ہی آتی ہے اور بے شک جوانی دیوانی ہوتی ہے لیکن آدمی کو نارمل رہنا چاہیے۔ بیگم صاحبہ کا کہنا تھا کہ اس دن سے منہ بنایا ہوا تھا، ایک دوسری ملازمہ نے بیگم صاحبہ کو بتایا تھا کہ رانی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ بیگم صاحب نے میرے کردار پر شک کیا ہے، انہوں نے مجھے بدکار سمجھا ہے، اب میرا یہاں رہنے کو دل نہیں کرتا۔ یہی سمجھا جا رہا تھا کہ وہ اسی لیے کہیں غائب ہوگئی ہے۔

☆☆☆

عاطف صاحب نے بتایا کہ اصل حقیقت کل سامنے آئی ہے، سڑک کے پار جو نئی کالونیاں آباد ہوئی ہیں، رانی اُدھر کوٹھیوں میں سبزی اور پھل وغیرہ بیچنے جاتی تھی اور وہاں چٹخارے لے لے کر اپنی بہادری کے قصے سناتی تھی۔ ہمارے ایک عزیز اُدھر ہی رہائش پذیر ہیں اُن کی بیوی کل ہمارے گھر آئی تھی، وہ بتا رہی تھی کہ رانی ہر وقت ایک ہی بات کرتی رہتی تھی کہ عورت اُس وقت تک ہی عورت ہے جب تک وہ اپنی عصمت و عزت بچائے رکھتی ہے، عزت گنوا کر جینا ذلت کی زندگی ہے۔ عزت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کہتی تھی، مجھے نظر آتا ہے کہ مجھے اس سماج سے کسی وقت ٹکر لینا پڑے گی۔ میں تنہا نہتی عورت اس معاشرے کا مقابلہ کس طرح کروں گی۔ میں نے سوچا ہے خود مرنے سے قبل ایک آدھ کو مار کر ہی مروں گی۔ راز کی بات یہ ہے کہ میں سردار کے گھر سے ایک پسٹل اٹھا لائی تھی۔ ہر وقت پسٹل میں گولیاں تیار رکھتی ہوں۔

وہ جتنی سبزی پھل بیچتی ان سے حاصل کردہ پیسے انہی محترمہ کے پاس رکھوا دیتی تھی، وہ بتا رہی تھیں کہ اس وقت میرے پاس اس کے ۲۷۰۰ روپے پڑے ہوئے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہیں۔ ہاں، اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس سماج سے لڑتے لڑتے اگر کسی وقت مجھے اپنی جان قربان کرنا پڑی تو پھر آپ نے یہ رقم میری جیسی کسی مظلوم عورت کو دینی ہے جس کے دل میں اپنی عصمت وعزت بچانے کا احساس زندہ ہو۔

انہوں ہی نے بتایا کہ یہ عورت اکثر یہ بات کرتی تھی کہ سردار کے خاندان کے ہاتھوں کسی عورت کی وہاں عزت محفوظ نہ تھی، اس لیے میں ہروقت اعلان کرتی رہتی تھی کہ میری طرف جو بری نگاہ سے دیکھے گا میں اُس کی آنکھیں نکال لوں گی۔ جو بری نیت سے میری طرف قدم بڑھائے گا اُس کی ٹانگیں توڑ دوں گی، جو ہاتھ بدنیتی سے آگے بڑھیں گے اُن کو کاٹ دوں گی اور اگر اس کے باوجود باز نہ آیا تو پھر جان سے مار ڈالوں گی یا خود مر جاؤں گی۔ میں نے سردار کے ٹی وی سے جوڈو کراٹے، باکسنگ، کشتی وغیرہ وغیرہ سیکھ لی ہے، میرا اعلان ہے جو بھی رستے میں آئے گا کٹ جائے گا۔

مجھے معلوم ہوا کہ سردار کا بیٹا ریاض کہتا ہے کہ یہ ہماری بلی اور ہمیں ہی میاؤں، یہ بدذات ہم سرداروں کو ہروقت چڑاتی رہتی ہے میں نے اس کی طبیعت صاف نہ کی تو میں بھی سردار کا بیٹا نہیں۔ ادھر میں نے بھی قسم کھائی کہ مرتی مر جاؤں گی لیکن اپنی عصمت کی حفاظت ہر صورت کروں گی۔ اس بدبخت نے میری طرف اگر بری نظر سے دیکھا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ ریاض نے میری باتوں کو اپنے لیے چیلنج سمجھ لیا، ایک دن موقع پا کر اُس نے مجھے ڈرائنگ روم میں صفائی کرتے ہوئے اچانک پکڑ لیا اور کہنے لگا: اب بول؟ میں نے دل میں سوچا کہ اس وقت تو جان چھڑاؤ، اپنی عزت بچاؤ اور شکار کو کچھار میں لے جا کر ایسا سبق پڑھاؤ کہ مزہ آ جائے۔ میں نے ٹی وی میں دیکھے ہوئے ڈراموں کے ڈائیلاگ بولنے شروع کر دیئے" آپ سے تو مجھے محبت ہے، آپ کے لیے تو میں ہروقت حاضر ہوں، میری اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہوگی کہ آپ مجھے لفٹ کرائیں۔ لیکن پلیز ہر کام ایک طریقے اور سلیقے سے ہو تو ہی مزہ آتا ہے۔" اور نجانے اس طرح کے کیا کیا ڈائیلاگ بولے۔ ریاض میری باتوں میں آ گیا۔ اُس نے کہا: 'رامی! اب سب کچھ اُس وقت ہوگا، اور اُس طرح ہوگا جس طرح تو چاہے گی۔' میں نے کہا: 'یہ بات صرف میرے اور آپ کے درمیان ہے کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے، میری تو نہیں آپ کی عزت پر حرف آئے گا، چند ماہ بعد آپ کی شادی ہونے والی ہے، وہ دلہن آپ کے بارے میں کیا سوچے گی۔ اس لیے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ میں سارے انتظامات مکمل ہونے پر آپ کو بتاؤں گی۔ میرے خیال میں ایسا منظر آتا ہے کہ نہر کا کنارہ ہو، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو، چاروں طرف سبزہ ہو، پرندے چہچہا رہے ہوں۔ فضا میں قدرتی پھولوں کی خوشبو رچی ہو۔ تازہ کٹا ہوا میٹھا میٹھا پھل سامنے پڑا ہو، ہائے کتنا مزہ آئے۔' ریاض یہ کہتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا: 'میں صدقے جاواں، سو سو وار تیرے تے واری جاواں۔'

ساتھ والے گاؤں میں ایک گبھرو جوان ناصر تھا جو کسی مزارع کا بیٹا تھا، ایک دن میں کھیتوں میں پگڈنڈی پر اکیلی جا رہی تھی، میرے ذہن میں اچانک خیال آیا کہ میرا جو منصوبہ ہے اُس میں اگر ناصر تعاون کرے تو کام بہت آسان ہو سکتا ہے، لیکن وہ بھی شیطان کا بھائی ہی نکلا اور اچانک میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے میرے دونوں بازو پکڑ لیے۔ میں جوڈو کراٹے کی ماہرہ، میں نے کھینچ کر اپنی دائیں لات اُس کو ماری وہ پانی سے بھرے کھیت میں جا گرا۔ میں نے وہاں پڑا ہوا ایک پانچ دس کلو وزنی پتھر اٹھا لیا اور کہا کہ پانی ہی میں پڑا رہ اور میری بات آرام سے سن، ذرا بھی ہلا تو پتھر تیرے سر کا

دے ماروں گی۔

ناصر پر ایسی ہیبت طاری تھی کہ وہ بے جان ہو کر پڑا رہا، میں نے اسے بتایا کہ سردار کے بیٹے نے بری نیت کے ساتھ میری طرف دیکھا تھا، مجھے تو ایک سہارا چاہیے، اور میں تو تجھے زندگی بھر کا سہارا بنانے کا سوچ رہی تھی اور تُو کتنی تھرڈ کلاس حرکتیں کر رہا تھا۔

ناصر نے معافی مانگی۔ میں نے اسے سارا منصوبہ بتایا، منصوبے پر ہم دونوں کام کرتے رہے۔ جب سارے انتظامات مکمل ہو گئے میں نے سردار کے بیٹے ریاض سے کہا کہ کل صبح میں آپ کو فجر کی نماز کے ٹائم گاؤں کے پاس پرانے متروک پل کے پاس ملوں گی۔ آپ نے نہر کے پل کے نیچے آ جانا ہے میں وہیں ہوں گی۔ باقی چیزیں میں لے آؤں گی، آپ کوئی پھل وغیرہ لیتے آنا، مل بیٹھ کر کھائیں گے بہت مزہ آئے گا۔ میں ایک بار پھر آپ سے عرض کروں گی کہ آپ کے یہاں آنے کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔ ریاض نے کہا: 'کیوں نہیں میری جان۔'

اگلے دن صبح سویرے گھر میں کسی کو بتائے بغیر ریاض نہر کے پل پر آ گیا۔ ناصر اور میں وہاں موجود تھے، ناصر قریب ہی ایک جگہ ایک خنجر لیے چھپا بیٹھا تھا۔ میں نے ریاض کو بتایا کہ یہ دری اور تکیہ میں نے آپ ہی کے لیے سیٹ کیا ہے، آپ اس پر لیٹ جاؤ، وہ ایک منٹ لیٹا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا، شکر ہے اس نے ناصر کو نہیں دیکھ لیا، اُس نے اپنا کرتا اتار کر پرے پھینکا، کہنے لگا میرا نہانے کو دل کر رہا ہے، مجھے یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اس طرح زیادہ دیر نہ ہو جائے اور کوئی آدمی اس طرف نہ آ نکلے۔ میں نے کہا بھولے بادشاہو! پہلے نہیں بعد میں نہاتے ہیں۔ (اور میں نے دل میں کہا آج تو میں خود تجھے تیرے خون میں غسل دوں گی، تُو نہر میں نہانے کا سوچ رہا ہے اور میں تجھے سرخ رنگ کے سمندر میں غوطے

تبخیر معدہ کے مایوس مریض متوجہ ہوں
مفید ادویات کا خوش ذائقہ مرکب
ریمینال شربت
تبخیر معدہ اور اس سے پیدا شدہ عوارضات مثلاً دائمی قبض، گھبراہٹ، سینے کی جلن، نیند کا نہ آنا، کثرت ریاح، سانس کا پھولنا، تیزابیت معدہ، جگر کی خرابی اور معدہ کی گیس سے پیدا ہونے والے امراض کے لیے مفید ہے۔
اپنے قریبی دوا فروش سے طلب فرمائیں
نوٹ
تبخیر معدہ و دیگر امراض کے طبی مشورے کے لئے
ممتاز مطب
سے رابطہ فرمائیں
ممتاز دواخانہ (رجسٹرڈ) میانوالی
فون: 233817-234816

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

دوں گی)۔ وہ دوبارہ آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گیا، معلوم ہوتا تھا وہ اس صبح کے انتظار میں، پوری رات سویا نہیں ہے، یوں معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

میں ایک طرف بیٹھ کر سیب کاٹنے لگی اور کٹے ہوئے ٹکڑوں پر بے ہوشی کی دوا بھی ساتھ ساتھ ملتی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ موقع سنہری ہے، میں نے سیب پرے پھینکے اور ناصر کو اشارہ کیا وہ چیتے کی پھرتی کے ساتھ ریاض پر حملہ آور ہوا۔ اُس کے سنبھلنے سے قبل ہی اُس کے دل میں، اور پیٹ میں چار چھ دفعہ خنجر گھونپ دیا۔ ریاض کچھ دیر تڑپ کر ختم ہوگیا۔ میں یہ کارنامہ انجام دینے سے قبل دو تین دن اُس جگہ آتی رہی تھی اور میں نے کافی گہرا ایک گڑھا پاس ہی کھودا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے ریاض کو گڑھے میں ڈال دیا اوپر سے خوب مٹی ڈال دی۔ لاش کو خراب کرنے کے لیے چونا، تیزاب اور جو کچھ ناصر مارکیٹ سے لایا تھا بیچ میں ڈال دیا۔ یہ سب کارروائی کر کے ناصر اپنے گاؤں چلا گیا اور میں بھینسوں کے لیے چارہ کاٹنے کھیت میں چلی گئی۔ چارہ کاٹ کر معمول کے مطابق گھر واپس آ گئی۔ اور گھر کے روز مرہ کے کاموں میں لگ گئی۔

ریاض کا کسی کو کچھ پتہ نہ چلا، سب رو دھو کے جب آرام سے بیٹھ گئے، میں نے ناصر سے کہا کہ اب ہم یہاں سے بھاگ چلیں۔ کسی کو معلوم نہ ہوا کہ میں ناصر کے ساتھ ملتان آ گئی ہوں، وہاں ہم نے کورٹ میرج کر لی، ملتان سے ہم دونوں لاہور کی ایک چھوٹی سی سبزی منڈی میں آ کر رہنے لگے۔ ناصر یہاں پہلے بھی مزدوری کرتا رہا تھا۔ اُس نے سب کو بتایا کہ میں نے شادی کر لی ہے اور یہ میری بیوی ہے۔ دن اچھے گزر رہے تھے، ہماری جیسی کئی فیملیاں وہاں رہتی تھیں، پھر اچانک ایک حادثہ ہوا اور ناصر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اب آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا رہتا تھا کچھ سمجھ نہیں آتی تھی، کدھر جاؤں۔ پھر اللہ کا نام لے کر فیصلہ کیا کہ یہیں باقی زندگی گزارنی ہے۔

چند دن قبل رانی نے بتایا تھا کہ ایک حاجی میرے پیچھے پڑ گیا ہے، کسی سے اس نے کہا ہے کہ میں نے رانی کے علاقے میں پولیس کو اطلاع کی ہے وہ عنقریب اس کو گرفتار کرنے آئیں گے۔ رانی کہتی تھی اگر وہاں سے کوئی آیا اور مجھے موقع ملا تو میں زہر کھا لوں گی اور اس حاجی کو اگلے جہان پہنچا کر سکون کی موت مروں گی۔

ہاں، انہی محترمہ نے بتایا کہ ایک دفعہ میں نے رانی سے پوچھا تھا کہ تمہارے دل میں اپنے علاقے کے ظالمانہ ماحول میں اپنی عزت بچانے کا خیال کیسے پیدا ہوا۔ کہنے لگی ایسے بے غیرت لوگ ہیں پہلے میری ماں کی عزت کو داغدار کیا، میں پیدا ہوئی، تو مجھے حرامی حرامی کہنا شروع کر دیا۔ میں بچی تھی، معصوم تھی، مجھے کیا معلوم تھا کوئی بھی مجھے حرامی کہہ کر بلاتا میں دوڑ کر اس کے پاس چلی جاتی، بلانے والا بھی ہنستا دوسرے بھی ہنستے اور میں بھی خوشی سے مسکراتی، یہ تو غالباً جب میں چار پانچ سال کی تھی کسی کے بتانے پر مجھے ساری بات سمجھ آئی۔ میری ماں کو تو پہلے ہی انہوں نے کسی مزارع کے ساتھ شادی کرا کے کہیں دور بھیج دیا تھا۔ رہی سہی کسر ٹی وی ڈراموں اور فلموں نے پوری کر دی۔ میں سمجھ گئی کہ ہر ڈرامہ اور فلم کی کہانی یہ ہوتی ہے کہ عورت کی عزت کو کیسے لوٹنا ہے۔ بس جی میں بھی ڈٹ گئی، اور اکیلے ہی اس سماج کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

کہانی تو ختم ہوگئی لیکن رانی کے آخری الفاظ کانوں میں ابھی بھی گونج رہے ہیں: عورت کے لیے سب سے اہم چیز اُس کی عزت ہے۔ بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر ہے۔

ان کا خیال تھا کہ انہیں کسی نے نہیں دیکھا اس لئے اس واقعہ پر ہمیشہ پردہ پڑا رہے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انسانی خون چھپا نہیں رہتا جلد یا بدیر راز کھل ہی جاتا ہے۔

گرگ زاد

☆----0300-9667909---- دستگیر شہزاد

گل زیب پٹھان سیکٹر فائیو کا باشندہ تھا۔ گل زیب پٹھان فرنیچر کا تاجر تھا اور اس کا سیکٹر فائیو میں فرنیچر کا وسیع اور عظیم الشان شوروم تھا۔ اس کا شمار علاقے کے امیر و معزز تاجر کے طور پر ہوتا تھا۔ اپنی پُرکشش شخصیت و ماہرانہ گفتگو سے گل زیب پٹھان نے کاروباری دنیا میں ایک کامیابی و عزت حاصل کر لی تھی کہ علاقے کے چھوٹے تاجران بھی اسے اپنا گرو مانتے تھے۔

گل زیب پٹھان کا کاروبار راولپنڈی، اسلام آباد میں پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے وہ اپنے کاروباری لین دین کے لئے دونوں ضلعوں کے اہم شہروں میں بھی آتا جاتا رہتا تھا۔ جب بھی وہ اپنے گھر سے باہر جاتا اپنے گھر والوں کو بتا کر ضرور جاتا تھا اور اپنا کام نپٹانے کے بعد ہر حالت میں گھر واپس آ جاتا تھا۔

24 دسمبر کی صبح گل زیب پٹھان ایک پارٹی سے پیسہ لینے کا کہہ کر سہالہ چلا گیا اور بتا گیا کہ شام تک واپس آ جائے گا۔ اپنے سکوٹر پر سوار سہالہ کے لئے روانہ ہوگیا۔ جب رات تک گل زیب پٹھان گھر واپس نہیں لوٹا تو اُس کے گھر والے متفکر اور پریشان ہو گئے۔ انہوں نے گل زیب کے موبائل پر فون کر کے اُس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس کا موبائل فون بند ملا۔ اس سے گھر والوں کی تشویش میں مزید اضافہ ہوگیا۔ متفکر گھر والے رات بھر جاگ کر گل زیب کا انتظار کرتے رہے لیکن صبح تک وہ گھر نہیں لوٹا۔ صبح ہوتے ہی گھر والے اس کی تلاش میں سہالہ گئے اور تاجروں سے پوچھ گچھ کے بعد 25 دسمبر کو گل زیب کے بیٹے قمر خان نے گل زیب کے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

عزم و طاقتور جذبہ ہوتا ہے جس کے سامنے مشکلات کی دیواریں بیوہ کی چوڑیوں کی طرح ٹوٹ جاتی ہیں۔

حلیے اور اس کے سکوٹر نمبر کا حوالہ دیتے ہوئے سیکٹر فائیو چوکی میں اس کی گمشدگی درج کرا دی۔ چوکی انچارج حیدر اقبال نے کئی لوگوں سے پوچھ گچھ کر کے اور اپنے خفیہ ذرائع سے گل زیب کا سراغ لگانے کی کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہیں ملی۔

28 دسمبر کو تھانہ صدر پولیس کو یہ اطلاع ملی کہ سٹیٹ بینک کے پاس ایک سکوٹر کئی دنوں سے لاوارث کھڑا ہے۔ پولیس کو یہ معاملہ مشتبہ نظر آیا اور وہ فوراً حرکت میں آ گئی۔ فوری موقع پر پہنچ کر پولیس نے اس لاوارث سکوٹر کی تلاشی لی۔ تلاشی کے دوران سکوٹر کی ڈگی سے انشورنس کے کاغذات میں ایک فون نمبر درج ملا۔ پولیس نے برآمد فون پر لاوارث سکوٹر کا حوالہ دیتے ہوئے جب پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ وہ سکوٹر سیکٹر فائیو کے باشندے گل زیب پٹھان کا ہی تھا جو 24 دسمبر سے سکوٹر سمیت لاپتہ تھا۔ ان معلومات کی بنیاد پر جب پولیس نے آس پاس کے علاقوں میں گل زیب کی کھوج کی تو اس سے تقریباً ایک کلو میٹر دور مارگلہ پہاڑی کے نیچے تقریباً تین سو فٹ کی گہری کھائی میں جھاڑیوں سے ایک شخص کی لاش برآمد ہوئی۔ متوفی کی لاش کافی پرانی ہونے کی وجہ سے مسخ ہو چکی تھی اور اس سے شدید بدبو اٹھ رہی تھی۔

اسی دوران اطلاع پا کر گل زیب کے گھر والے بھی موقع پر پہنچ گئے اور انہوں نے لاش کی شناخت گل زیب پٹھان کے طور پر کر دی۔

انسپکٹر تھانہ صدر ظفر چوہدری کی ہدایت پر چوکی انچارج حیدر اقبال نے اس پُراسرار کیس کی تفتیش شروع کر دی۔ گل زیب کی لاش مارگلہ پہاڑی کی کھائی سے برآمد ہوئی تھی۔ اس پہاڑی کی چوٹی کے چاروں اطراف ہری بھری وادیاں اور خوبصورت قدرتی نظارے دکھائی دیتے ہیں۔ آبادی سے دور سنسان مقام پر واقع یہ تفریحی پہاڑی مقام محبت کرنے والے جوڑوں کے لئے پُرکشش اور ملنے کا مرکز ہے۔ اس پہاڑی پر زیادہ تر محبت کرنے والے جوڑے رومانس کرنے آتے ہیں۔

اس حقیقت کو ہم نے خود نظر انداز کر دیا ہے کہ پیڑ پودے، پہاڑ، سمندر، زمین، آسمان سب پیار میں ڈھلے دھلائے سوالیہ نشان ہیں۔ ہم ہی انہیں جواب دینے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ اپنی پریشانیوں اور حالات کے لگائے زخموں سے تھک کر ان چیزوں کو ڈھونڈ نہیں پاتے جو قدم قدم پر ہمیں تھام کر خوشیاں دینے کے انتظار میں بکھری پڑی ہیں۔

سب انسپکٹر حیدر اقبال کو اپنے خفیہ ذرائع سے یہ اطلاع ملی کہ 24 دسمبر کو گل زیب دو عورتوں کے ساتھ مارگلہ پہاڑی علاقے میں دیکھا گیا تھا۔ وہ دونوں عورتیں گل زیب کے ساتھ سکوٹر پر سوار تھیں۔ خفیہ ذرائع نے یہ بھی بتایا کہ گل زیب نے اپنا سکوٹر سٹیٹ بینک کے پاس کھڑا کیا اور اس کے بعد ان دونوں عورتوں کے ساتھ پیدل ہی مارگلہ پہاڑی کی طرف گیا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ گل زیب پٹھان کے نائلہ نامی ایک عورت سے محبت کے تعلقات تھے۔

بعض انسان کاغذ کے وہ خوبصورت پھول ہوتے ہیں جن میں انسانیت کی خوشبو نہیں ہوتی۔

جب نائلہ کے کردار کے بارے میں تفتیش کی گئی تو علم ہوا کہ نائلہ سیکٹر فائیو علاقے کی رہنے والی تھی اور وہ ایک آزاد خیال لڑکی تھی۔ وہ زیادہ تر مردوں جیسے کپڑے پہنتی تھی اور مردوں کی طرح ہی بے جھجک انداز میں بولتی تھی۔ اگرچہ نائلہ کے گھریلو حالات معمولی تھے لیکن اس کے رہن سہن کا معیار غیر معمولی بلند تھا۔ نائلہ کے گھر مہنگی

کاروں میں سوار رئیس زادوں کی آمدورفت لگی رہتی تھی۔ نائلہ کی عورتوں سے کم مردوں سے زیادہ دوستی تھی اور سیکٹر فائیو والے اس پر جسم فروشی کا الزام لگاتے تھے۔ نائلہ کے بارے میں یہ اہم معلومات بھی ملیں کہ نائلہ کے گھر میں کافی عرصے سے عافیہ نامی ایک بیوہ عورت بھی رہتی تھی۔ دونوں میں گہری دوستی تھی، اکثر وہ دونوں ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔

شک کی بنیاد پر جب سب انسپکٹر حیدر اقبال نے نائلہ و عافیہ کو حراست میں لے کر ان سے پوچھ گچھ کی تو پہلے تو نائلہ و عافیہ خود کو بے گناہ بتاتی رہیں لیکن جب پولیس نے نائلہ کے موبائل فون کی کال تفصیلات نکلوائیں تو ان کا جھوٹ سامنے آ گیا۔ 24 دسمبر کو صبح سے دو بجے تک نائلہ نے اپنے موبائل سے گل زیب کے موبائل پر اس سے کئی بار بات کی۔ اس کے بعد گل زیب نے اپنے موبائل کا سوئچ آف کر دیا تھا جبکہ نائلہ کا موبائل چالو تھا اور 24 کی شام نائلہ کے موبائل کی لوکیشن مارگلہ پہاڑی کے پاس تھی۔

اس پر نائلہ اور عافیہ ٹوٹ گئیں اور دونوں نے اپنا جرم قبول کرتے ہوئے کہا کہ ان دونوں نے ہی گل زیب پٹھان کو مارگلہ پہاڑی کی چوٹی سے گہری کھائی میں دھکیل دیا تھا۔ جس سے گل زیب کی موت واقع ہو گئی۔

گل زیب ایک ادھیڑ عمر مگر زندہ دل اور رنگین مزاج کا انسان تھا لیکن اس کا دل اور حسرتیں اب بھی جوان تھیں۔ وہ جب بھی کسی خوبصورت و جوان اور سمارٹ لڑکی کو دیکھتا تھا تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ ایک دن سیکٹر فائیو کی رہنے والی نائلہ اپنے ایک رشتہ دار کی شادی کے لئے فرنیچر خریدنے گل زیب کے شوروم میں آئی۔ اُس دن نائلہ نے ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ اس لئے وہ بے حد خوبصورت اور سمارٹ لگ رہی تھی۔ گل زیب پٹھان اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

نائلہ بھی ان تجربہ کار مرد خور لڑکیوں میں سے تھی جو مرد کی آنکھوں کی زبان پڑھ کر ان کے دل کا حال جان لیتی تھی۔ اس لئے وہ گل زیب کے دل کا حال فوراً بھانپ گئی۔ وہ چونکہ گل زیب کی امیری سے واقف تھی اس لئے اسے اپنے حُسن پر فدا دیکھ کر اس کے دل میں بجلی کی مانند یہ خیال کوند گیا کہ اگر وہ گل زیب کو اپنے حُسن کے جال میں پھانس لے تو وہ سونے کا انڈہ دینے والی مرغی ثابت ہو سکتا ہے۔

اس لئے وہ اس کو رجھانے کے لئے اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ نائلہ نے جب گل زیب کو ہری جھنڈی دکھائی تو گل زیب کے حوصلے بھی بلند ہو گئے اور وہ نائلہ سے بے جھجک ہو کر باتیں کرنے لگا۔ اس پہلی ملاقات میں ہی وہ دونوں اتنے کھل گئے کہ انہوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے موبائل نمبر بھی دے دیئے۔ اس دن کے بعد اکثر دونوں کی فون پر باتیں ہونے لگیں۔ پھر دھیرے دھیرے ان کی قربت اتنی بڑھ گئی کہ ان کی خفیہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ گل زیب کی نگاہ نائلہ کے چھلکتے شباب پر تھی جبکہ نائلہ کی نظر گل زیب کی دولت پر تھی۔ وہ گلے میں بانہیں ڈال کر اس کی جیب ٹٹولنا چاہتی تھی۔ دونوں کی اپنی اپنی غرض تھی اس لئے دونوں ایک دوسرے کی طرف اس طرح کھنچنے لگے جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔

برائی کی مثال ڈھلوان کی سی ہے۔ اس پر چند قدم اترو تو اگلے قدم خود بخود تیزی سے اٹھنے لگتے ہیں۔

دھیرے دھیرے وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے کہ ان کے درمیان کی ساری دنیا سمٹ گئی اور دونوں میں ناجائز تعلقات قائم ہو گئے۔

نائلہ کے گھر میں جو عافیہ نامی ایک بیوہ عورت رہتی تھی۔ وہ آبائی طور سے لاہور کی رہنے والی تھی۔ اس کا میکا مارگلہ میں تھا۔ اگرچہ وہ بیوہ تھی لیکن جس طرح بج دھج کر

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

رہتی تھی اس سے اس کے بیوہ ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس نے خود کو اس طرح سنبھال کر رکھا تھا کہ اس کے حُسن وشباب میں غضب کی کشش نظر آتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ گل زیب عافیہ کو دیکھ کر اس پر بُری طرح فریفتہ ہو گیا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہو گیا۔ اتفاق سے اسی دوران عافیہ کی ماں شدید بیمار ہو گئی تو اسے دیکھنے کے لئے عافیہ نے اپنے میکے جانے کا پروگرام بنایا اور نائلہ کو بھی اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لیا۔ نائلہ جب گھر سے باہر جاتی تو گل زیب کو ضرور بتا کر جاتی تھی۔ اس لئے نائلہ نے جب گل زیب کو یہ بتایا کہ وہ عافیہ کے ساتھ اس کے میکے مارگلہ جا رہی ہے تو گل زیب بھی عافیہ کی قربت حاصل کرنے کے لئے ان کے ساتھ چلنے کی ضد کرنے لگا، دونوں مان گئیں۔

23 دسمبر کو گل زیب اپنے سکوٹر سے فیض آباد کے لئے روانہ ہوا۔ راستے میں گل زیب نے نائلہ سے مسلسل فون پر رابطہ قائم رکھا۔ فیض آباد پہنچ کر گل زیب نے نائلہ کے بتائے مقام پر جا کر اس سے ملاقات کی اور ایک ہوٹل میں نائلہ اور عافیہ کے ساتھ ناشتہ کیا۔ اس دوران گل زیب عافیہ سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے اسے اپنے اثر میں لینے کی کوشش کرتا رہا۔ چونکہ گل زیب موج مستی کے لئے نائلہ اور عافیہ کے ساتھ جا رہا تھا اس لئے وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر والوں کو اس بات کا پتہ چلے اس لئے اس نے فیض آباد پہنچنے کے بعد اپنا موبائل بند کر دیا۔ اس کے بعد گل زیب، عافیہ و نائلہ ایک ہی سکوٹر پر سوار ہو کر مارگلہ کے لئے روانہ ہوئے۔ شام کو مارگلہ پہنچنے کے بعد گل زیب نے اپنا سکوٹر سٹیٹ بینک کی برانچ کے پاس کھڑا کر دیا اور پیدل ہی دونوں لڑکیوں کے ساتھ مارگلہ پہاڑی میں گیا اور قریب ہی ایک ریسٹورنٹ میں چائے پی چونکہ گل زیب رومانس کے موڈ میں تھا۔ چائے پینے کے بعد اس نے نائلہ و عافیہ سے مارگلہ پہاڑی کی چوٹی پر چلنے کے لئے کہا۔

مارگلہ پہاڑی کے ایک پوائنٹ پر پہنچ کر تینوں نے پہاڑی کے چاروں طرف پھیلے خوبصورت قدرتی مناظر کو دیکھا اور پھر کچھ دیر ستانے کے لئے وہاں بیٹھ گئے۔ اس وقت پہاڑی چوٹی پر ان تینوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ چونکہ گل زیب اکیلے میں عافیہ سے اپنے من کی بات کہنا چاہتا تھا۔ اس نے نائلہ کو ٹرخانے کے لئے اسے چپس و بسکٹ وغیرہ لانے کے لئے بھیج دیا۔ دُکان پہاڑی چوٹی کے نیچے تھی اس لئے گل زیب کا خیال تھا کہ جتنی دیر میں نائلہ آئے گی اتنی دیر میں وہ اپنا مقصد پورا کر لے گا۔ نائلہ کے جاتے ہی گل زیب نے عافیہ سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے اس کے سامنے اظہارِ عشق کر دیا لیکن عافیہ نے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے اس کی محبت کی درخواست نامنظور کر دی اور وہاں سے اٹھ کر جانے لگی۔ عافیہ کا الزام ہے کہ گل زیب جبراً ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ و فحش حرکات کر کے اُس کے ساتھ من مانی کی کوشش کرنے لگا۔ عافیہ کے مطابق اس نے گل زیب کی مزاحمت کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن گل زیب نے اسے اس طرح جکڑ لیا کہ جیسے باز کسی چڑیا کو دبوچ لیتا ہے۔

> بعض لوگوں کا ظاہر مانجھے ہوئے شفاف برتن کی مانند ہوتا ہے مگر خصلت کریہہ جیسے شہد کی بوتل میں زہر بھرا ہو۔

عافیہ کے بیان کے مطابق گل زیب پر ہوس کا بھوت سوار تھا اس لئے وہ عافیہ سے من مانی کرنے پر آمادہ تھا جبکہ عافیہ کسی بھی قیمت پر گل زیب کے سامنے سپردگی کرنے کو تیار نہیں تھی چنانچہ دونوں کے درمیان ہاتھا پائی ہونے لگی۔ اس جدوجہد میں دونوں ایک دوسرے سے الجھتے الجھتے پہاڑی چوٹی کے بالکل کنارے پر آ گئے۔ اتفاق سے نائلہ بھی واپس لوٹ آئی۔ نائلہ کو

دیکھتے ہی عافیہ اسے مدد کے لئے پکارنے لگی۔ جب نائلہ نے عافیہ کو گل زیب کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کی تو گل زیب نائلہ سے بھی الجھ گیا۔ وہ کسی بھی قیمت پر عافیہ کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ لہٰذا ان دونوں میں دھکم پیل ہونے لگی۔ اسی اثناء میں نائلہ اور عافیہ گل زیب کو دھکیلتے دھکیلتے پہاڑی چوٹی کے اس آخری سرے پر لے گئیں جس کی دوسری طرف تین سو فٹ گہری کھائی تھی۔

نائلہ و عافیہ کی بھرپور مزاحمت کے بعد بھی جب گل زیب اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تو ان کے دماغ میں اشتعال پیدا ہو گیا چنانچہ نائلہ اور عافیہ نے گل زیب کو زور سے دھکا دے کر مارگلہ پہاڑی کی چوٹی سے گہری کھائی میں دھکیل دیا۔ کھائی کی پتھریلی زمین پر گرتے ہی گل زیب کی موت واقع ہو گئی۔

اس واقعہ کے بعد نائلہ اور عافیہ موقع واردات سے چپ چاپ اپنے گھر آ گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں کسی نے نہیں دیکھا اس لئے اس واقعہ پر ہمیشہ پردہ پڑا رہے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انسانی خون چھپا نہیں رہتا جلد یا بدیر راز کھل ہی جاتا ہے۔

نائلہ و عافیہ نے پولیس کے سامنے اپنے اقبالی میں کہا کہ گل زیب کو قتل کرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن دھکم پیل میں اچانک گل زیب کا پیر پھسل گیا اور وہ پہاڑی سے کھائی میں گر گیا اور اس کی موت ہو گئی۔ پولیس نے غیر ارادی قتل کے الزام میں نائلہ و عافیہ کے خلاف کیس درج کر کے انہیں عدالت میں پیش کیا جہاں سے ان دونوں کو جیل بھیج دیا گیا۔ تادمِ تحریر عافیہ و نائلہ جیل میں تھیں اور ان کی ضمانت نہیں ہو سکی تھی۔

> کچے رنگوں کی شہرت دیرینہ سفید پوشی کو داغدار کر دیتی ہے۔

✿

سب اچھا لگا مگر
بات ان سے بنی
U.I INDUSTRY
184-C, Small Industries State
Gujrat PAKISTAN.
PH:+92 53 3535901-2, 3523494-5
Fax: 053-3513307
E-mail: nbsfans@gmail.com

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

استعفیٰ

میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ لوگ استعفیٰ نہ دیں۔ جو کمزور دل لوگ ہوں گے وہ استعفیٰ دے دیں گے اور جو مضبوط اعصاب والے ہوں گے وہ استعفیٰ نہیں دیں گے۔

☆ ---------------------0301-4845557--------------------- حبیب اشرف صبوحی

بعض دفعہ زندگی میں ایسے واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ انسان کسی ایسی چیز کی خواہش کرتا ہے جو بظاہر ناممکن ہوتی ہے اور اگر وہ خواہش پوری ہو جائے تو یہ ایک معجزاتی عمل کہلاتا ہے اور عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔

نومبر 2004ء میں میں ایک ماہ کی چھٹی پر کراچی گیا۔ وہاں ہمارے دفتر کی ایک شاخ پی آئی ڈی سی ہاؤس میں بھی ہے۔ میں نے وہاں کے انچارج کو فون کیا جو میرا قریبی دوست ہے تاکہ دفتر کے تازہ ترین حالات سے آگاہی ہو۔ اس نے بتایا کہ جو میں خبر بتانے جا رہا ہوں اس کو سن کر تمہارے پاؤں تلے کی زمین نکل جائے گی۔ میں نے اُسے کہا کہ خبر فوری طور پر بتاؤ۔

اُس نے کہا کہ کمپنی کے منیجنگ ڈائریکٹر نے ایک سرکلر اُن تمام افسران کو بھیجا ہے جن کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہے اور سروس تیس سال ہو گئی ہے، اُن کی خدمات کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ دسمبر 2003ء تک استعفیٰ دے دیں ورنہ ہم فلاں قانون کے تحت نکال دیں گے۔ یہ خبر سن کر میں بہت پریشان ہوا اور کہا کہ میں صبح دفتر آ کر یہ سرکلر دیکھوں گا۔ دوسرے روز صبح میں دفتر پہنچا اور وہ دو صفحے کا خط دیکھا۔ سخت پریشانی اور مایوسی ہوئی میرے ایک ساتھی نے اسی وقت استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ بعد میں اس کو بہت زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اور بہت جلدی انتقال کر گیا۔

دفتر کا مایوس کن ماحول دیکھ کر میں دفتر سے آ گیا اور گھر جانے کے لئے بس میں بیٹھ گیا۔ راستے میں خیال آیا کہ ایک رشتہ دار سخت بیمار ہیں، اُن کی عیادت کو جانا ضروری ہے۔ چنانچہ گلشن اقبال کے سٹاپ پر اُتر گیا۔ ان کے گھر گیا، عیادت کے بعد سوچا کچھ پیدل چل کر حسن سکوائر تک جانا چاہئے اور وہاں سے سواری لینی چاہئے۔ میں حسن سکوائر کی طرف پیدل جا رہا تھا کہ راستے میں ایک بہت خوبصورت آٹھ نو منزلہ بلند بلڈنگ دکھائی دی۔ قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ سوئی گیس کراچی کے ہیڈ آفس کی بلڈنگ ہے جو ابھی حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ میرا دل اس بلڈنگ کو دیکھنے کو چاہا اُس روز ہفتہ تھا اور دفتر کی تعطیل تھی۔ میں دفتر کی بلڈنگ کے سامنے کھڑے ہو کر اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اُسی دوران ایک سکیورٹی گارڈ جو اُسی بلڈنگ سے متعلقہ تھا، میری تجسس بھری نگاہوں کو دیکھتے ہوئے میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور پوچھنے لگا کہ آپ اس کو اتنی دلچسپی سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ جیسے یہ بلڈنگ سوئی گیس کے محکمہ کی ہے۔ اسی طرح لاہور میں بھی ایک بلڈنگ اسی محکمہ سے متعلق ہے اور میں اُسی بلڈنگ میں کام کرتا ہوں۔ میں نے گارڈ سے پوچھا کہ آج تو ہفتہ ہے، دفتر میں چھٹی ہوگی۔ کل میں اس بلڈنگ کو دیکھنے آؤں گا۔ گارڈ نے بتایا کہ آج تمام بڑے افسران آئے ہیں اور منیجنگ ڈائریکٹر صاحب بھی آئے کوئی ضروری میٹنگ ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا جنرل منیجر ایڈمن آئے ہوئے ہیں؟ وہ کہنے لگا۔ "جی!" میں نے پوچھا۔ اُن کا کیا نام ہے۔ اس نے بتایا کہ کیپٹن عارف۔

میں اُن کو نہیں جانتا تھا۔ میں نے ویسے ہی کہہ دیا کہ میرا نام اُن کو بتائیں، میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ اپنے کیبن میں گیا۔ کسی کو فون کیا، وہاں سے جواب آیا کہ بھیج دو۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اندر دفتر میں استقبالیہ پر گیا۔ میرا تعارف کروایا اور کہا کہ یہ کیپٹن صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ استقبالیہ کلرک نے میرا شناختی کارڈ مانگا۔ وہ اپنے پاس رکھ لیا اور ایک سلپ بنا کر دے دی کہ اس کو واپسی پر کیپٹن صاحب سے دستخط کروا کر مجھے دے دیں اور اپنا شناختی کارڈ لے لیں۔ میں وہ سلپ لے کر لفٹ میں بیٹھا اور ساتویں منزل پر پہنچ گیا۔ وہاں پر کیپٹن صاحب کے دفتر میں گیا تو اُن کے سیکرٹری نے کہا کہ وہ ایم ڈی کے پاس میٹنگ میں گئے ہیں، آپ تشریف رکھیں۔ میں اُن کے کمرے میں بیٹھ کر اخبار کا مطالعہ کرتا رہا۔ اخبار پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ معلوم نہیں کب کیپٹن صاحب میٹنگ سے واپس آئیں۔ میں پوری بلڈنگ کو دیکھ لیتا ہوں۔ چنانچہ میں اُن کے سیکرٹری سے واش روم کا کہہ کر اٹھا اور پوری بلڈنگ اچھی طرح دیکھ لی جو خوبصورت طریقہ سے بنائی گئی تھی اور جدید ساز و سامان سے مرصع تھی۔

میں نے کیپٹن صاحب کے سیکرٹری سے کہا کہ اس سلپ پر دستخط کر دیں۔ کیپٹن صاحب خدا جانے کب آئیں؟ اُن کے سیکرٹری نے کہا۔ آپ صرف چند منٹ اور انتظار کریں۔ آنے والے ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ اگر وہ آئیں اور پوچھیں کہ کیا کام ہے تو مجھے شرمندگی ہوگی کہ انہیں بتاؤں کہ کام کوئی نہیں تھا۔ خالی بلڈنگ دیکھنی تھی۔ ابھی میں انہی خیالات میں گم تھا کہ ایک چپڑاسی آیا اور کہا کہ کیپٹن صاحب آپ کو "بورڈ روم" میں بلا رہے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوا کہ نہ میں کیپٹن صاحب کو جانتا ہوں اور نہ کیپٹن صاحب مجھے جانتے ہیں۔ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ شاید کسی آفیسر کو ہماری کمپنی سے آنا ہو اور اس نے میٹنگ میں شرکت کرنی ہو اور وہ مجھے متعلقہ آفیسر سمجھ رہے ہوں۔ ان حالات میں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں نے چپڑاسی سے کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا بورڈ روم کی میٹنگ سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اس نے میرا نام لے کر کہا کہ آپ ہی کو بلایا جا رہا ہے۔

میں بڑے بھاری قدموں اور دھڑکتے دل کے ساتھ چل دیا۔ ایک منزل اوپر جانے کے بعد گارڈ نے مجھے ایک بڑے کمرے کے سامنے کھڑا کر دیا جس پر "بورڈ روم" لکھا ہوا تھا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک "گول میز" ہے اور اس کے گرد سوٹ اور ٹائی میں ملبوس لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے سامنے میرے کپڑے بالکل سادہ سے ہیں۔ درمیان میں ایک صاحب جن کا نام بعد میں معلوم ہوا کیپٹن عارف تھا۔ انہوں نے مجھے کہا۔ آیئے تشریف لایئے خوش آمدید اور اپنے ساتھ ایک خالی کرسی پر بٹھا لیا اور اپنے بائیں ہاتھ پر ایک صاحب جن کا نام بعد میں کرنل رشید (سپیشل اسسٹنٹ ٹو ایم ڈی) تھا باتوں میں مصروف تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہاں سرکاری دفتری ماحول ہے۔ یہ باتوں سے فارغ ہوتے ہیں تو میں ان کو اپنے بارے میں بتاتا ہوں اور اپنی پوزیشن واضح کرتا ہوں کہ میرا اس میٹنگ وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن وہ باتوں

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں بُری طرح مصروف تھے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک صاحب داخل ہوئے اور انہوں نے کہا۔ ''کارروائی شروع کی جائے''۔

کیپٹن صاحب نے کہا۔ ''کورم پورا ہو گیا ہے کارروائی شروع کریں''۔

اب میں بہت گھبرایا اور رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ دروازہ کھلا اور تین چار آدمی بڑی بڑی قابوں میں مٹی کی چھوٹی چھوٹی ہنڈیاں اور چاولوں کی ڈشیں لئے داخل ہوئے اور سب کے آگے ایک ایک ہنڈیا اور چاولوں کی پلیٹ رکھتے گئے۔ ہنڈیوں میں گوشت کا سالن تھا۔ اس کے علاوہ سلاد اور روٹیاں وغیرہ بھی تھیں۔ ان تمام چیزوں کو دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ان افسران کا کھانے کا ٹائم تھا اور انہوں نے مجھے بھی اس میں شامل کر لیا تھا۔

ابھی میں کیپٹن صاحب سے بات کرنے والا ہی تھا کہ دروازے میں سے ایک چپڑاسی داخل ہوا اور اس نے کیپٹن صاحب سے کہا کہ آپ کو ایم ڈی صاحب فوراً بلا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم صبح سے تو اُن کے پاس تھے۔ اب میں کھانا کھا کر آؤں گا لیکن چپڑاسی نے کہا کہ آپ کو فوری طور پر بلایا ہے۔ چنانچہ وہ بغیر کھانا کھائے اٹھ کر چلے گئے۔ اب مجھے اطمینان ہوا کہ میں نے اپنے ساتھ والے شخص سے پوچھا کہ آج تو ہفتہ تھا، آپ کی چھٹی نہیں تھی؟ انہوں نے کہا کہ آج چھٹی تھی لیکن ایم ڈی صاحب نے ایک میٹنگ بلوائی تھی جس میں کچھ اہم فیصلے کرنے تھے۔ کچھ دیر بعد جب میں نارمل حالت میں آیا تو میں نے اُن لوگوں کو بتایا کہ میں لاہور سے آیا ہوں اور میرا تعلق بھی اسی قسم کے ادارے سے ہے اور آج کل وہاں کے افسران بہت پریشان ہیں کیونکہ ان کو حکم دیا ہے کہ 31 دسمبر تک استعفیٰ دے دیں ورنہ ہم نکال دیں گے۔ اس پر میرے دائیں ہاتھ کی طرف بیٹھے ہوئے صاحب جن کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ سپیشل اسسٹنٹ ٹو ایم ڈی تھے، کہا کہ آج کی میٹنگ اسی سلسلے میں بلائی گئی تھی لیکن ہمارے ایم ڈی نے اس فیصلے کی توثیق نہیں کی ہے اور نہ ہی اس قانون کو ہم اپنے ادارے میں نافذ ہونے دیں گے۔ انہوں نے کہا۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ لوگ استعفیٰ نہ دیں۔ جو کمزور دل لوگ ہوں گے وہ استعفیٰ دے دیں گے اور جو مضبوط اعصاب والے ہوں گے وہ استعفیٰ نہیں دیں گے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بہت کام کی باتیں کیں ان کی باتیں سن کر مجھے ایک ''گائیڈ لائن'' مل گئی کہ میں استعفیٰ نہیں دوں گا۔ کھانے کے بعد سویٹ ڈش اور قہوہ وغیرہ کا بھی انتظام تھا۔

میں کھانا وغیرہ سے فارغ ہو کر کیپٹن صاحب کے کمرے میں گیا تاکہ ان کا شکریہ ادا کر دوں تو وہ بہت مصروف تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ میں معذرت چاہتا ہوں کہ آپ سے بات نہیں کر سکا۔ اب آپ بتائیں آپ کا کیا مسئلہ ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ یہ بلڈنگ دیکھنا چاہتا تھا اور میرا رزق مجھے یہاں کھینچ لایا۔ انہوں نے کہا یہ بات صحیح ہے میرا رزق یہاں نہیں تھا اور میں کھانا کھائے بغیر ابھی ایم ڈی صاحب کے ساتھ کہیں اور جا رہا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ آپ کے پاس جانے کے لئے سواری ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو میں آپ کو بھجوا دیتا ہوں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ نہیں مجھے سواری کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر انہوں نے اپنے سیکرٹری سے کہا کہ ان کو نیچے دروازے تک چھوڑ کر آؤ۔ یہ ہمارے مہمان ہیں۔

میں یہ سوچتا رہا کہ جہاں انسان کا رزق ہوتا ہے انسان خود پہنچ جاتا ہے اور جو خواہش سوچتا ہے وہ معجزاتی طور پر پوری ہو جاتی ہے۔

⚫

علم و تحقیق

''کیا تم نے نہیں دیکھا کیسے بنائے اللہ نے سات آسمان تہہ بہ تہہ''۔ (القرآن)

''ہر طرف خلا، ایک کے بعد دوسرا خلا، فکر کو اس کا سرا نہیں ملتا۔ تاہم اس خیال سے ڈھارس ہوتی ہے کہ اگر خلا بسیط ہے تو کوئی محیط بھی ہوگا۔

☆ شازیہ محسن

کرۂ ارض پر تنی ہوئی گنبد کی وضع کی چادر جو بادلوں، سورج چاند اور ستاروں کے پس منظر کا کام دیتی ہے آسمان کہلاتی ہے۔ اس کے نیلا نظر آنے کی وجہ یہ ہے کہ کرۂ فضائی کے گرد و غبار کے انتہائی مہین ذرات سے گزر کر آنے والی شعاعیں ہم تک پہنچتی ہیں۔ یہ ذرات نیلے رنگ کی شعاعوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں منعکس کر کے بالائی فضا میں منتشر کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں حدِ نظر تک چاروں طرف نیلا آسماں دکھائی دیتا ہے جسے ہم آسمان کہتے ہیں۔ سورج کی لمبی شعاعیں (سرخ اور زرد) تو بہت جلدی گزر جاتی ہیں لیکن چھوٹی نیلی شعاعیں فضا میں منتشر ہو جاتی ہیں۔ فضائی ذرات جتنے باریک اور مہین ہوں گے اتنی ہی کم شعاعیں منتشر ہوں گی گویا نیلا رنگ اتنا ہی شفاف ہوگا۔

قوسِ قزح (Rainbow)

روشنی بظاہر تو سفید نظر آتی ہے لیکن اصل میں یہ سات رنگوں یعنی بنفشی، نیلے، آسمانی، سبز، زرد، نارنجی اور سرخ سے مل کر بنی ہوتی ہے۔ جب روشنی شیشے کے منشور میں گزرتی ہے تو وہ سات الگ الگ رنگوں میں منتشر ہو جاتی ہے جسے طیف یا سپیکٹرم کہا جاتا ہے۔ جب بارش ہو کر رُک جاتی ہے تو ہوا میں موجود پانی کے ننھے ننھے قطرے تیرتے رہتے ہیں۔ یہ منشور کا کام دیتے ہیں۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

جب روشنی ان میں گزرتی ہے تو انعکاس، انعطاف اور انتشار تینوں عمل بیک وقت ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں قوسِ قزح ظاہر ہوتی ہے۔

آسمان کا مطلب ہے "چکی کی مانند" جس طرح چکی کے اوپر کا پاٹ گھومتا ہے اور نچلا ساکت رہتا ہے۔ اس طرح آسمان بھی بظاہر چکی کے بالائی پاٹ کی طرح گھومتا ہے اور زمین چکی کے نچلے پاٹ کی طرح ساکن رہتی ہے۔

آسمان کا لفظی مطلب "ما فوق الراس" (سر کے اوپر) یعنی وہ چیز جو ہمارے سر کے اوپر ہے، آسمان کہلاتی ہے۔ اس مطلب کی رُو سے ہمارے سر کے بالوں سے لے کر خلا کی وسعتوں تک جو چیز بھی ہے وہ آسمان ہے۔ ہمارے سر کے اوپر کیا ہے؟ وہ کون سی چیز ہے جسے آسمان کہہ سکیں؟ یہ جاننے کے لئے قرآن حکیم ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

"اور خدا ہی نے آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس سے زمین کو اسے مرنے کے بعد زندہ کیا۔ بے شک اس میں سننے والوں کے لئے نشانی ہے"۔ (القرآن)

اس آیت سے عیاں ہے کہ ہماری یہ فضا آسمان ہے کیونکہ بارش کا پانی تو اس فضا سے ہی زمین پر برستا ہے۔ اس کرہ ہوائی کے آسمان ہونے کے حق میں قرآن پاک کئی جگہ دلیل دیتا ہے۔

نیلگوں فضائی کرہ جس کے نیچے ہم رہتے ہیں، کئی تہوں پر مشتمل ہے۔ ہم ان پرتوں یا تہوں کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یعنی گیسی ترکیب کے لحاظ سے اسے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

(1) ہوموسفیئر

(2) ہیٹروسفیئر

سطح زمین سے اوپر تقریباً 80 کلومیٹر تک ہوا کی ترکیب یکساں ہے اس لئے 80 کلومیٹر تک کے فضائی کرے کو ہوموسفیئر (Homosphere) کہتے ہیں۔ جبکہ 80 کلومیٹر سے اوپر کی فضا ہیٹروسفیئر (Hetrosphre) کہلاتی ہے۔ کیونکہ اس ہوا کی ترکیب تیزی سے تبدیل ہوتی ہے۔ اس تقسیم کے علاوہ کرہ باد (ہوا) درجہ حرارت کے لحاظ سے تقسیم کیا جاتا ہے جس کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے:

(1) ٹراپوسفیئر (Trophoshere)

(2) ٹراپوپاز (Tropopause)

(3) سٹریٹوسفیئر (Stratosphere)

(4) سٹریٹوپاز (Stratopause)

(5) میزوسفیئر (Mesosphere)

(6) میزوپاز (Mesopause)

(7) تھرموسفیئر (Thermosphere)

(8) آئنوسفیئر (Ionosphere)

(9) اوزون سفیئر (Ozonesphere)

سطح زمین کی دس گیارہ کلومیٹر کی بلندی تک کی تہہ Troposhere کہلاتی ہے۔ اس کرہ میں درجہ حرارت بلندی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا ہے اور کرہ کی انتہائی بلندی پر درجہ حرارت صفر سینٹی گریڈ سے گر جاتا ہے۔ سطح زمین میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ سورج کی روشنی جذب کر کے گرم ہو جاتی ہے جبکہ Troposhere اس صلاحیت سے محروم ہے۔ گرم سطح زمین ہیٹر کے طور پر عمل کرتی ہے جس طرح ہیٹر کے قریب زیادہ گرمی ہوتی ہے اسی طرح سطح زمین کے قریب زیادہ گرمی ہوتی ہے اور جوں جوں سطح سے اوپر جائیں درجہ حرارت کم ہوتا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جون جولائی کی سخت گرمی میں بھی زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے مری کا موسم معتدل رہتا ہے۔

درجہ حرارت میں یہ تبدیلی ہر ایک ہزار فٹ کے بعد تقریباً دو سیلسیئس (1.98O°C) ہوتی ہے۔ تمام موسمی تعامل اور تبدیلیاں Troposhere میں ہوتی ہیں۔

مثلاً بارش، آندھی اور گرج چمک وغیرہ۔ Troposhere کی آخری حد پر درجہ حرارت انتہائی کم یعنی (73O°C) ہو جاتا ہے اور یہ درجہ حرارت تقریباً 2 کلومیٹر (بلندی دس سے بارہ کلومیٹر) تک یکساں رہتا ہے۔ کرہ ہوائی کی اس تہہ کو Tropopause کہتے ہیں۔ کیونکہ ٹمپریچر کی تبدیلی میں ایک وقفہ آ جاتا ہے۔ Tropopause کے اوپر درجہ حرارت بڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور تقریباً 48 کلومیٹر کی بلندی تک بتدریج بڑھتا رہتا ہے۔ اس کرے میں ہوائی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ کرہ ہوائی کے اس حصے میں اوزون گیس ہوتی ہے جو سورج سے آنے والی بالائے بنفشی شعاعوں کو جذب کرتی ہے اور خود گرم ہو جاتی ہے۔ اوزون گیس کی وجہ سے Stratosphere کے بالائی حصے میں تقریباً دو کلومیٹر تک درجہ حرارت تبدیل نہیں ہوتا۔ درجہ حرارت کی اس یکسانیت کی وجہ سے اس کرے کو Stratopause کہتے ہیں۔

Mesopause سے لے کر نوسو کلومیٹر کی بلندی تک کرہ ہوائی Thermosphere کہلاتا ہے۔ یہ گرم کرہ ہے اور اس کا ٹمپریچر بلندی کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ سورج سے آنے والی بالائے بنفشی شعاعیں (Altra Vollet Rays) اور Cosmic Rays تھرموسفیئر میں جذب ہوتی ہیں۔ Thermosphere کی بالائی تہہ یہاں درجہ حرارت انتہائی زیادہ (1500 O°K - 2000 O°K) ہو جاتی ہے۔ یہ Thermopause کہلاتا ہے۔ Theropause کے اوپر گیس آئنوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ گیسیں آکسیجن، نائٹروجن اور ہائیڈروجن ہیں جو آئنی (Ionized) حالت میں پائی جاتی ہیں۔ ان Ions کی وجہ سے اس کرے کو Ionosphere کہتے ہیں۔

ہمارے کرہ ہوائی میں سطح زمین سے اوپر 15 کلومیٹر سے 50 کلومیٹر تک دوسری گیسوں کے ساتھ اوزون (Ozone) گیس بھی پائی جاتی ہے۔ یہ گیس آکسیجن کے تین ایٹموں پر مشتمل ہے جو کہ بالائے بنفشی شعاعوں کی موجودگی میں ایٹمی آکسیجن (O-2) اور آکسیجن گیس (O_2) کے کیمیائی تامل سے بنتی ہے۔ اوزون قدرتی طور پر قیام پذیر نہیں ہے کیونکہ بالائے بنفشی شعاعوں کو جذب کر کے یہ آکسیجن گیس میں بدل جاتی ہے۔ یوں یہ بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہے۔

بنتے وقت بھی بالائے بنفشی شعاعوں کو جذب کرتی ہے اور ٹوٹتے وقت بھی ہماری فضا کے باہر سورج اور زمین کے ہر طرف شمسی ہوا (Solar Wind) بین الستارہ جاتی گرد، شہابیے اور سورج کے گرد گھومنے والے ذرات موجود ہیں۔ جب ہم اپنے سر سے اوپر دیکھتے ہیں تو ہمیں نیلا فضائی کرہ نظر آتا ہے۔ ہماری نظر کی حد اتنی کم ہے کہ کرہ باد سے باہر نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ ہمیں اوپر جو کچھ نظر آتا ہے وہ آسمان ہے۔

سورۃ الملک میں ارشادِ ربانی ہے:

"اس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے۔ اے دیکھنے والے تو خدائے رحمان کے بنانے میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ بھلا تجھ کو آسمان میں کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر اٹھا تو نظر ہر بار تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔"

آسمان کے متعلق قدیم خیال یہ ہے کہ یہ ایک ٹھوس کرہ ہے۔ اس کے اوپر خلا اور خلا کے بعد دوسرا کرہ۔ اس طرح آسمانی کرے ایک دوسرے کے اوپر اس طرح موجود ہیں کہ دو آسمانوں کے درمیان وسیع خلا حائل ہے لیکن قرآن کے مطابق حقیقت کچھ اور ہے۔ آسمان تہہ بہ تہہ ایک دوسرے کے اوپر موجود ہیں۔

"کیا تم نے نہیں دیکھا کیسے بنائے اللہ نے سات

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آسمان تہہ بہ تہہ"۔(القرآن)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کا ذکر کیا ہے۔اس بارے میں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ سات کا عدد کثرت تعداد کو ظاہر کرتا ہے نہ کہ ایک مستقل مقدار کو اور تقریباً تمام علماء دین اس بات پر متفق نظر آتے ہیں۔

زمین میں ہمارے لئے کھانے کے لئے اناج اگتا ہے لیکن زمین کی یہ پیداوار بارش کی محتاج ہے جو کہ آسمان سے برستی ہے۔بارش فضا سے نائٹروجن اور کاربن کے ایسے مرکبات لاتی ہے جو کہ پیداوار کے لئے ضروری ہیں۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے آسمان کی اہمیت یوں بیان فرمائی ہے۔

"اور تمہارا رزق آسمانوں میں ہے اور جس کا تم کو وعدہ دیا گیا ہے سو آسمان و زمین کے پروردگار کی قسم وہ ایسا سچا ہے جیسا تم بولتے ہو۔"(القرآن)

ہمارے سروں کے اوپر اللہ تعالیٰ نے ایک مضبوط اور محفوظ چھت بنائی ہے۔بالائے بنفشی شعاعیں (Altra Voilet Rays) ہمارے لئے انتہائی نقصان دہ ہیں لیکن فضا میں موجود اوزونوسفیئر ان شعاعوں کو جذب کر لیتا ہے اور سطح زمین تک بہت ہی کم شعاعیں پہنچ پاتی ہیں۔اوزونوسفیئر کے باعث ہم ان مہلک شعاعوں سے محفوظ رہتے ہیں۔بالائے بنفشی شعاعوں کے علاوہ سورج، کاسمک شعاعیں (Cosmic Rays) اور تابکاری شعاعیں (Radioactive Rays) بھی زمین پر بھیج رہا ہے۔جو کہ بالائے بنفشی شعاعوں ہی کی طرح زندگی کے لئے نقصان دہ ہیں۔آئینوسفیئر (Ionosphere) ان شعاعوں کو روکتا ہے اور یوں ہمیں تابکاری شعاعوں جیسی مہلک شعاعوں سے بچاتا ہے۔مثلاً لیلفا بیٹا اور گیما وغیرہ۔

اس کے علاوہ شہابیے اگر فضا میں جل کر راکھ نہ ہو جائیں تو سطح زمین پر تباہی پھیلا سکتے ہیں۔ہوا کی رگڑ اور آکسیجن گیس کی موجودگی شہابیوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔اگر یہ کرہ فضائی نہ ہوتا تو شہابیوں کی وجہ سے چاند کی طرح زمین کی سطح پر جگہ جگہ گہرے گڑھے ہوتے اور کم از کم سطح زمین پر زندگی کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔فضا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی اگرچہ ہمارے لئے نقصان دہ ہے لیکن کاربن ڈائی آکسائیڈ کی انتہائی موزوں مقدار (0.03%) جو کہ فضا میں موجود ہے، ہمارے لئے زندگی کا پیغام ہے۔سورج کی شعاعیں جو کہ کم طول موج (روشنی) کی ہوتی ہیں۔سطح زمین سے ٹکرانے کے بعد ان کا طول موج (Lenght Wave) زیادہ حرارتی ہو جاتا ہے۔یوں سورج کی روشنی کی توانائی حرارتی توانائی میں بدل جاتی ہے۔حرارت کی یہ شعاعیں فضا میں سے باہر فرار ہونے کی کوشش کرتی ہیں لیکن فضا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) گیس ان شعاعوں کو روک لیتی ہے اور یوں سطح زمین کا درجہ حرارت اس حد تک قائم رہتا ہے جو زندگی کے لئے ضروری ہے۔فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اس عمل کو سبز مکانی اثر (Green House Affect) کہتے ہیں۔اگر یہ فضا نہ ہوتی تو درجہ حرارت رات کو انتہائی کم اور دن کو انتہائی زیادہ ہو جاتا اور دونوں صورتوں میں زندگی کا وجود ناممکن ہے۔اگر ہم اس فضا سے باہر نکلیں تو ہمارے چاروں طرف ستارے بکھرے پڑے ہیں جو ہماری اپنی کہکشاں کے ہیں۔

ستاروں سے آنے والی روشنی زمینی فضا سے گزرنے کے بعد منعطف ہو جاتی ہے۔یہ ستارے جہاں نظر آتے ہیں وہ ان کی اصل جگہ نہیں ہوتی۔یہ بھی ایک سراب ہے۔ستارے ہوتے کہیں اور ہیں لیکن دکھائی کہیں اور دیتے ہیں......

ہیں کواکب کچھ نظر آتے کچھ......

ممکن ہے ستاروں کو قریبی آسمان میں سجا دینے سے مراد یہی انعطاف ہو جو ہماری نیلگوں فضا میں ہوتا ہے۔

آسمان کی جو کہکشاں ہے جس میں ستارے نظر آتے ہیں یہ ہماری اپنی دودھیا کہکشاں (Milky Way) ہے۔اگر ہم کسی اور سیارے یا چاند پر چلے جائیں تو وہاں نیلگوں فضا نہیں ہوگی اور آسمان سیاہ رنگ کا ہوگا اور زمین ہمارے سر کے اوپر یعنی آسمان میں تیر رہی ہوگی۔اس لئے تو شاید اقبالؒ نے کہا ہے۔

شاید کہ زمیں ہے کسی اور آسماں کی
تو جسے سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں آسمانی برج کا ذکر کیا ہے، برج کا مطلب گنبد ہے۔ستاروں کے جھرمٹ کو بھی برج کہتے ہیں۔"قسم ہے آسمان کی جس میں برج ہیں"۔(القرآن)

آسمان فضا سے فضا تک پھیلے ہوئے ہیں، یہ بے کراں کائنات کی ان وسعتوں تک موجود ہیں جن کا ذہن انسان میں کوئی تصور موجود نہیں۔ان فاصلوں کے لئے نوری سال (Light year) نہیں بلکہ نوری صدیاں درکار ہیں۔سر سے شروع ہونے والے آسمان کی کہانی کائنات کے بحر بے کراں میں کہیں گم ہو گئی ہے۔یہ پرانی روایت ہے کہ انسان جن آسمانی وسعتوں کو ڈھونڈتے نکلتا ہے خود ان میں گم ہو جاتا ہے لیکن قرآن ایک ایسے آسمان کی بات کرتا ہے جو سب پر محیط ہے۔وہ سب پر حاوی ہے جس کے بعد کوئی آسمان نہیں۔

مختار مسعود "سفر نصیب" میں لکھتے ہیں:

"ہر طرف خلا، ایک کے بعد دوسرا خلا، فکر کو اس کا سرا نہیں ملتا۔تاہم اس خیال سے ڈھارس ہوتی ہے کہ اگر خلا بسیط ہے تو کوئی محیط بھی ہوگا۔خلاؤں کے بعد شش جہات میں اوپر نیچے، دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر مقام پر

قربتوں میں بھی فاصلے ہیں

ہماری روزمرہ زندگی میں معاشرتی المیے، حالات اور واقعات کے موضوع پر کہانیاں لکھنے والے، ادیب صحافی اور مصنف **حفیظ بھٹو** جن کی تحریر میں ایک اصلاحی پیغام نمایاں نظر آتا ہے۔ان کی حالیہ کتاب "قربتوں میں بھی فاصلے ہیں" اس چیز کی عکاسی کرتی ہے۔پیار محبت میں گنی لپٹی زندگی سے ہمکنار ایک آزاد خیال لڑکی جو حالات میں پھنس کر رہ جاتی ہے اس کو کس خوش اسلوبی، عقل و دانش اور فہم و فراست کے ساتھ زمانے کے بھنور سے نکال کر اسے دائرہ اسلام میں لا کھڑا کیا ہے۔

کتاب ان شاءاللہ ماہ فروری 2015ء میں چھپ کر منظر عام پر آ جائے گی۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ داستان -- 26-پٹیالہ گراؤنڈ، میکلوڈ روڈ، لاہور فون: 042-37356541

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پھولوں کی بات

نازیہ لیاقت (ایم اے انگلش)

ہر سُو جب کہرام مچا ہو
نقاروں کا شور بپا ہو

تم پھولوں کی بات کہو
تم پھولوں کی بات کہو

آئے جھونکے بہکے بہکے
گیندا بیلا جوہی مہکے

کوئل کوکی پنچھی چہکے
تم پھولوں کی بات کہو

میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی
پیڑ پہ بیٹھی مینا بولی

نیم پہ اب پکی تھی نبولی
تم پھولوں کی بات کہو

کوئی چلائے برچھی بھالا
کوئی گورا کوئی کالا

کوئی بُنے مکڑی کا جالا
تم پھولوں کی بات کہو

کون بُرا ہے کون اچھا ہے
دنیا اک گورکھ دھندا ہے

کیا جھوٹا ہے کیا سچا ہے
تم پھولوں کی بات کہو

چاہے شور و غل ہو بھاری
دب جائے آواز تمہاری

بہرے ہوں یہ سب نر ناری
تم پھولوں کی بات کہو

تلخیص

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

مالِ مفت، جنس اور دروغ
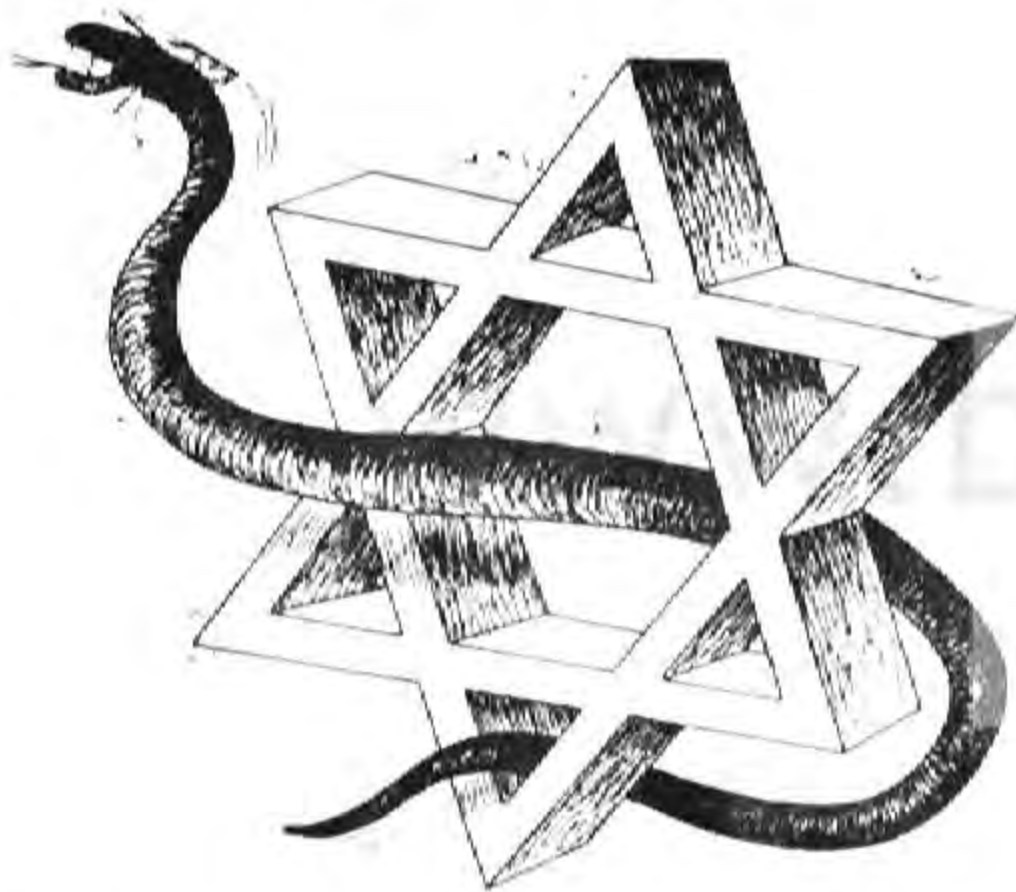
جس طرح بن مناشے نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اسے معلوم ہے کہ ”سب لاشیں کہاں دفن کی گئی ہیں“۔ اسی قسم کے دعوے میکسویل بھی اپنے اسرائیل کے دوروں کے دوران کیا کرتا تھا اور یہ ایک ایسا دعویٰ تھا جسے موساد کے لئے ہضم کرنا ممکن نہ تھا۔

قسط: 9 ☆ ------------------ 0300-4154083 ------------------ میاں محمد ابراہیم طاہر

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مارچ 1985ء کی اُس صبح کو حالات کچھ مختلف نظر آ رہے تھے۔ جب اری بن مناشے تل ابیب سے برٹش ائرلائن کی لندن آنے والی پرواز میں سوار ہوا۔ جہاز کے اندر حلال (کوشر) ناشتہ کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ زندگی میں اتنے اور ایسے اچھے دن تو کبھی نہیں آئے تھے۔ وہ نہ صرف بے حساب دولت کما رہا تھا بلکہ ڈیوڈ کمشے سے ایران کو اسلحہ بیچنے اور اسلحہ ڈیلروں سے سوداباز ی کرنے کے نتے نئے گر بھی سیکھ لئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس نے اسرائیلی سیاستدانوں اور مختلف انٹیلی جنس کے سربراہوں سے اپنے رابطے بھی مضبوط بنا لئے تھے۔

بن مناشے کے اپنے الفاظ میں "میرے سابقہ شریک کار ساتھیوں کی نسبت اسلحہ ڈیلروں کی اکثریت کی حیثیت میرے اردگرد ناچنے والے رقاصوں کی تھی"۔ اس نے مسئلے کی اصل بنیاد تلاش کر لی تھی۔ یہ تمام دردسری اسرائیل کی لبنان میں مہم جوئی سے پیدا ہوئی تھی جس سے بالآخر اسرائیل نے، خرابیٔ بسیار اور شرمندگی کے بعد، علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ سیاستدانوں نے اب پی ایل او (PLO) تحریک آزادیٔ فلسطین کے خلاف انٹیلی جنس ایجنسیوں کو بے رحمی کے ساتھ جنگ شروع کرنے کی آزادی دے دی تھی کیونکہ وہ اسرائیل کی تمام مشکلات اور مصیبتوں کا ذمہ دار پی ایل او کو ہی سمجھتے تھے۔ اس کے نتیجے میں کئی ایسے سکینڈل سامنے آنے لگے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ دہشت قرار دے کر بے شمار فلسطینیوں اور ان کے خاندانوں کو سفاکی اور بے رحمی سے ذبح کر دیا گیا تھا۔ اس سے عام اسرائیلی پبلک اور عوام میں بے پناہ بے چینی اور اضطراب نے جنم لے لیا (ردعمل کے خوف سے)۔ چنانچہ پبلک کے دباؤ پر حکومت نے اس بربریت، ظلم وزیادتی کی انکوائری کے لئے "موساد" کے سابق سربراہ یزہاک ہوفی کی سربراہی میں کمیشن قائم کر دیا۔ اس کمیشن نے یہ نتیجہ نکالا کہ عدالت کے سامنے انٹیلی جنس کے ایجنٹ لگاتار جھوٹ بولتے رہے ہیں کہ مشتبہ اور مبینہ دہشت گردوں سے اعتراف جرم کرانے کے لئے وہ ظلم وجبر اور سفاکی کے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے رہے ہیں۔ کمیٹی نے آئندہ کے لئے "مناسب طریقِ کار" اپنانے کی سفارش کر کے اپنا کام نبٹا دیا۔

لیکن بن مناشے کو علم تھا کہ اعتراف جرم کرانے کے لئے تشدد اور زیادتی وظلم کے پرانے حربے اب بھی جاری ہیں۔ اُس کے اپنے الفاظ میں۔ "شکر ہے میں اب ایسی گھناؤنی اور بھیانک صورتِ حال سے الگ ہوں"۔ وہ اب جو کچھ کر رہا تھا، ایران کو اسلحے کی سپلائی کہ زیادہ سے زیادہ عراقیوں کو قتل کر سکیں، اپنے پہلے کام سے "مختلف" سمجھتا تھا۔ اسے بیروت کے یرغمالیوں کی بھی کوئی فکر نہ تھی، جن کی رہائی کے نام پر وہ ہتھیاروں اور اسلحے کی خرید وفروخت میں مصروف تھا۔ اس کے لئے سب سے اہم وہ پیسہ تھا جو وہ ان سودوں سے کما رہا تھا۔ محکمے سے کمشے کے چلے جانے کے بعد بھی بن مناشے کو یقین تھا کہ روپے کی ریل پیل اُس وقت تک اسی طرح جاری رہے گی تاوقتیکہ وہ خود اسے روک دے اور اس کاروبار سے اسی وقت الگ ہوگا۔ جب وہ ارب پتی بن چکا ہوگا۔ اُس کے حساب سے "اورا" (ORA) کا کاروبار اب اربوں ڈالر تک پہنچ چکا تھا اور زیادہ تر پیسہ اُس مکان کے ذریعے پیدا کیا جا رہا تھا جو لندن کے نواح میں واقع تھا اور جہاں سے اورا نکولس ڈیویز کے ذریعے انٹرنیشنل آپریشن چلا رہا تھا۔

بن مناشے کو یہ بھی علم تھا کہ ڈیویز، بطور فارن ایڈیٹر، دی مرر، اپنی سالانہ 65 ہزار پونڈ تنخواہ کے علاوہ اورا کے کاروبار سے بے پناہ دولت کما رہا ہے۔ اس کی ایک مہینے کی کمیشن اس کی سالانہ تنخواہ کے برابر بن جاتی تھی۔ بن مناشے کو اس بات کی فکر نہیں تھی کہ ایک اخبار

نویس "کیک کا ایک فالتو ٹکڑا لے رہا ہے۔ اِدھر اُدھر کے لئے ابھی بھی کافی بچا ہوا تھا۔ اب بھی شمپین پینے اور موج میلہ کرنے کا وقت تھا"۔

رابرٹ میکسویل، اخبار "دی مرر" کا مالک، اپنے اخبار کی سب سے اونچی منزل پر واقع اپنے دفتر میں اپنے مہمانوں کے لئے چشم براہ تھا۔ اس نے اپنے مہمانوں کو ائرپورٹ سے لانے کے لئے لیموزین کار بمعہ ڈرائیور انتظام کر رکھا تھا۔ اس سے بن مناشے نے محسوس کیا کہ ایک امیر کبیر کاروباری شخصیت، میکسویل کی نظروں میں اُس کی کتنی اہمیت اور وقعت ہے۔ کار میں میکسویل سے ملاقات کے لئے ناہوم ایڈمونی ڈائریکٹر جنرل موساد نے بھی بن مناشے کے ساتھ جانا تھا، جو برٹش ائرلائن کی فلائٹ کے ایک گھنٹہ بعد تل ابیب سے اسرائیلی ائرلائن ایل آل (Elal) سے لندن آ رہا تھا۔ بن مناشے نے ایڈمونی کے انتظار کے لئے ہیتھرو ائرپورٹ پر ہی ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران وہ اس بات پر غور کرتا رہا کہ موساد نے کتنے بڑے نواب (میکسویل) کو اپنا مخبر بنا لیا ہے۔

میکسویل نے اپنی خدمات موساد کے لئے اُس وقت پیش کی تھیں جب اس نے 1984ء میں اپنے یروشلم کے دورے کے دوران وزیراعظم شیمون پیریز (Shimon Peres)، جس نے نئی نئی مخلوط حکومت بنائی تھی، ملاقات کی تھی۔ پیریز ایک متکبر اور جابر قسم کا آدمی تھا لیکن میکسویل کو اسرائیل سے ہمدردی تھی اور اس نے اسرائیل کی معیشت کی بحالی کے لئے کئی ملین ڈالر دینے کی پیشکش بھی کی تھی۔ وہ بڑا شیخی خورا، باتونی لاف زن تھا اور اس نے وزیراعظم کو کئی گندے لطیفے بھی سنائے تھے جبکہ پیریز صرف زیرلب مسکراتا ہی رہا تھا۔

اس چیز کا احساس کرتے ہوئے کہ میکسویل نے مشرقی یورپ میں بڑے اعلیٰ سطح کے تعلقات بنا رکھے ہیں، پیریز نے اُس کی ایڈمونی سے ملاقات کا انتظام کرا دیا تھا۔ یہ میٹنگ یروشلم کے کنگ ڈیوڈ ہوٹل کے صدر کے لئے مخصوص رہائشی حصے میں ہوئی، جہاں میکسویل ٹھہرا ہوا تھا۔ میکسویل اور ایڈمونی، دونوں کا خاندانی پس منظر مشرقی یورپ سے وابستہ تھا، لہٰذا دونوں کی یہ خصوصیت انہیں اور بھی قریب لے آئی۔ میکسویل زیکوسلواکیا میں پیدا ہوا تھا۔ دونوں کے دلوں میں صیہونیت کی خدمت کے جذبات موجزن تھے اور دونوں کا ایمان تھا کہ خدا نے اسرائیل کو زندہ رہنے کا حق بخشا ہے۔ دونوں ہی اچھے کھانے اور بہترین شراب کے رسیا تھے۔

ایڈمونی کو میکسویل کے اس خیال سے مکمل اتفاق تھا کہ امریکہ اور روس دونوں ہی پوری دنیا کو اپنے زیراثر لانے کے خواہشمند ہیں لیکن دونوں کا طریق کار اور طرزِ عمل ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ روس دنیا میں انتشار و خلفشار کو ہوا دینا اپنی پالیسی کا حصہ سمجھتا ہے جبکہ واشنگٹن دنیا کو "دشمن" اور "دوست" کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اُسے قوموں کے نظریاتی اور اختلافی تضادات سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میکسویل نے ایڈمونی کو کئی اور بھی خفیہ باتیں بتائیں، مثلاً امریکن خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے چین کی خفیہ ایجنسی سے روابط قائم رکھے ہیں جو خود امریکن وزارتِ خارجہ کو پسند نہیں ہیں کیونکہ یہ روابط مستقبل کے سفارتی اور سیاسی معاملات میں مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔

اخباری ٹائکون نے ایڈمونی کے سامنے دو اشخاص کی بڑی دلچسپ تصویر پیش کی۔ ایک صدر رونالڈ ریگن جس کے بارے میں میکسویل نے بتایا کہ صدر ہمیشہ پُرامید نظر آتا ہے اور ایک ہوشیار سیاستدان کی طرح اپنے جذبات وخیالات کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ مڈل ایسٹ کے بارے میں اُس کی پالیسی اسرائیل کے لئے خوشگوار نہیں تھی۔ صدر ریگن سے ملاقات کے بعد میکسویل

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

نے یہ نظریہ قائم کیا تھا۔

میکسویل نے سی آئی اے کے سربراہ ولیم کیسی سے بھی ملاقات کی تھی۔ اُس کے خیال میں کیسی کے خیالات بڑے پست اور وہ بھی اسرائیل کا دوست دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کیسی اپنی ایجنسی سی آئی اے کو پرانی طرز پر چلا رہا تھا جو موجودہ بین الاقوامی حالات سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ کیسی، میکسویل کی نظر، مڈل ایسٹ کے عربوں کے عزائم کا غلط اندازہ لگا رہا تھا۔

میکسویل کے یہ خیالات سو فیصد ناہوم ایڈمونی کے خیالات سے مطابقت رکھتے تھے۔ اس میٹنگ کے بعد دونوں، ایڈمونی کی بغیر شناخت کی کار میں موساد کے ہیڈ کوارٹرز کی طرف روانہ ہوئے، جہاں ڈائریکٹر جنرل نے ذاتی طور پر دفتر کا دورہ کرایا اور میکسویل کو وہاں پر موجود سہولیات سے روشناس کرایا۔

اب ایک سال کے بعد 15 مارچ 1985ء کو ان کی دوبارہ ملاقات ہونے جارہی تھی۔

لندن کے ہائی ہولبورن کے علاقے میں واقع "مرز" اخبار کے ہیڈ کوارٹر میں موجود میکسویل کے دفتر میں جب تک ایڈمونی اور بن مناشے داخل نہیں ہوگئے، ان کے میزبان نے اعلان نہیں کیا کہ ان کے ساتھ ہیکل، بسکٹ پیسٹری کھانے اور کافی پینے میں ایک اور شخصیت بھی شامل ہوگی۔

جس طرح ایک مداری اپنے ہیٹ سے خرگوش نکال کر سب کو حیران کردیتا ہے اسی طرح میکسویل نے اچانک دنیا کی طاقتور ترین خفیہ ایجنسی، روس کے بی جی (KBG) کے وائس چیئرمین وکٹر چربکوف کو اپنے مہمانوں سے متعارف کرایا۔ بن مناشے نے بعد میں اعتراف کیا۔ "کسی برطانوی اخبار کے دفتر میں کے بی جی کے ایجنٹ کی موجودگی بڑے اچنبھے کی بات تھی لیکن روس کے صدر گورباچوف کے دور میں برطانوی مارگریٹ تھیچر کی حکومت کے ساتھ بڑے دوستانہ تعلقات تھے لہٰذا چربکوف کی برطانیہ میں موجودگی قابل قبول تھی"۔

لیکن قابل بحث یہ بات تھی کہ تھیچرازم کے بانی اور آزادانہ تجارت کے اصول کے پرچارک نے میٹنگ کا ایجنڈا کیا رکھا تھا۔ میکسویل کے دفتر کی ہاتھ سے منڈھے چمڑے کی کرسیوں پر پاؤں پسار کر ایڈمونی اور بن مناشے نے بات چیت شروع کی۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اگر بڑی بڑی رقوم، مختلف کرنسیوں میں، روسی بینکوں میں منتقل کردی جائیں تو کیا وہ وہاں محفوظ ہوں گی؟ یہ رقوم اورا کے منافع کی تھیں جو کمپنی نے امریکی ہتھیاروں کی ایران کو فروخت سے کمایا تھا۔

چربکوف نے پوچھا۔ "کتنی رقم ٹرانسفر ہوگی؟"

بن مناشے نے جواب دیا۔ "چار سو پچاس ہزار ملین امریکن ڈالر، اسی طرح کی مزید رقوم بھی ٹرانسفر ہوں گی۔ ایک بلین یا اس سے بھی زیادہ"۔

چربکوف نے میکسویل کی طرف دیکھا کہ کیا وہ بھی سن رہا ہے۔ میکسویل نے پُرجوش انداز میں سر ہلا دیا اور چربکوف کو آنکھ مار کر کہا۔ "یہ معمہ ہے، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا"۔

بن مناشے کے نقطۂ نظر میں اس ڈیل میں ایک اور خوبی کی بات یہ تھی کہ اس میں کوئی مڈل مین (وچولا) نہیں جو ان کی کمیشن کا ایک حصہ لے اڑے۔ "اس میں صرف میکسویل کے لمبے ہاتھ اور چربکوف شامل ہیں، چربکوف کو اپنے عہدے کی وجہ سے وسیع اختیارات حاصل ہیں جو اس بات کی گارنٹی ہے کہ روسی حکومت ان کا پیسہ چوری نہیں کرسکے گی۔ لہٰذا اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ 450 ملین ڈالر کی رقم کریڈٹ سوئس بینک سے ہنگری میں بینک آف بوڈاپسٹ میں ٹرانسفر کردی جائے۔ وہ بینک روسی بلاک کے دوسرے بینکوں میں رقم تقسیم کردے گا۔

اس سودے بازی کو مکمل کرانے میں رابرٹ

میکسویل کی فیس 8 ملین ڈالر طے ہوگئی۔ ڈیل کی تکمیل پر سب نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔ میکسویل نے روس کے آئندہ سوشلزم سے کیپٹلزم کی طرف رخ موڑنے کی خوشی میں سب کو شیمپین کی دعوت دی۔ بعدازاں اس کے مہمانوں کو اس کے اپنے ہیلی کاپٹر کے ذریعے ہیتھرو ائرپورٹ روانہ کردیا گیا، تاکہ وہ اپنی اپنی فلائٹ پکڑ کر گھروں کو جاسکیں۔

ماسوائے نکولس ڈیویز کے "دی مرز" کی اتنی بڑی بلڈنگ میں کسی صحافی کے کان میں بھنک تک نہیں پڑسکی کہ عین ان کی ناک کے نیچے سے اتنی بڑی خبر گزر گئی ہے اور جلد ہی اسی نوعیت ایک دوسری سٹوری بھی ان کے علم کے بغیر نکل جائے گی کیونکہ میکسویل اسرائیل کے تحفظ کی خاطر صحافت کے پردے میں انہیں اندھیرے میں رکھ رہا تھا۔

موساد کے ساتھ تعلقات قائم ہونے کی ابتدا میں ہی اس بات پر اتفاق کرلیا گیا تھا کہ خفیہ خبریں حاصل کرنے اور اندر کے رازوں تک رسائی میں میکسویل موساد کا بہت بڑا اثاثہ ہے۔ اسرائیل کی انٹیلی جنس کمیونٹی کے ایک حاضر سروس افسر کے الفاظ میں:۔

"خفیہ اور پیچیدہ کاروباری معاملات کو سلجھانے میں میکسویل کی خدمات ناقابل فراموش تھیں۔ اُس نے موساد کے لئے انتہائی اعلیٰ سطح تک پہنچنے کے دروازے کھلوا دیئے تھے۔ یہ اُس کے اخبارات کی طاقت تھی دنیا بھر کے صدور اور وزرائے اعظم کے دروازے اس کے لئے کھلے رہتے تھے۔ اُسے ایک عظیم صحافی سمجھتے ہوئے وہ اس سے کھل کر بات چیت کرلیتے تھے۔ انہیں کبھی شک ہوا ہی نہیں تھا کہ ان کی مہیا کردہ اطلاعات و معلومات کہاں پہنچ رہی ہیں۔ وہ ان اعلیٰ شخصیات سے گپ شپ کے انداز میں خفیہ معلومات حاصل کرلیتا تھا۔ اُسے سوال کرنے اور جواب لینے کا ہنر آتا تھا۔ اگرچہ اُس نے موساد سے کوئی تربیت حاصل نہیں کی تھی لیکن اُسے گائیڈ لائن مہیا کردی جاتی تھی کہ کن امور کے بارے میں سوال کرنے ہیں۔"

14 ستمبر 1986ء کو میکسویل نے ناہوم ایڈمونی، ڈائریکٹر جنرل موساد کے براہ راست خفیہ نمبر پر ٹیلیفون کیا اور یہ خوفناک اور تباہ کن خبر سنائی کہ کولمبیا کے ایک فری لانس جرنلسٹ اوسکر گویریو نے "دی مرز" کے سنسنی پھیلانے والے پرچے "سنڈے مرز" کے ایک صحافی سے ایک انتہائی سنسنی خیز سٹوری کی اشاعت کے لئے رابطہ قائم کیا ہے جو شائع ہونے کی صورت میں ایٹمی پلانٹ ڈیمونا کی رازداری اور احتیاط کا تمام پردہ چاک کردے گی۔ گوریرو کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہ کہانی ایٹمی پلانٹ پر کام کرنے والے ایک ٹیکنیشن سے حاصل کی ہے جو پلانٹ پر کام کرنے کے دوران خفیہ طور پر اس کی تصویریں اور دوسرے ثبوت جمع کرتا رہا ہے تاکہ دنیا پر ثابت کیا جاسکے کہ اسرائیل ایک بڑی عالمی ایٹمی قوت بن چکا ہے، جس کے پاس مختلف نوعیت کے ایٹمی تباہی پھیلانے والے سَو کے قریب بم موجود ہیں۔

جس طرح کہ موساد کے چیف کو آنے والی تمام فون کالیں ریکارڈ ہوجاتی تھیں، یہ کال بھی ریکارڈ ہوگئی۔ انٹیلی جنس کے ایک افسر کے مطابق ٹیپ میں اس طرح کی گفتگو ریکارڈ تھی۔

ایڈمونی: "اُس ٹیکنیشن کا نام کیا ہے؟"

میکسویل: "وانونو، موردادقائی وانونو"۔

ایڈمونی: "وہ آج کل کہاں ہے؟"

میکسویل: "میرے خیال میں سڈنی، آسٹریلیا میں"۔

ایڈمونی: "میں آپ کو واپس کال کرتا ہوں"۔

ایڈمونی نے سب سے پہلے وزیراعظم شمعون پیریز کو فون کیا، جس نے حکم دیا۔ "صورت حال کو سنبھالا

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جائے"۔ ان الفاظ کا مطلب تھا کہ پیئرز نے موساد کو ایک اور بے رحم قسم کے آپریشن کی اجازت دے دی۔

ایڈمونی کے سٹاف نے جلد ہی اس بات کی تصدیق کر دی کہ وانونو ایٹمی پلانٹ "ڈیمونا" پر فروری 1977ء سے نومبر 1986ء تک کام کرتا رہا ہے۔ وہ "ماخون دو" پر ڈیوٹی دیتا تھا جو دس پیداواری یونٹوں میں سب سے زیادہ خفیہ تھا۔ اس کی بلڈنگ میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہ تھا اور یہ ایک گودام کی صورت میں نظر آتی تھی۔ اس کی کنکریٹ کی دیواریں اتنی موٹی اور مضبوط تھیں کہ سٹلائٹ کے ذریعے طاقتور کیمرہ بھی اس کے اندر کی تصویر نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے اندر کی تعمیر جنگی مورچوں جیسی تھی۔ نیز اندر ایسی مصنوعی دیواریں تھیں جو نیچے چھٹے تہہ خانے تک جانے والی لفٹوں کی طرف رہنمائی کرتی تھیں جہاں ایٹمی ہتھیار بنائے جاتے تھے۔

وانونو (Vanunu) کی سیکورٹی کلیئرنس ایسی تھی کہ وہ ماخون 2 کے ہر حصے میں بلا روک ٹوک جا سکتا تھا۔ اس کا خصوصی سیکورٹی پاس، نمبر 520، جس پر اس کے دستخط ثبت تھے اور جو اسرائیلی سرکاری سیکریٹ ایکٹ کے تحت جاری شدہ تھا۔ بحیثیت کنٹرولر نائٹ شفٹ کوئی بھی اسے چیک کرنے کا اختیار نہیں رکھتا تھا۔

سراسیمہ اور پریشان حال موساد کے سربراہ ایڈمونی کو بتایا گیا کہ یقینی طور پر کچھ مہینوں تک وانونو کارخانہ 2 (ماخون ٹو) کے نقشوں، کنٹرول پینل، دستانوں کے بکسے، ایٹمی بم بنانے کی مشینوں کی تصویریں لیتا رہا ہوگا۔ ملنے والی شہادت سے پتہ لگتا تھا کہ وہ اپنی فلمیں کپڑوں کی الماری میں چھپا کر رکھتا اور باہر سمگل کرتا رہا ہوگا۔ یہ کام ایسی جگہ سے ہوتا رہا جو اسرائیل کو سب سے محفوظ ترین جگہ تھی۔

ایڈمونی اپنے سٹاف سے جاننا چاہتا تھا کہ وانونو یہ سب کام کرنے میں کیسے کامیاب ہوا اور پتہ نہیں اس نے مزید کیا کچھ کیا ہوگا؟ فرض کیا اس نے پہلے ہی تمام میٹریل سی آئی اے کو دکھا دیا ہو؟ یا روس کے خفیہ اداروں، برطانوی، چینی جاسوس ایجنسیوں کو؟ اس کا نقصان تو ناقابلِ تصور ہے۔ اسرائیل کو دنیا کے سامنے جھوٹے کے طور پر ننگا کر دیا جائے گا۔ ایک ایسا جھوٹا ملک جو اپنے ملک کے ایک بڑے حصے کی تباہی کا خود ذمہ دار ہوگا۔

وانونو کون تھا؟ وہ کس کے لئے کام کر رہا تھا؟

ان سوالوں کے جواب جلدی ہی ملنے لگے۔ وانونو مراکش کا یہودی تھا جو 13 اکتوبر 1954ء کو مراکش میں پیدا ہوا۔ جہاں اس کے والدین متوسط درجے کے دکاندار تھے۔ جب 1963ء میں عرب دنیا میں صیہونیت کے خلاف نفرت کے جذبات ایک دفعہ پھر ابھرے تو مراکش میں بھی امن و امان کی صورت حال پیدا ہو گئی تو اس کا خاندان ہجرت کر کے اسرائیل چلا گیا اور نیگیو صحرا کے قصبے بیئرشیباء میں رہائش اختیار کی۔

موردا خائی کی بچپن کی زندگی بڑے نامساعد حالات میں گزری تھی، جیسا کہ اس کے دوسرے ہمجولیوں کی گزر رہی تھی۔ جب اس کا وقت آیا تو اسے اسرائیلی آرمی میں جبری بھرتی کر لیا گیا۔ اس کے بال پہلے ہی جھڑنے شروع ہو چکے تھے، جس کی وجہ سے وہ اپنی 19 سال کی عمر سے زیادہ عمر رسیدہ لگتا تھا۔ وہ بارودی سرنگیں صاف کرنے والے یونٹ میں، جو گولان ہائٹس پر تعینات تھا، فرسٹ سارجنٹ کے عہدے تک پہنچا۔ ملٹری کی لازمی سروس کے بعد وہ رامت ایبب یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ فزکس کی ڈگری کے ایک سال میں دو امتحانات میں فیل ہونے کے بعد اس نے یونیورسٹی چھوڑ دی۔

1976ء میں ایک اشتہار کے جواب میں اس نے بطور ٹیکنیشن ڈیمونا میں ٹریننگ کے لئے درخواست بھیج

دی۔ ایٹمی پلانٹ کے سکیورٹی آفیسر کے ساتھ لمبے چوڑے انٹرویو کے بعد اسے رکھ لیا گیا اور فزکس، کیمسٹری، حساب اور انگلش کے ایک سخت اور محنت طلب کورس کے لئے بھیج دیا گیا۔ اس نے بہت اچھی کارکردگی دکھائی اور فروری 1977ء میں اسے ڈیمونا ایٹمی پلانٹ میں ٹیکنیشن کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ نومبر 1986ء میں اسے غیر ضروری اور فالتو قرار دے کر پلانٹ سے فارغ کر دیا گیا۔ ڈیمونا میں اس کی سکیورٹی فائل پر یہ ریمارکس دیئے گئے کہ وہ بائیں بازو کے خیالات اور عربوں کے حمایتیوں جیسا اندازِ فکر رکھتا ہے"۔

اگلے سال کے ماہ مئی میں وانونو اسرائیل کو خیر باد کہہ کر سڈنی، آسٹریلیا پہنچ گیا۔ مشرق بعید کے سفر کے دوران اس نے اپنا خاندانی یہودی مذہب چھوڑ کر عیسائی مذہب میں شامل ہونے کا ارادہ کر لیا۔ وانونو کے معاملے پر غور کرتے ہوئے ایڈمونی کے سامنے جو تصویر اس کے حساب سے وہ ایک تنہائی پسند اور خلوت نشین قسم کا نوجوان تھا۔ ڈیمونا میں دس سالہ ملازمت کے دوران بھی اس نے کسی کو دوست نہیں بنایا تھا، نہ ہی اس کی کسی لڑکی سے دوستی تھی۔ وہ اپنے گھر میں زیادہ وقت سیاست اور فلسفے پر مبنی کتب کے مطالعے میں صرف کرتا تھا۔ موساد کے نفسیاتی شعبے کے لوگوں نے ایڈمونی کو بتایا کہ ایسا آدمی بیوقوف، جلد باز مبہم جو اور اپنی ہی تخیلاتی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ اس کے اپنے معیارات اور اقدار ہوتی ہیں۔ ایسی شخصیت خطرناک حد تک ناقابلِ بھروسہ ہوتی ہے۔

آسٹریلیا میں ایک چرچ میں رنگ سازی کا کام کرنے کے دوران وانونو کی ملاقات کولمبیا کے صحافی اوسکر گریرو سے ہو گئی جو سڈنی میں کام کرتا تھا۔ ہوشیار، چالاک اور باتونی صحافی نے ایک فرضی کہانی گھڑ رکھی تھی جو وہ کنگ کراس کے بارونق علاقے میں دوپہر کے کھانے کے دوران اپنے دوستوں کو سناتا رہتا تھا کہ کس طرح اس نے اسرائیل کے ایک ایٹمی سائنسدان کو منحرف ہونے میں مدد کی تھی اور موساد کو اس پر شک ہونے سے پہلے ہی اسے ایک محفوظ پناہ گاہ میں پہنچا دیا تھا۔ اس سائنسدان نے صحافی کو بتایا تھا کہ عربوں کے خلاف استعمال کے لئے اسرائیل ایٹمی ہتھیار تیار کر رہا ہے اور اب یہ سائنسدان کسی شہر کے نواح میں خفیہ ٹھکانے پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ صحافی یہ گپ ہانکتا تھا کہ اس کے پاس دنیا کی اس صدی کی سب سے زیادہ دھماکہ خیز سٹوری ہے۔

صحافی کی یہ احمقانہ سٹوری وانونو کو بڑا مشتعل کرتی تھی اور وہ اس بات کا خواہشمند تھا کہ اسرائیل کے ایٹمی خطرے سے دنیا کو آگاہ کرنے کے لئے اس کی سٹوری بھی کسی اچھے اخبار کی زینت بن جائے۔ تاہم گریرو نے پہلے ہی "سنڈے ٹائمز" لندن کے میڈرڈ (سپین) آفس سے رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ یہ اخبار اپنی جرأت مندانہ اور آزادانہ پالیسی کی شہرت رکھتا تھا۔ لہٰذا اس نے وانونو سے تفصیلی انٹرویو کے لئے اپنا ایک رپورٹر سڈنی بھیج دیا۔

لندن اخبار کے تجربہ کار اور تیز طرار رپورٹر کے آنے اور گوریرو سے سوال جواب کرنے سے اس کی اسرائیلی ایٹمی سائنسدان کے منحرف ہونے والی کہانی تو من گھڑت ثابت ہو گئی۔ اب جب "سنڈے ٹائمز" کے رپورٹر نے بتایا کہ وہ وانونو کو اپنے ساتھ لندن لے کر جا رہا ہے تاکہ اس کی سٹوری کی مزید چھان بین اور تصدیق کی جا سکے۔ وہاں ایک مشہور ایٹمی سائنسدان بھی اس کا انٹرویو کرے گا اور اس کی دستاویزات اور نقشے وغیرہ چیک کرے گا تاکہ اخبار میں اشاعت سے قبل کہانی ہر طریقے سے کنفرم کر لی جائے۔ اس سے گریرو اور بھی پریشان ہو گیا کہ وانونو کی کہانی بھی ہاتھ سے گئی۔

گریرو نے وانونو کو اپنے ساتھی کے ساتھ لندن کے لئے جہاز میں سوار ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

دیکھا۔ اس کی پریشانی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور اس کا وانونو کی سٹوری بیچ کر لمبا چوڑا مال کمانے کا خواب بکھرتا جا رہا تھا۔ اسے حالات پر قابو پانے کے مشورے کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لئے جو شخص اُس کے ذہن میں آیا وہ "آسٹریلین سیکورٹی اینڈ انٹیلی جنس سروس" (ASIS) کا ایک سابقہ ممبر تھا۔ گریرو نے اسے بتایا دھوکے سے دنیا کو ہلا دینے والی سٹوری سے محروم کیا جا رہا ہے۔ اس نے وہ ساٹھ تصویریں جو وانونو نے پلانٹ دیمونا 2 کے اندر کھینچ کر باہر سمگل کی تھیں، ساتھ میں نقشے اور ڈیزائن وغیرہ اسے دکھائے، جن سے بلا شک و شبہ یہ ثابت ہوتا تھا کہ اسرائیل دنیا کی چھٹی ایٹمی قوت بن چکا ہے۔

ایک دفعہ پھر گریرو کی قسمت اُسے دھوکا دے گئی۔ اُس نے مشورے کے لئے غلط آدمی کا انتخاب کر لیا تھا۔ اے ایس آئی ایس کے سابقہ ممبر نے اپنے ادارے سے رابطہ قائم کر کے گریرو کی بیان کردہ کہانی انہیں سنا دی۔ موساد اور اے ایس آئی ایس کے درمیان خفیہ طور پر معلومات اطلاعات کے باہمی تبادلے اور انٹیلی جنس تعاون کا معاہدہ تھا جو عربوں اور مڈل ایسٹ کے معاملات کے بارے میں تھا۔ اے ایس آئی ایس نے اسرائیلی سفارتی مشن میں کام کرنے والے موساد کے ایجنٹ کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جس نے فوراً یہ اطلاع موساد کے سربراہ ایڈمونی کو فیکس کر دی۔ اسی دوران اُسے ایک اور پریشان خبر پہنچ چکی تھی کہ وانونو نے آسٹریلیا جاتے ہوئے راستے میں نیپال میں مختصر قیام کیا تھا اور کھٹمنڈو میں روس کے سفارتخانے بھی گیا تھا۔ کیا وہ اپنے ثبوت ماسکو کو دکھانے کے لئے گیا تھا؟

نیپال کے بادشاہ کے سٹاف میں موساد کا ایک مخبر بھی شامل تھا۔ اُسے یہ معلوم کرنے میں تین دن لگ گئے کہ وانونو روسی سفارتخانے میں یہ معلوم کرنے گیا تھا کہ وہ مستقبل قریب میں چھٹیاں گزارنے کے لئے ماسکو جانا چاہتا ہے تو اُسے کن کن کاغذات و دستاویزات کی ضرورت پڑے گی۔ ایمبسی سے اسے معلوماتی کتابچے دے کر واپس بھیج دیا گیا تھا۔

اس دوران جبکہ "لندن ٹائمز" کی طرف وانونو لندن جا رہا تھا، گریرو نے جلد از جلد مال کھرا کرنے کے لئے وانونو کے کاغذات، تصاویر اور دستاویزات کی کاپیاں آسٹریلیا کے دو اخبارات کو فروخت کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں آسٹریلین اخباروں نے انہیں جعلی اور نقلی قرار دے کر مسترد کر دیا۔

پیسے کمانے میں ناکامی اور بڑھتی ہوئی مایوسی پر قابو پانے کے لئے وانونو کے تعاقب میں گریرو بھی لندن کو چل پڑا لیکن وہ وانونو کو ڈھونڈنے میں ناکام رہا۔ لہٰذا وانونو سے حاصل کردہ تصویروں اور دستاویزات کی کاپیاں لے کر "سنڈے میرر" کے دفتر پہنچ گیا۔ اس کے پاس وانونو کی آسٹریلیا میں اتاری گئی تازہ ترین تصویر بھی تھی۔ چند گھنٹوں میں ہی نکولس ڈیویز کو بھنک پڑ گئی اور اس نے فوراً اپنے اخبار کے پبلشر میکسویل کو آگاہ کر دیا۔ میکسویل نے ایڈمونی کو فون کر دیا۔ ایڈمونی کو اس وقت ایک اور جھٹکا لگا جب اس کو پتہ چلا کہ "سنڈے ٹائمز" وانونو کی سٹوری کو انتہائی سنجیدگی سے لے رہا ہے اور شائع کرنے جا رہا ہے۔ اب ایڈمونی کے لئے یہ جاننا ضروری تھا کہ وانونو کس قسم کی تصویریں اور دستاویزات لے گیا ہے۔ تاکہ ان کی اشاعت سے پہنچنے والے نقصان کی پیش بندی کی جا سکے۔

کینبرا (Canberrra) (آسٹریلیا) سے ملنے والی اطلاع سے پتہ چلا کہ گریرو صرف پیسے کمانے کے چکر میں ہے۔ اگر وانونو کا مقصد بھی پیسہ بنانا ہی ہے تو دونوں کے خلاف ڈس انفارمیشن کی مہم چلائی جا سکتی ہے کہ یہ دو جعلساز مل کر "سنڈے ٹائمز" کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔

ایک دفعہ پھر ہوشیار، چالاک، بیدار مغز اور انتھک محنتی بن مناشے کی خدمات حاصل کی گئیں اور ایڈمونی نے اسے حکم دیا کہ وہ فوراً لندن پہنچے اور گریرو نے "سنڈے میرر" کو جو تصویریں اور دیگر دستاویزات دکھائی تھیں اُس سے خرید کر حاصل کر لے۔ وہ ایک معروف تحقیقاتی امریکن صحافی سیمور ہرش کے روپ میں لندن پہنچا۔ اُس کے اپنے الفاظ میں:۔

"نکولس ڈیویز نے گریرو کی ایک نہایت امریکن صحافی (جو میں تھا) سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ مشکلاقات میں گریرو نے وانونو کی کچھ رنگین تصویریں دکھائیں اور اُس کی مہیا کردہ تصویریں اور دستاویزات بیچنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ دستاویزات اصلی تھیں یا جعلی۔ اس کا فیصلہ تو اسرائیل کے ماہرین ہی کر سکتے تھے۔ میں نے گریرو سے کہا کہ مجھے ان کی نقلیں (کاپیاں) چاہئیں۔ وہ بدک گیا اور ہچکچاہٹ کا اظہار کرنے لگا۔ میں نے کہا کہ اگر تمہیں پیسے چاہئیں تو تم میری طرف سے ضمانت دینے کو تیار ہے۔"

چنانچہ گریرو نے بے شمار تصویریں، نقشے، ڈرائنگیں اور دستاویزات بن مناشے کے حوالے کر دیں جو فوراً کوریئر سروس کے ذریعے تل ابیب روانہ کر دی گئیں۔

یہ تمام تصویریں، دستاویزات اور کاغذات موساد کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچے تو مزید سراسیمگی پھیل گئی۔ دیمونا ایٹمی پلانٹ کے افسروں نے تصویروں سے فوراً ماخون 2 کو شناخت کر لیا۔ ایک تصویر میں پلانٹ کا وہ حصہ دکھایا گیا تھا جہاں ایٹمی بارودی سرنگیں تیار کی جا رہی تھیں جو شام کے بارڈر پر گولان ہائٹ کے علاقے میں بچھائی گئی تھیں۔ اب وانونو کی تصویروں اور دیگر دستاویزات کے اصلی ہونے میں کوئی شک شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ مشینوں کی تصویروں سے ہر ایٹمی سائنسدان جان سکتا تھا کہ ان سے کیا کچھ بنایا جا سکتا تھا۔

وزیر اعظم پیریز نے صورتِ حال پر نظر رکھنے کے لئے ایک کرائسز ٹیم قائم کر دی۔ موساد کے اعلیٰ افسروں نے تجویز پیش کی کہ موساد کے قاتلوں کی ایک ٹیم لندن بھجوائی جائے جو وانونو کو تلاش کر کے قتل کر دے۔ ایڈمونی نے یہ تجویز رد کر دی۔ اخبار "سنڈے ٹائمز" میں اتنے صفحات کی گنجائش نہ تھی کہ وانونو کی پوری کہانی چھاپ سکے۔ ٹیکنیشن کی بتائی ہوئی کہانی، تصاویر، نقشہ جات اور ڈرائنگ مکمل طور پر چھاپنے کے لئے تو ایک مکمل اور ضخیم کتاب کی ضرورت تھی۔ امکان یہ تھا کہ وانونو سے تمام کہانی سن کر برطانوی انٹیلی جنس ایجنسی (MI6) اور امریکن سی آئی اے کو بھی آگاہ کیا جائے گا جس سے اسرائیل کے لئے اور بھی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ سب سے پہلے یہ جاننا اشد ضروری تھا کہ وانونو نے ایٹمی پلانٹ دیمونا کے اندر اپنی جاسوسی کی سرگرمیاں کس طرح جاری رکھیں؟ آیا وہ اکیلا تھا یا اُس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل تھے اور اگر تھے تو یہ سب کس کے لئے جاسوسی کا کام کر رہے تھے؟ یہ سب کچھ معلوم کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وانونو کو پوچھ گچھ کے لئے اسرائیل واپس لایا جائے۔

فرمانِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم

☆ میں بڑوں کی عزت اس لئے کرتا ہوں کہ ان کی نیکیاں مجھ سے زیادہ ہیں اور چھوٹوں سے پیار اس لئے کرتا ہوں کہ ان کے گناہ مجھ سے کم ہیں۔

☆ قربان جائیے اپنے رب پر جو برداشت سے زیادہ دکھ تو نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ سکھ دیتا ہے۔

☆ خواہش پرستی ہلاک کر دینے والا ساتھی اور بُری عادت ایک زورآور دشمن ہے۔

مرسلہ: جواد حیدر

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ایڈموفی کو کسی ایسے طریقے کی تلاش تھی کہ ''سنڈے ٹائمز'' نے وانونو کو جہاں کہیں چھپا رکھا ہے، اُسے باہر نکال لایا جائے۔ اگر وانونو آزاد ہوتا تو اس سے نبٹنا آسان تھا لیکن اخبار نے اُسے چھپا رکھا تھا۔ اگر اُسے قتل کرنا تھا تو یہ موساد کے لئے لندن کی گلیوں میں قتل کی کوئی پہلی واردات نہ ہوتی۔ اس سے قبل، میونخ اولمپک گیمز کے دوران اسرائیلی کھلاڑیوں کا قتل عام کرنے والوں کی تلاش کے دوران اسی لندن میں ایک فلسطینی کو موساد کے قاتلوں نے سرعام ہوٹل بلوم بری کی طرف جاتے ہوئے روڈ ایکسیڈنٹ میں کچل کر ہلاک کر دیا تھا اور موقعۂ واردات سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس فلسطینی کو بلیک ستمبر گروپ کا رکن بتایا گیا تھا جس نے اسرائیلی کھلاڑیوں کو قتل کیا تھا۔

اُدھر لندن میں اخبار ''سنڈے ٹائمز'' کو بھی احساس تھا کہ اسرائیل وانونو کو بدنام کرنے کے لئے ممکنہ طور پر بدنام کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کرے گا۔ لہٰذا اخبار نے وانونو اور اس کی مہیا کردہ تصویروں اور دیگر دستاویزات اور اُس کے اپنے ایٹمی علم کی جانچ پرکھ کے لئے برطانیہ کے مشہور ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر فرانک بارن ابی جس نے آلڈر ماسٹن میں واقعے ایٹمی تنصیبات پر طویل عرصہ تک کام کیا تھا، کی خدمات حاصل کیں۔ اُس نے وانونو سے تفصیلی بات چیت، سوال جواب اور انٹرویو کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اُس کی تمام دستاویزات اصلی، درست اور صحیح اور اُس کی تمام سٹوری سچائی پر مبنی ہے۔

یہاں پہنچ کر اخبار ''سنڈے ٹائمز'' نے ایک بڑا ہی غلط اور تباہ کن قدم اٹھایا۔ جو رپورٹر اس سٹوری پر کام کر رہا تھا اُس نے وانونو کے انکشافات کی سمری، پاسپورٹ اور تصویروں کی کاپیاں اور ڈاکٹر بارن ابی کے اسسمنٹ کی نقول لندن میں اسرائیلی سفارتخانے کو دے دیں۔ اخبار کا مقصد تھا کہ اسرائیل ان کو درست تسلیم کرتے ہوئے اپنے ایٹمی قوت ہونے کا اعتراف کرے۔ اس کے برعکس اسرائیلی سفارتخانے نے اسے بے بنیاد اور جھوٹا قرار دے کر مسترد کر دیا۔ ''حقیقتاً یہ سب کچھ بے بنیاد ہے''۔

جو فوٹو کاپیاں سفارتخانے میں پیش کی گئی تھیں انہوں نے تل ابیب پہنچ کر ہیجان میں مزید اضافہ کر دیا۔ بن مناشے کے الفاظ میں:۔

''بلی تھیلے سے باہر آ چکی تھی، میں ابھی لندن میں ہی تھا کہ ڈیویز نے پیغام دیا کہ میکسویل مجھے ملنا چاہتا ہے۔ ہم اُسی دفتر میں ملے جہاں ہم نے اپنا پیسہ آہنی پردے کے پیچھے چھپانے کے بدلے بطور کمیشن 8 ملین ڈالر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میکسویل نے صاف لفظوں میں بتایا کہ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وانونو کی سٹوری کا کس طرح توڑ کیا جانا چاہیے تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ پہلے ہی میرے افسر اعلیٰ سے تل ابیب میں بات کر چکا ہے۔''

''ڈی مرر'' کے اگلے شمارے میں مردیخائی وانونو کی ایک بڑی تصویر اور ساتھ ہی ایک سٹوری تھی جس میں ٹیکنیشن وانونو اور اوسکر گریرو کو جعلساز، دھوکے باز اور جھوٹے قرار دیا گیا تھا کہ وہ اسرائیل کی ایٹمی قوت بارے جعلی اور خود ساختہ کہانی گھڑ کر مختلف اخبارات کو بیچنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہ ساری کہانی میکسویل نے خود لکھوائی تھی اور وانونو کی تصویر کی اشاعت کے لئے جگہ کا انتخاب بھی خود کیا تھا۔

موساد کے نفسیاتی جنگ کی حکمت عملی کے شعبے کی طرف سے دروغ گوئی، ڈس انفارمیشن کا پہلا گولا فضا میں اچھال دیا گیا اور اپنے دیگر تنخواہ دار صحافیوں کی مدد سے اسے ایک باقاعدہ مہم کی شکل دے دی گئی۔

یہ سب کچھ پڑھ کر وانونو اس قدر اضطراب اور گھبراہٹ کا شکار ہو گیا کہ اُس نے اخبار ''سنڈے ٹائمز'' کے ان رپورٹروں کو، جو اُس کے لندن لائے جانے کے

مرض کا علاج نہیں کرتا بلکہ مرض کی وجوہات کو ختم کرتا ہے۔ علامات کو وقتی طور پر دباتا نہیں، مرض کو ہمیشہ کے لئے ختم کرتا ہے۔ ہومیو پیتھی واحد طریقۂ تشخیص ہے جو بتاتا ہے کہ جسمانی مرض کا باعث جسمانی ہے یا نفسیاتی۔ باعث جسمانی ہو یا نفسیاتی، ہومیو پیتھی کے سوا کوئی آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔

خواہ وہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کے تمام امراض خصوصاً پرانے (کرانک) اور بگڑے ہوئے امراض، معذور بچوں کے علاج کے لئے دستِ شفاء ''حکایت'' سے رجوع کریں۔

رابطہ کے لئے

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ) 0321-7612717 0312-6625086

عارف محمود 0323-4329344

بالمشافہ ملاقات کے لئے پہلے وقت لیں۔

دستِ شفاء حکایت 26 پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بعد اس سے رابطے میں تھے، صاف کہہ دیا کہ وہ ''غائب'' ہونا چاہتا ہے۔ ''میں نہیں چاہتا کہ کسی کو کچھ معلوم ہو کہ میں کہاں ہوں''۔

ڈرے سہمے اور خوفزدہ ٹیکنیشن کو اس کے نگرانوں نے اس کے لئے ایک نئی پناہ ڈھونڈی اور اسے آخری بار سینٹرل لندن کے شافٹ بری ایونیو کے قریب مونٹ بیٹن ہوٹل میں ٹھہرادیا۔

اخبار ''سنڈے مرر'' میں سٹوری کی اشاعت کے بعد لندن میں موساد کے تمام ایجنٹوں اور مخبروں کو اُس تلاش کی مہم پر لگا دیا گیا۔ اس مقصد کے لئے بہت سے یہودی رضا کاروں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ ہر ایک کو ہوٹلوں، مہمان خانوں اور بورڈنگ ہاؤسز کی لسٹیں دے دی گئیں۔ ہر تلاش کنندہ ان جگہوں پر جاتا، ''مرر'' میں شائع شدہ تصویر دکھاتا اور اپنے آپ کو وانونو کا رشتہ دار ظاہر کرکے معلوم کرتا کہ ان کے ہوٹل میں اس حلئے اور نام کا کوئی بندہ تو نہیں ٹھہرا ہوا، جس کا اندراج ان کے رجسٹر میں ہو۔

بدھ کے روز 25 ستمبر کو ایڈموِنی کو لندن سے اطلاع ملی کہ وانونو کا پتہ لگا لیا گیا ہے۔ اب اس ڈرامے کے اگلے مرحلے، اُسے اغوا کرکے اسرائیل لے جانے یا قتل کرنے کا وقت آگیا تھا۔

جاسوسی اور جنسی ترغیبات کا تعلق اتنا ہی پرانا ہے جتنی جاسوسی کی تاریخ۔ موسس (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کی کتاب چہارم میں ایک رباب نامی طوائف کا ذکر ہے جس نے جوشوا کے دو جاسوسوں کی جریکو کے بادشاہ کے کونٹر انٹیلی جنس لوگوں سے جان بچائی تھی۔ تاریخ انسانی میں جاسوسی اور جنسی ملاپ کی یہ پہلی مثال ہے۔ محبت اور جاسوسی کی ایک مثال پہلی جنگ عظیم میں رباب کی ایک وارث ماتا ہری نے قائم کی تھی جو اگرچہ شہریت کے لحاظ سے ڈچ تھی لیکن جرمنوں کے لئے جاسوسی کی خدمات انجام دیتی تھی اور جسے فرانسیسیوں نے پھانسی لگا دیا تھا۔ جنسی ترغیبات کا شعبہ موساد کی ابتدا سے ہی قائم کر دیا گیا تھا۔ موساد کے اس وقت کے الفاظ میں:۔

''یہ (جنس) بھی ایک ہتھیار ہے۔ ایک عورت جو حربے استعمال کرسکتی ہے، وہ کسی مرد کے بس کی بات نہیں۔ جو جانتی ہے راز کیسے اگلوانے ہیں۔ بکنے کی باتیں اُس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہیں۔ موجودہ دور کی جاسوسی کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے جہاں عورتوں نے جنس کو اپنے ملکی مفاد کے لئے استعمال کیا۔ یہ کہنا کہ اسرائیلی ایسا نہیں کرتے، انتہائی بے وقوفی کی بات ہے لیکن ہماری خواتین رضا کارانہ طور پر خدمات انجام دیتی ہیں حالانکہ انہیں یہ ہوتا ہے جاسوسی کا یہ کام کس قدر خطرناک ہے۔ اس لئے ایک خاصی کی ہمت اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کسی مرد کے ساتھ سونے کا سوال نہیں ہوتا بلکہ اُسے یہ یقین دلا دینا ہوتا ہے اس خدمت کے بدلے میں وہ جو کچھ بتائے گا اُسے خفیہ راز میں رکھا جائے گا۔ اس کے لئے اعلیٰ درجے کی تربیت، ہنرمندی اور دانش کی ضرورت ہوتی ہے۔''

کافی غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد ناحوم ایڈموِنی نے ایک ایسی ایجنٹ کا انتخاب کیا جو مرد بیزار وانونو کو اپنی اداؤں سے بہلا پھسلا کر موساد کی گرفت میں لا سکتی تھی۔

موساد کی یہ ایجنٹ تھی شیریل بن توف (Cheryl) اس کی پیدائش ایک امیر اور دولت مند یہودی خاندان کے ہاں اولینڈو، فلوریڈا، امریکہ میں ہوئی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے اُس کے والدین کے درمیان طلاق کا مسئلہ بڑی تلخی پیچیدگی اور لمبی قانونی و عدالتی جنگ کے بعد طے ہوا تھا۔ اُسے مذہبی تعلیم میں سکون ملتا تھا چنانچہ اُس نے تین مہینے اسرائیل کے ایک مذہبی سکول میں گزارے تھے۔ وہاں اُسے یہودی تاریخ

اور ہیبریو زبان میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب اسرائیل میں ہی رہے گی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اُس کی ملاقات ایک پیدائشی اسرائیلی اوفر بن توف سے ہوئی اور اس کی محبت کا شکار ہوگئی۔ وہ ملٹری انٹیلی جنس ''امان'' میں بطور تجزیہ کار کام کرتا تھا۔ ایک سال کے بعد دونوں نے شادی کرلی۔

شادی کی تقریب کے مہمانوں میں اسرائیلی انٹیلی جنس کمیونٹی کے کئی اعلیٰ افسر بھی شامل تھے، جن میں موساد کے ریکروٹنگ آفس کا ایک افسر بھی شامل تھا۔ کھانے کے دوران اس افسر نے شیریل سے کئی ایسے سوال پوچھے جن کی ہر نئی دلہن توقع کرسکتی ہے۔ کیا وہ نوکری کرے گی؟ یا فوراً ہی بچے پیدا کرنا اور خاندان میں اضافہ کرے گی وہ اس وقت شادی کی تقریب کی وجہ سے انتہائی خوشگوار موڈ میں تھی۔ اس نے کہا کہ اس کی کوشش ہوگی کہ اسرائیل نے اُسے جو خوشی دی ہے بدلے میں وہ بھی اسرائیل کی کچھ خدمت کرے۔ اس نے اسرائیل کو اپنی ''فیملی'' (کنبہ) کہا۔

ہنی مون سے واپس آنے کے ایک ماہ بعد شیریل کو شادی کی تقریب کے اُس مہمان کی فون کال ملی جس نے اس کے مستقبل کے بارے میں بات چیت کی تھی۔ مزید گفتگو کے لئے انہوں نے تل ابیب کے مرکزی علاقے میں ایک کیفے کا انتخاب کیا۔

اُس آدمی نے شیریل کو حیران کردیا جب اُس کے ماضی کے بارے میں صحیح اور درست معلومات سے آگاہ کیا۔ وہ سکول میں کس گریڈ میں پاس ہوتی رہی تھی۔ اس کا خاندانی پس منظر کیا تھا اور اس کی اس کے خاوند سے کہاں اور کیسے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اپنی ذاتی زندگی بارے ایک اجنبی کے منہ سے باتیں سن کر وہ شپٹا جائے گی اس کے مہمان نے بتایا کہ یہ ساری معلومات اُس کے خاوند کی فائل پر موجود ہیں، جو ملٹری انٹیلی جنس نے تیار کر رکھی ہے۔ لمبی چوڑی گفتگو کے بعد اُس نے شیریل کو بتا دیا کہ وہ کس کے لئے کام کرتا ہے۔ موساد کو ہر وقت ایسے لوگوں کی تلاش رہتی ہے جو اپنے وطن کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ شادی کے موقع پر شیریل نے اسرائیل کو اپنی فیملی سے تشبیہ دی تھی۔ موساد بھی ایک فیملی کی طرح ہی ہے۔ اگر تمہیں ایک دفعہ شامل کرلیا گیا تو آپ بھی اس فیملی کا حصہ ہوں گی جو آپ کی حفاظت اور دیکھ بھال کی ذمہ دار ہوگی۔ جواب میں آپ بھی فیملی کی اُسی طرح خدمت کریں گی جیسا آپ کو کہا جائے گا۔ کیا آپ کو اس فیملی میں شامل ہونے میں دلچسپی ہے؟

شیریل تیار تھی۔ اُسے بتایا گیا کہ اُسے ابتدائی طور پر چند ٹیسٹ پاس کرنے ہوں گے۔ اگلے تین ماہ کے دوران اُس نے تل ابیب کے مختلف محفوظ ٹھکانوں پر کئی تحریری اور زبانی امتحان دیئے اُس کا آئی کیو (IQ) بلند اور اُس نے ان ٹیسٹوں میں 140 حاصل کئے۔ امریکن پس منظر، جنرل نالج اور سماجی تجربے کی بناء پر اُس نے ایک عام رنگروٹ سے زیادہ نمبر حاصل کئے۔

اُسے بتایا گیا کہ وہ عملی تربیت کے لئے موزوں ہے۔

اس سے قبل اس نے اپنے بھرتی کرنے والے کے ساتھ میٹنگ کی۔ اُسے بتایا گیا کہ وہ ایک ایسی تنظیم کا حصہ بننے جارہی ہے کہ وہ اپنے تجربات کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرے گی نہ کسی پر اعتماد کرے گی حتیٰ کہ اپنے میاں پر بھی نہیں۔ ایسی اکیلے پن کی صورت حال میں اُسے کئی چیزیں لبھائیں گی اور کئی لوگ اپنی طرف متوجہ کریں گے لیکن وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں کرے گی۔ اُسے دھوکا، فریب، مکر کرنا سکھایا جائے گا۔ اُسے شرافت، ایمانداری اور نیک اطوار کے برعکس بدمعاشی، بداخلاقی، قانون کی

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

خلاف ورزی اور دھوکہ دہی کے گُر سکھائے جائیں گے۔ لہٰذا اُسے معمول کی زندگی کے برعکس یہ سارے حربے سیکھنے پڑیں گے اور اپنے طور اطوار اس کے مطابق اختیار کرنے ہوں گے۔ اُس کو کچھ ایسی ناگوار حرکات کرنے کے لئے بھی کہا جائے جو انتہائی ناپسندیدہ ہوں گی لیکن اپنے مشن کی کامیابی اور تکمیل کے لئے بخوشی یہ سب کچھ کرنا ہوگا۔ اُس کے استاد نے میز کے اوپر جھکتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ اب بھی اپنا ارادہ تبدیل کرنا چاہے، تو بلاتکلف کر سکتی ہے۔ تمہیں کوئی الزام نہیں دیا جائے گا اور نہ اسے تمہاری ناکامی سے تعبیر کیا جائے گا''۔

شیریل نے دوٹوک جواب دیا کہ وہ عملی تربیت اور ٹریننگ کے لئے تیار ہے۔

شیریل کی ٹریننگ کے اگلے دو سال بڑے عیش و آرام اور فلمیں دیکھتے ہوئے گزرے۔ اُس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے گن نکال کر استعمال کرنا سیکھا۔ اس نے سینما سکرین پر تیز چلتی فلم میں آنے والے زیادہ سے زیادہ ناموں کو یاد رکھنا سیکھا۔ اُسے سکھایا گیا کہ ''بریٹا'' (پستول) اپنی پینٹ میں کیسے چھپانا ہے۔ اپنی سکرٹ یا قمیص میں ہینڈگن کے لئے خفیہ خانہ کیسے بنانا ہے۔

وقتاً فوقتاً شیریل کے ٹریننگ سکول میں اس کی کلاس کے کئی سٹوڈنٹ سکول چھوڑ کر چلے جاتے تھے لیکن اُن کے بارے میں گفتگو کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کئی دفعہ اُسے عملی تربیت کے لئے بھیجا جاتا تھا مثلاً ہوٹل کے گیسٹ کے کمرے میں داخل ہونا، کسی دفتر سے دستاویزات چرانا۔ اس کی ان سرگرمیوں کا اس کے تربیت دہندگان کی طرف سے گھنٹوں تجزیہ کیا جاتا تھا۔ اُسے رات کو اچانک نیند سے بیدار کر کے کسی مشن پر بھیج دیا جاتا تھا۔ مثلاً کسی سیاح کو نائٹ کلب سے اٹھا کر اس کے ہوٹل چھوڑنا۔ اس کی ہر ہر حرکت کو اس کے ٹیوٹر نوٹ کرتے تھے۔

اُس سے اُس کے جنسی تجربے کے بارے میں سوال پوچھے جاتے تھے۔ اپنی شادی سے پہلے وہ کتنے آدمیوں سے ہم بستری کر چکی تھی؟ اگر اس کے مشن کا تقاضا ہو تو کیا وہ کسی اجنبی کے ساتھ سو سکے گی؟ اس نے سچائی اور ایمانداری سے جواب دیئے۔ اپنے خاوند سے پہلے اس نے کسی مرد سے ہم بستری نہیں کی۔ اگر اس کو یقین ہو کہ اس کے مشن کی کامیابی کا انحصار اسی پر ہے تو اجنبی کے ساتھ ہم بستر ہونے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گی۔ یہ صرف صحبت ہوگی محبت نہیں۔ وہ جنسی حرکات کو داؤ ڈالنے، ورغلانے، بہلانے پھسلانے اور غلبہ پانے کے لئے استعمال کرے گی۔

اُس کو یہ بھی سکھایا گیا تھا کہ کسی کو قتل کرنے کے لئے اپنے ہدف پر پستول کی ساری گولیاں کیسے فائر کرنی ہیں۔ اس نے اسلام کی بہت سی بنیادی باتیں بھی سیکھیں۔ ایک پورا مہینہ مہارت کے ساتھ کشتی رانی سیکھنے میں لگایا۔ خفیہ اور چھپے ہوئے کیمرے سے فلم بندی کی تکنیک سیکھی۔ اپنے چہرے کی تبدیلی کے لئے اپنے گالوں کے اندر روئی کے چھوٹے بولے رکھنے کی پریکٹس کی۔ کار چوری، نشے میں دھت ہونے والی حرکات اور مردوں کو لبھانے والی اشارہ بازی سیکھی۔

ایک روز ٹریننگ سکول کے ہیڈ ماسٹر نے اسے اپنے دفتر میں بلایا۔ اس نے شیریل کو اوپر سے نیچے تک دیکھا

دوسروں کے لئے جینا

☆ دنیا میں کوئی چیز اپنے آپ کے لئے نہیں ہے۔ دریا خود اپنا پانی نہیں پیتے، درخت خود اپنا پھل نہیں کھاتے، سورج اپنی حرارت اپنے آپ کو نہیں دیتا، پھول اپنی خوشبو اپنے لئے نہیں بکھیرتے کیونکہ دوسروں کے لئے جینا ہی اصل زندگی ہے۔

(رانا محمد شاہد۔ بورے والہ)

گویا اپنے ذہن میں طے شدہ معیار کے مطابق اُس کا جائزہ لے رہا ہو۔ آخر میں اُس نے کہا کہ وہ ''پاس'' ہے۔

شیریل بن توف کو موساد کے اس شعبے میں بھیج دیا گیا جس کا کام اسرائیلی سفارتخانوں کے درمیان رابطے کا کام کرنا تھا۔ اس کا کام ان ایجنٹوں کی بیوی یا گرل فرینڈ کا کردار ادا کرتے ہوئے ان کی حفاظت کی ذمہ داری نبھانا تھا جو کسی اہم مشن پر ہوتے تھے۔ اس نے یورپ کے کئی شہروں میں امریکن شہری کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ اس نے اپنی کسی خاوند یا بوائے فرینڈ کے ساتھ ہم بستری نہیں کی۔

موساد کے سربراہ ایڈمونی نے ذاتی طور پر اسے بلا کر اس کو وانونو والے مشن بارے ہدایات دیں اور کہا کہ وہ اسے اپنے ذاتی ہنر، تجربے اور دانشمندی سے ورغلا، بہلا پھسلا کر برطانیہ سے باہر لے آئے کیونکہ وانونو کا خفیہ ٹھکانہ تو معلوم ہو ہی چکا تھا۔ اب شیریل اکیلی، امریکن سیاح کی حیثیت سے اپنے خاوند سے تکلیف دہ طلاق کے بعد یورپ کی سیاحت پر نکلی ہوئی تھی۔ اپنی اس کہانی کو مؤثر بنانے کے لئے وہ اپنے والدین کی ناخوشگوار زندگی اور علیحدگی اور طلاق کی طویل قانونی جنگ کو مدنظر رکھتی تھی۔ آخر میں اس نے اٹلی میں اپنی ایک خیالی بہن کا وجود پیدا کر کے وانونو کو وہاں لانا تھا۔

منگل 23 ستمبر 1986ء کو شیریل لندن میں پہلے سے موجود موساد کے ایجنٹوں کی ٹیم کا حصہ بن گئی۔ موساد کی یہ ٹیم ڈائریکٹر آپریشن بنی زیوی (Beni Zeevi)، جس کے دانت لگاتار سگریٹ نوشی کی وجہ سے پیلے پڑے ہوئے تھے، کی زیر نگرانی لندن میں متحرک تھی۔

موساد کے یہ ایجنٹ لندن کے آکسفورڈ سٹریٹ اور سٹرانڈ کے درمیانی علاقے کے ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دو کے نام ریجنٹ پیلس ہوٹل کے رجسٹر میں درج تھے۔ شیریل کا نام سنڈی جانسن کی حیثیت سے سٹرانڈ پیلس ہوٹل میں درج تھا اور یہ کمرہ نمبر 320 میں ٹھہری ہوئی تھی۔ زیوی نے جو اس ٹیم کا سربراہ اور نگران تھا۔ اپنے لئے ماؤنٹ بیٹن ہوٹل کا انتخاب کیا تھا اور اس کا کمرہ نمبر 105 اُس جگہ سے قریب تھا جہاں وانونو نے اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا۔

وہ شاید پہلا شخص تھا جس نے ٹیکنیشن کے بدلتے ہوئے موڈ کو دیکھا تھا۔ وانونو کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اُس کی گھبراہٹ، بے چینی اور بیزاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پُرہجوم لندن کا ماحول اس کے لئے بالکل غیر مانوس تھا کیونکہ اس کی پرورش اور بود و باش بیئر شیبا جیسے ایک چھوٹے سے قصبے میں ہوئی تھی۔ اپنے ساتھیوں کی دلجوئی اور اُسے خوش رکھنے کی کوششوں کے باوجود وہ اپنے آپ کو تنہا اور کسی عورت کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا تھا۔ یہ سارا اندازہ موساد کے تجزیہ کاروں نے اُس کے بارے میں قائم کیا تھا۔

بدھ 24 ستمبر کے روز وانونو نے اصرار کیا اُس کے ''سنڈے ٹائمز'' کے نگران اسے تنہا باہر جانے دیں۔ انہوں نے ہچکچاہٹ کے ساتھ اجازت دے دی لیکن ایک رپورٹر خفیہ طور پر اس کے تعاقب میں رہا۔ وہ لیکسٹر سکوائر تک گیا۔ وہاں رپورٹر نے دیکھا کہ وانونو نے ایک عورت کے ساتھ بات چیت شروع کر دی۔ اخبار نے بعد ازاں عورت کا حلیہ اس طرح بیان کیا۔ ''عمر پچیس سال، قد 5.8 فٹ، گول مٹول، بال سنہرے رنگے ہوئے، ہونٹ متناسب، براؤن ہیٹ اور براؤن رنگ کا سوٹ زیب تن کئے ہوئے، اونچی ایڑی کی جوتی اور ممکنہ طور پر یہودن''۔

آخر کار گفتگو کے بعد وہ جدا ہو گئے۔ واپس ہوٹل آ کر وانونو نے اس بات کی تصدیق کی کہ اس کی ملاقات ایک امریکن لڑکی سنڈی سے ہوئی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ اس سے دوبارہ ملنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اب اُس کے نگران رپورٹر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اس شک کا اظہار کیا کہ سنڈی کا لیکسر سکوائر آنا کسی منصوبہ بندی کا حصہ بھی ہو سکتا ہے۔ وانونو نے ان کے خدشات کو رد کر دیا۔ سنڈی نے اس سے جو بھی گفتگو کی تھی اس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ وانونو کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی لیکن یہاں لندن میں نہیں، روم میں اپنی بہن کے اپارٹمنٹ میں۔

جہاز کی جس پرواز میں شیریل اور وانونو نے روم تک کا سفر کیا، اس کے مسافروں میں زیوی اور چار موساد کے ایجنٹ بھی شامل تھے۔ جوڑے نے پرانے شہر کے ایک حصے میں جانے کے لئے ائرپورٹ سے ٹیکسی کرائے پر لے لی اور سنڈی کی بہن کے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اپارٹمنٹ میں موساد کے تین ایجنٹ پہلے سے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے وانونو کو قابو کر کے اسے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا۔ رات کے پچھلے پہر ایک ایمبولینس آئی اور وانونو کو سٹریچر پر ڈال کر بلڈنگ سے باہر لایا گیا۔ ہمسایوں کو ایک ایجنٹ نے انتہائی غمناک لہجے میں بتایا کہ اس کا رشتہ دار بیمار ہو گیا ہے۔ شیریل بھی ایمبولینس میں سوار ہو گئی اور گاڑی روانہ ہو گئی۔

ایمبولینس تیز رفتاری سے شہر سے نکل کر ساحل پر آ گئی۔ پہلے سے طے کئے گئے پروگرام کے تحت ایک تیز رفتار کشتی تیار کھڑی تھی جس میں وانونو کو منتقل کر دیا گیا۔ گہرے پانیوں میں ایک مال بردار جہاز کھڑا تھا۔ وانونو کو اس پر سوار کرا دیا گیا۔ شیریل اور زیوی بھی اس کے ساتھ تھے۔ تین دن بعد آدھی رات کو جہاز حیفہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔

مردیخائی اب ناہوم ایڈمونی کی سخت تفتیش کا سامنا کر رہا تھا۔ یہ اس عمر قید کا آغاز تھا جو تنہائی میں وانونو نے پوری کرنی تھی۔ شیریل پھر اپنی جاسوسی کی دنیا میں غائب ہو گئی۔

گیارہ سال سے زائد عرصہ مردیخائی نے قید تنہائی میں قابلِ رحم حالت میں گزارا اسے ناقص خوراک دی جاتی تھی اور اس کوٹھڑی سے صرف ایک گھنٹے کی ورزش کے لئے باہر نکالا جاتا تھا، جہاں اسرائیلی اسے اگلی صدی تک رکھنا چاہتے تھے۔ اس کا زیادہ وقت عبادت اور مطالعے میں گزرتا تھا۔

آخر بین الاقوامی دباؤ کے سامنے سر جھکاتے ہوئے مارچ 1998ء میں اسرائیل نے اسے قدرے جیل کے بہتر درجے میں منتقل کر دیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اسے ضمیر کا قیدی قرار دے دیا اور اخبار ''سنڈے ٹائمز'' باقاعدگی سے اس کی ناگفتہ بہ حالت سے اپنے قارئین کو آگاہ کرتا رہا۔ وانونو کو دنیا کو ہلا دینے والی کہانی کا اخبار نے کوئی معاوضہ نہیں دیا۔ آخرکار 1998ء میں اسے قید تنہائی سے تو نجات مل گئی لیکن اس کے وکیلوں کی اپیلوں کے باوجود اس کی رہائی کا کوئی امکان نہیں۔

دس سال بعد قدرے فربہ اپنے مخصوص ہیئر سٹائل کے ساتھ جو سمندری ہوا سے لہرا رہے تھے شیریل واپس فلوریڈا میں تھی۔ وہ اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ ڈزنی ورلڈ میں چھٹیاں گزارنے آئی تھی۔

اپریل 1997ء میں شیریل کا اخبار ''سنڈے ٹائمز'' کے ایک رپورٹر سے آمنا سامنا ہو گیا تو اس نے وانونو کے اغوا میں اپنے کردار کو درست تسلیم کیا۔ اب اس کو صرف یہ فکر تھی کہ اس خبر کی اشاعت سے امریکہ میں اس کی عزت پر حرف آنے کا خدشہ ہے۔

اری بن مناشے کا انجام بھی کچھ اتنا خوشگوار نہیں ہوا۔ اسرائیل کی انٹیلی جنس کمیونٹی کے اندر اس نے اپنے دور میں بہت سے لوگوں کو اندرونی سازشوں کا شکار بنتے، ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے اور موساد میں آتے اور نکلتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس نے اپنے انجام بارے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

1989ء میں اسے نیویارک میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر الزام لگایا گیا کہ اس نے دوسروں کے ساتھ مل کر امریکن C-130 جہاز ایران کو فروخت کرنے کی سازش کی تھی اور اس طرح آرمز ایکسپورٹ کنٹرول ایکٹ کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا تھا۔ حقیقتاً یہ جہاز اسرائیل کو بیچا گیا تھا۔

عدالت میں مقدمے کی ابتدائی سماعت کے دوران اسرائیلی حکومت نے یہ مؤقف اپنا کر کہ وہ بن مناشے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اُس نے اپنے دفاع میں اسرائیلی انٹیلی جنس کے اعلیٰ حکام کے حوالہ جات پر مشتمل فائل عدالت کے سامنے پیش کر دی۔ اسرائیلی حکومت نے کہا کہ جن کا حوالہ دیا گیا ہے وہ سب غیر ملکی ہیں۔ بن مناشے عدالت کو باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ غیر ملکی نہیں ہیں۔ اب اسرائیلی حکومت نے مؤقف اختیار کیا بن مناشے کو اسرائیلی انٹیلی جنس کمیونٹی نے ایک ادنیٰ عہدے پر بطور مترجم ملازم رکھا گیا تھا۔ اس کے جواب میں بن مناشے نے عدالت کو اپنے خلاف کیس کی بنیادی وجہ بتائی کہ اس جہاز کی فروخت کی منظوری امریکن اور اسرائیلی حکومت نے دی تھی۔ اس نے سینکڑوں ملین ڈالر کے اسلحے کی ایران کو فروخت کی اندرونی کہانی سنا دی۔

اس سے ایک دفعہ پھر تل ابیب میں گھبراہٹ اور تشویش پیدا ہو گئی۔ رافی ایتان اور ڈیوڈ کمشے سے انکوائری اور پوچھ گچھ کی گئی کہ بن مناشے کو اس بارے کس قدر علم تھا اور اس کے انکشافات سے کس قدر نقصان پہنچ سکتا تھا۔ جوابات قابلِ بھروسہ نہ تھے۔ رافی ایتان نے کہا کہ اری بن مناشے ایسی پوزیشن میں تھا کہ اس کے ایران کو امریکہ اور اسرائیل کے مشترکہ ڈیل بارے انکشافات ایک زوردار دھماکے سے کم نہیں ہوں گے کیونکہ وہ اس ڈیل کے ہر معاملے میں شامل رہا تھا اور اس کا دائرہ عمل لندن کے ذریعے سینٹرل وساؤتھ امریکہ، یورپ آسٹریلیا سے لے کر افریقہ تک پھیلا ہوا تھا۔

مقدمے کی عدالت میں سماعت کے انتظار میں بن مناشے نیویارک کی میٹروپولیٹن کوریکشن سینٹر میں بند تھا کہ اسرائیلی حکومت کے وکیلوں نے اس سے ملاقات کی اور اسے عدالت میں اپنا جرم تسلیم کر لینے کے بدلے میں بھاری مالی مدد کی ڈیل کی پیشکش کی جس کی وجہ سے اپنی سزا پوری کرنے کے بعد جیل سے باہر آ کر اس کی باقی زندگی انتہائی آسودگی اور آرام میں گزرے گی۔ بن مناشے نے عدالت میں تمام حقائق ابتدا سے انتہا تک بیان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب اس نے اپنا بیان شروع کیا تو اچانک نومبر 1990ء میں فیڈرل جیوری نے اسے تمام الزامات سے بری کر دیا۔

اسرائیلی انٹیلی جنس کمیونٹی میں اس کے بہت سے سابقہ ساتھیوں کا خیال تھا کہ بن مناشے بہت خوش قسمت تھا کہ بچ نکلا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ بن مناشے نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ان سب لوگوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کا آغاز کر دیا تھا۔ جس جس نے اس کی آزادی چھینی تھی کمشے کے الفاظ میں:۔

''ہم چاہتے تھے کہ وہ ہماری نظروں کے سامنے سے غائب ہو جائے۔ اس نے نہ صرف ہمیں تباہ کرنے کا قصد کر لیا تھا بلکہ اس نے اس ملک کی سلامتی کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ سب کے لئے خطرہ تھا اور ہے۔''

لیکن اسرائیل نے یہ اندازہ ہی نہیں لگایا تھا کہ وہ کس طرح انتقام لے گا۔ بن مناشے نے ایک کتاب لکھ ماری جس کا عنوان تھا ''جنگ کے منافع جات''۔ اس کا خیال تھا اس کی کتاب بھی وہی اثرات مرتب کرے گی جو ووڈوارڈ (Woodward) اور برنسٹین (Bernstein) کی کتاب واٹر گیٹ کے انکشافات نے مرتب کئے تھے جو صدر رچرڈ نکسن کے زوال کا باعث بنے تھے۔ بن مناشے نے کتاب لکھنے کا مقصد بڑے

Scanned By BooksPK
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

واضح الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔" 1980ء کے دور کی تباہ کن غلطیوں کی درستگی اور جو لوگ اس کے ذمہ دار تھے ان کے اقتدار کا خاتمہ"۔

تل ابیب میں انتہائی اہم میٹنگیں اور اجلاس ہو رہے تھے۔ ان موضوع بحث بن مناشے کے مسودات کو خرید کر ہمیشہ کے لئے تالوں میں بند کرنا تھا۔ اس طرف اشارہ کیا جاتا تھا کہ بن مناشے پہلے ہی ایک بہت بڑی رقم، ایک ملین ڈالر اپنی زبان بند رکھنے کے لئے ٹھکرا چکا تھا اور اس کے اس فیصلے میں تبدیلی بھی ممکن نظر نہیں آتی تھی۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ نیویارک کے کتابوں کی طباعت واشاعت شعبے میں جتنے بھی موساد کے ایجنٹ اور مخبر ہیں ہر صورت میں اس کتاب کو منظر عام پر آنے سے روکیں۔ ان ایجنٹوں اور مخبروں کو کس حد تک کامیابی ہوتی، معاملہ بحث طلب ہے۔ اگرچہ کتاب کا مسودہ بڑے بڑے اور قابل ذکر طباعتی اور اشاعتی اداروں کو دکھایا گیا تھا لیکن اسے نیویارک کے ایک غیر معروف اشاعتی ادارے شریڈان سکوائر پریس (Sheridan Square Press) نے زیور طبع سے آراستہ کیا۔ بن مناشے نے اپنی کتاب بارے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔

"یہ حکومت کے اندر سازشوں کی کہانی ہے کہ کس قدر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے بعض اہلکار حکومتی پالیسیوں کو اپنے ڈھب سے چلاتے ہیں۔ خفیہ طور پر اپنی مرضی سے بے شمار ایسے آپریشن کرتے ہیں جن کو پبلک کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی جاتی۔ ان کو اپنے احتساب کا کوئی فکر نہیں ہوتا۔ عوام کے اعتماد اور اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے، گمراہ کرتے اور ذرائع ابلاغ کو اپنی مطلب براری کے لئے استعمال کر کے عوام کو دھوکا دیتے ہیں۔ آخری لیکن حتمی نہیں، یہ ایک جنگ کی کہانی ہے جو میدان جنگ میں جرنیل نہیں لڑتے بلکہ اپنے آرام دہ ٹھنڈے ٹھار دفتروں میں بیٹھ کر وہ لوگ لڑتے ہیں جو انسانی جذبات سے عاری، دوسروں کے المیوں، تکالیف اور تباہی سے بالکل لاپرواہ ہوتے ہیں۔"

بہت سے لوگوں نے اسے کتاب کے مصنف کی طرف سے شرمناک حد تک اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین قرار دیا۔ دوسروں نے کہا مبالغے کی حد تک حالات و واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا جن کا مرکزی کردار بن مناشے خود تھا۔ اس نے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔

لندن میں رابرٹ میکسویل نے ہمیشہ کی طرح قانون کی پناہ حاصل کر لی اور دھمکی دی کہ جو کوئی کتاب سے اس کے بارے میں الزامات کو دوبارہ چھاپے گا وہ اسے عدالت میں گھسیٹے گا۔ اخبارات کے اس وڈیرے نواب کو چیلنج کرنے کی کسی انگریز پبلشر کو جرأت نہ تھی اور نہ کسی اخبار کے تحقیقاتی رپورٹر کو بن مناشے کی کتاب میں میکسویل کے کردار بارے کئے گئے دعوؤں کی چھان پھٹک کرنے کی ہمت۔

ایک وقت ایسا بھی تھا جب رابرٹ میکسویل کو بن مناشے کی طرح یہ گمان پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ناقابل تسخیر ہیں اور کسی کی جرأت نہیں کہ ان کی طرف انگلی اٹھا سکے۔ وجہ یہ تھی کہ دونوں ہی اپنے آپ کو موساد کا ایسا چور سمجھتے تھے جنہیں اندر کے سب راز یا کرتوت معلوم تھے۔ دونوں ہی ایران کو ہتھیاروں کی سیل کی آڑ میں مال بنانے اور لوٹ مار میں ملوث ہوتے گئے، اپنے آپ کو موساد کی ضرورت کا ایک لازمی حصہ اور لازمی جزو سمجھنے لگے تھے۔

جس طرح بن مناشے نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اسے معلوم ہے کہ "سب لاشیں کہاں دفن کی گئی ہیں"۔ اسی قسم کے دعوے میکسویل بھی اپنے اسرائیل کے دوروں کے دوران کیا کرتا تھا اور یہ ایک ایسا دعویٰ تھا جسے موساد کے لئے ہضم کرنا ممکن نہ تھا۔ (لاشوں سے مراد خفیہ راز)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں :-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
Online Library For Pakistan
Like us on Facebook
fb.com/paksociety
twitter.com/paksociety1

Scanned By BooksPK

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY